لازمی

اردو نصاب

گیارھویں، بارھویں جماعتوں کے لیے

ناشر: کامران پبلشرز۔ سرکلر روڈ ○ لاہور

برائے: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ○ لاہور

اُردو نصاب (لازمی)

گیارھویں، بارھویں جماعتوں کے لیے

پبلشرز

کامران پبلشرز۔ سرکلر روڈ ٥ لاہور

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ، لاہور

تاریخ اشاعت	ایڈیشن اول	تعداد اشاعت
اگست ۱۹۸۴ء	بار۔ اول	۱۲۵۰۰

تیار کردہ : سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ حیدر آباد
منظور کردہ : قومی کمیٹی برائے جائزہ کتب نصاب برائے ثانوی تعلیمی بورڈ
لاہور، سرگودھا، راولپنڈی، ملتان اور بہاولپور

مؤلفین

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
بشیر احمد صدیقی
مسز سعیدہ خوندکار

نظر ثانی

ڈاکٹر عبدالحق خاں حسرت کاسگنجوی

نگران

سیّد سجّاد رضوی

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ۔ لاہور

طابع : عبدالحمید چوہدری
نیو کامران پرنٹرز لاہور

فہرست مضامین

جزو اوّل ۔ حصۂ نثر

علمی مقالات

مختصر افسانے

طنز و مزاح

ادبی مضامین و مقالات

جزو اوّل - حصۂ نظم

غزلیات

جزو دوُم - حصۂ نثر

مختصر ڈرامے

جزو دوم - حصۂ نظم

جزوِ اوّل

حصۂ نثر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء — ۱۹۱۴ء)

خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ نو برس ہی کی عمر میں یتیم ہوگئے۔ سید جعفر علی سے فارسی اور حاجی محمد ابراہیم سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر دہلی آکر غالب کے شاگرد ہوئے۔ اس وقت شیفتہ بھی غالب ہی کے شاگرد تھے۔ نواب شیفتہ نے اپنے بچوں کے لیے حالی کو استاد مقرر کر دیا۔ اس طرح حالی کی مالی پریشانی بھی ختم ہو گئی اور ادبی ذوق بھی پورا ہونے لگا۔ مگر نواب صاحب کے انتقال کے بعد دہلی میں آکر مدرّسی کرنے لگے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد حالی کچھ مدت تک لاہور کے سرکاری بک ڈپو میں ملازم رہے جہاں ان کے سپرد یہ خدمت تھی کہ انگریزی سے جو کتابیں اور مضامین ترجمہ ہوں، یہ ان کی عبارت کی اصلاح کریں۔ اس طرح حالی کو بالواسطہ مغربی ادب کے خیالات اور انگریزی انشاء پردازی کے اسلوب سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں لاہور میں انجمن پنجاب قائم ہوئی اور اس کی وجہ سے اردو شاعری کی اصلاح ہوئی۔ اس اصلاح میں حصہ لینے والوں میں مولانا آزاد اور حالی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس کے بعد حالی کی سر سید سے ملاقات ہوئی اور اسی وقت سے قومی اصلاحی شاعری کی طرف توجّہ کی۔ بعد میں سر سید کی سفارش سے حیدر آباد سے وظیفہ مقرر ہو گیا اور یہ آخر تک سر سید کے ہمنوا رہے۔ سر سید کی تحریک کی کامیابی میں حالی کی خدمت کو بڑا دخل ہے۔

مولانا حالی نے نثر و نظم میں اردو کی جو خدمت کی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ حالی نظم و نثر دونوں میدانوں کے

شہسوار ہیں ۔ ان کی تحریر کی نمایاں خصوصیت دردمندی ، شرافت ، انکسار اور حقیقت نگاری ہے اور یہ تمام صفات چونکہ خود حالی کے کردار میں موجود تھیں اس لیے ان کے فن میں بھی یہ ایک مکمل شخصیت کی طرح نمایاں نظر آتی ہیں ۔ حیاتِ سعدی ، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید وہ تصانیف ہیں جو حالی کو عمرِ جاودانی عطا کرنے کے لیے کافی ہیں ۔ ان تحریروں سے انہوں نے سوانح عمری کے فن کو با اصول ، مکمل اور باقاعدہ بنا دیا ہے ۔ حالی نے اردو ادب میں اصلاحی اور قومی نظموں کا اضافہ کیا ۔

حالی چونکہ سر سید کے حامیوں میں سے تھے ، اس لیے چاہتے تھے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ انگریزی زبان سے مانوس ہو جائیں ۔ اسی لیے اُن کی تحریر میں انگریزی الفاظ اکثر و بیشتر نظر آتے ہیں ۔ یہ دراصل ان کا ایک اصلاحی قدم تھا تاکہ انگریزی سے بیگانگی دور ہو جائے ۔ اُن کی تمام تحریر سادگی سے بھری ہوئی ہے مگر ہے بہت مؤثر ۔ حالی کے یہاں غالب اور آزاد کی سی شوخی تو نہیں ہے مگر اکتساب اور تحقیق میں وہ آگے ہی نظر آتے ہیں ۔ حالی کی انہی صلاحیتوں کے صلے میں حکومتِ وقت نے ان کو ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب دیا ۔

خواجہ الطاف حسین حالی کا سب سے بڑا کمال بادِ مخالف سے مستقل مزاجی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے ۔ اُن پر بیحد اعتراضات کیے گئے ، ہر طرح سے ان کی ہمت کو پست کیا گیا ، مگر قوتِ برداشت کا یہ عالم تھا کہ ہر اعتراض کا جواب انتہائی سنجیدگی اور متانت سے دیتے تھے ۔ کبھی خوش طبعی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ۔ ہر غصے کا جواب پُر لطف الفاظ میں دیتے تھے ۔ یہ ان کے بڑے اور شریف النفس ہونے کی دلیل ہے ۔

سرسید کا بچپن

سرسید کے پیدا ہونے سے پہلے ان کی بہن صفیۃ النساء بیگم اور ان کے بھائی سید محمد خان پیدا ہو چکے تھے - سید محمد خان کی ولادت کے بعد چھ برس تک ان کے والدین کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا ، اس لیے سید احمد خاں کے پیدا ہونے کی ان کو نہایت خوشی ہوئی - سر سید سے چند مہینے پہلے ان کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا نام حاتم علی خاں تھا - سر سید کو اول حاتم علی خاں کی والدہ نے دودھ پلایا اور پھر خود سر سید کی والدہ نے - وہ اپنے خاندان کے اکثر بچوں کی نسبت زیادہ قوی اور توانا اور ہاتھ پاؤں سے تندرست پیدا ہوئے تھے - وہ اپنی ماں کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ جب ان کے نانا دوسری بار کلکتے سے دلی آئے اور ان کو پہلی ہی بار دیکھا ، تو یہ کہا کہ "یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے" -

سر سید کے بیان سے مفہوم ہوتا تھا کہ ان کے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل قابلیت کے سوا کوئی ایسی خصوصیت، جس سے اُن کے بچپن کو معمولی لڑکوں کے بچپن پر بے تکلف فوقیت دی جا سکے ، نہیں پائی جاتی تھی - یعنی جیسے کہ بعضے بچے ابتدا میں نہایت ذکی اور طبّاع اور اپنے ہمجولیوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں ، سر سید میں کوئی اس قسم کا صریح امتیاز نہ تھا - معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے قوائے ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور لگاتار غور و فکر سے بتدریج ترقی دی تھی اور اسی لیے اُن کی لائف کا آغاز معمولی آدمیوں کی زندگی سے کچھ زیادہ چمکدار معلوم نہیں ہوتا - لیکن جس قدر آگے بڑھتے جائیے، اسی قدر اس میں زیادہ عظمت پیدا ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ہیرو کو معمولی آدمیوں کی سطح سے بالاتر کر دیتی ہے - اسی لیے بعض حکماء کی یہ

رائے ہے کہ محنت سے آدمی جو چاہے، سو کر سکتا ہے۔

الغرض جب سر سید پیدا ہوئے تو ان کے والد نے شاہ غلام علی شاہ صاحب سے نام رکھنے کی درخواست کی۔ شاہ صاحب ہی نے بڑے بھائی کا نام محمد رکھا تھا اور ان کا نام احمد رکھا۔ سر سید کے دادا ان کے والد کی شادی ہونے سے پہلے قضا کر چکے تھے۔ یہ اور ان کے بہن بھائی، شاہ صاحب ہی کو دادا حضرت کہا کرتے تھے۔ سر سید کہتے تھے کہ شاہ صاحب کو بھی ہم سے ایسی ہی محبت تھی جیسے حقیقی دادا کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے تاہّل اختیار نہیں کیا تھا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو خدا تعالیٰ نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے آزاد رکھا ہے لیکن متقی کی اولاد کی محبت ایسی دے دی ہے کہ اس کے بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھ کو بے چین کر دیتی ہے۔

سر سید کو مسماۃ ماں بی بی نے جو ایک قدیم خیر خواہ خادمہ ان کے گھرانے کی تھی، پالا تھا، اس لیے ان کو ماں بی بی سے نہایت محبت تھی۔ وہ پانچ برس کے تھے جب ماں بی بی کا انتقال ہوا۔ ان کا بیان ہے کہ مجھے خوب یاد ہے کہ ماں بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسے کا شربت مجھ کو پلا رہی تھی۔ جب وہ مر گئی تو مجھے اس کے مرنے کا نہایت رنج ہوا۔ میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے، بہت اچھے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے نوکر چاکر اس کی خدمت کرتے ہیں اور اس کی بہت آرام سے گزرتی ہے، تم کچھ رنج مت کرو۔ مجھ کو ان کے کہنے کا پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ مدت تک ہر جمعرات کو اس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا ماں بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس نے مرتے وقت کہا تھا کہ میرا تمام زیور سید کا ہے۔

مگر میری والدہ اس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر تم کہو تو یہ گہنا ماں بی بی کے پاس بھیج دوں۔ میں نے کہا "ہاں بھیج دو"۔ والدہ نے وہ سب گہنا مختلف طرح سے خیرات میں دے دیا۔

بچپن میں نہ تو سر سید پر ایسی قید تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل بندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے پھریں۔ ان کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ خود ان کے ماموں، ان کی خالہ اور دیگر نزدیکی رشتہ داروں کے چودہ پندرہ لڑکے ان کے ہم عمر تھے جو آپس میں کھیلنے کودنے کے لیے کافی تھے۔ اس لیے ان کو نوکروں اور اَجلافوں کے بچوں اور اَشرافوں کے آوارہ لڑکوں سے ملنے جلنے اور اُن کے ساتھ کھیلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اُن کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جس کھیل کو تمھارا جی چاہے، شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو۔ اس لیے سب لڑکے جو کھیل کھیلتے تھے، اپنے بڑوں کے سامنے کھیلتے تھے۔ ان کے کھیلوں میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جو اپنے بزرگوں کے سامنے نہ کر سکیں۔ خواجہ فرید کی حویلی، جس میں وہ اور ان کے ہم عمر لڑکے رہتے تھے، اُس کا چوک اور اس کی چھتیں ہر قسم کی بھاگ دوڑ کے کھیلوں کے لیے کافی تھیں۔ ابتدا میں وہ اکثر گیند بلا، کبڈی، گیڑیاں، آنکھ مچولی چیل چلو، وغیرہ کھیلتے تھے۔ اگرچہ گیڑیاں کھیلنے کو اُشراف معیوب جانتے تھے مگر اُن کے بزرگوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ آپس میں سب بھائی مل کر گیڑیاں بھی کھیلو تو کچھ مضائقہ نہیں۔

سر سید کہتے تھے کہ "کھیل میں جب کچھ جھگڑا ہو جاتا تو بڑوں میں سے کوئی آ کر تصفیہ کرا دیتا اور جس کی طرف سے چیند

معلوم ہوتی،اُس کو برا بھلا کہتا اور شرمندہ کرتا ۔ چینٖد کرنا بے ایمانی کی بات ہے ۔ کبھی چینٖد مت کرو اور جو چینٖد کرے،اُس کو ہرگز اپنے ساتھ مت کھیلنے دو ۔“

اُن کا بیان تھا کہ ”باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے تنہا باہر جانے کی اجازت نہ تھی ۔ جب میری والدہ نے اپنے رہنے کی جدا حویلی بنائی اور وہاں آ رہیں تو باوجودیکہ اس حویلی میں اور نانا صاحب کی حویلی میں ، صرف ایک سڑک درمیان تھی ، جب کبھی میں اُن کی حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا ۔ اس لیے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا ۔ “

سر سید اپنے کھیل کود کے زمانے میں بہت مستعد اور چالاک اور کسی قدر شوخ بھی تھے ۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکثر شوخی کیا کرتے ۔ وہ کہتے تھے کہ ”ایک بار میں نے اپنے رشتے دار بھائی کو جو استنجا کر رہا تھا ، چپکے چپکے اُس کے پیچھے جا کر چت کر دیا ۔ اُس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے ۔ وہ پتھر لے کر مجھے مارنے کو دوڑا ، اور کئی پتھر پھینکے ، مگر میں بچ بچ گیا ۔ آخر سب بھائیوں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرا دی ۔ اسی طرح ایک بار شطرنج کھیلنے میں اپنے ایک رشتے دار بھائی سے لڑ پڑا ۔ میرے مکے سے اُس کے ہاتھ کی اُنگلی اُتر گئی اور کئی دن بعد اچھی ہوئی ۔ ہمیشہ یوں ہی لڑائی بھڑائی ، مارکٹائی ہوتی تھی مگر آخر سب ایک ہو جاتے تھے ۔“

سر سید لکھتے ہیں کہ ”میرے نانا صبح کا کھانا اندر زنانے میں کھاتے تھے ۔ ایک چوڑا چکلا دسترخوان بچھتا تھا ۔ بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اور بیٹوں کی بیویاں سب اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے ۔ بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں ۔ نانا

صاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے، جو
کچھ وہ بتاتا،وہی چیز چمچے میں لے کر اپنے ہاتھ سے اُس کی رکابی
میں ڈال دیتے ۔ تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے اُن کے ساتھ کھانا
کھاتے تھے ۔ سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے،
ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے اور نوالا چبانے کی آواز منہ سے نہ
نکلے ۔ رات کا کھانا وہ باہر دیوان خانے میں کھاتے تھے ۔ جب زنانہ
ہو جاتا تھا ، میری والدہ اور میری چھوٹی خالہ کھانا کھلانے آتی
تھیں ۔ ہم سب لڑکے اُن کے سامنے بیٹھتے ۔ ہم کو بڑی مشکل پڑتی
تھی ۔ کسی کے پاؤں کا دھبّا سفید چاندنی پر لگ جاتا تھا تو نہایت
ناراض ہوتے تھے ۔ روشنائی وغیرہ کا دھبّا کسی کے کپڑے پر ہوتا تھا،
اُس سے بھی ناخوش ہوتے تھے ۔ شام کو چراغ جلنے کے بعد اُن کے
پوتے اور نواسے، جو مکتب میں پڑھتے تھے اور جن میں سے ایک میں
بھی تھا ،۔اُن کو سبق سنانے جاتے تھے ۔ جس کا سبق اچھا یاد ہوتا،
اُس کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو یاد نہ ہوتا اُس
کو کچھ نہ دیتے اور گھورک دیتے ۔"

گرمی اور برسات کے موسم میں اب بھی دلّی کے اکثر باشندے
سہ پہر کو جمنا پر جا کر پانی کی سیر دیکھتے ہیں اور تیرنے والے
تیرتے ہیں ۔ مگر پچاس برس پہلے وہاں اشراف تیرنے والوں کے بہت
دلچسپ جلسے ہوتے تھے ۔ سر سید کہتے ہیں کہ "میں نے اور
بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا ۔ ایک زمانہ تو وہ تھا
کہ ایک طرف دلی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا
تھا ، جن میں مرزا مغل اور مرزا طغل بہت سر برآوردہ اور نامی تھے،
اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سو سوا سو شاگردوں کا
گروہ ہوتا تھا ۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں
کے ٹیلے سے شیخ محمد کی بائیں تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا ۔
پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے ، اُس زمانے میں بھی

تیس چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے - انھی دنوں میں نواب اکبر خان اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے - زینت المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی ، وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا - مغرب کے وقت سب تیراک زینت المساجد میں جمع ہو جاتے تھے اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے - میں اُن جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا - ،،

تیر اندازی کی صحبتیں بھی سر سید کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر ہوتی تھیں - وہ کہتے تھے کہ ”مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ ، جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیر اندازی ہوتی تھی ، یاد نہیں ، مگر جب دوبارہ تیراندازی کا چرچا ہوا ، وہ بخوبی یاد ہے - اُس زمانے میں دریا کا جانا موقوف ہو گیا تھا - ظہر کی نماز کے بعد تیراندازی شروع ہوتی تھی- نواب فتح اللہ بیگ خاں ، نواب سید عظمت اللہ خاں ، نواب ابراہیم علی خاں اور چند شہزادے اور رئیس اور شوقین اس جلسے میں شریک ہوتے تھے- نواب شمس الدین خاں رئیس فیروزپور جھرکہ ، جب دلی میں ہوتے تھے ، تو وہ بھی آتے تھے - میں نے بھی اسی زمانہ میں تیر اندازی سیکھی ، اور مجھ کو خاصی مشق ہو گئی تھی - مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جا کر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا 'مچھلی کے جائے کو تیرنا کون سکھائے'- یہ جلسہ برسوں تک رہا اور پھر موقوف ہو گیا -،،

اہل اللہ اور مقدّس لوگوں کی عظمت کا خیال بچپن سے سر سید کے دل میں بٹھایا گیا تھا - وہ اپنے والد کے ساتھ اکثر شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں جاتے تھے اور شاہ صاحب سے ان کی عقیدت کا رنگ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے - وہ کہتے تھے کہ ”مرزا صاحب

کے عرس میں شاہ صاحب ایک روپیہ ان کے مزار پر چڑھایا کرتے تھے اور اس روپے کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مرید نے شاہ صاحب سے اجازت لے لی کہ اب کی بار نذر کا روپیہ مجھے عنایت ہو۔ میرے والد کو بھی خبر ہو گئی۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والد نے عرض کی کہ حضرت! میرے اور میری اولاد کے جیتے جی آپ نذر کا روپیہ لینے کی اوروں کو اجازت دیتے ہیں؟ شاہ صاحب نے فرمایا: نہیں، نہیں، تمھارے سوا کوئی نہیں لے سکتا۔ میں اس وقت صغیر سن تھا۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا، والد نے مجھ سے کہا، جاؤ روپیہ اٹھالو۔ میں نے آگے بڑھ کر روپیہ اٹھا لیا۔"

دلی سے سات کوس مغل پور ایک جاٹوں کا گاؤں ہے۔ وہاں سر سید کے والد کی کچھ مِلک بطور معافی کے تھی۔ اگر کبھی فصل کے موقع پر ان کے والد مغل پور جاتے تو ان کو بھی اکثر اپنے ساتھ لے جاتے اور ایک ایک ہفتہ گاؤں میں رہتے۔ سر سید کہتے تھے کہ "اس عمر میں گاؤں میں جا کر رہنا، جنگل میں پھرنا، عمدہ دودھ اور دہی اور تازہ تازہ گھی اور جاٹنیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی باجرے یا مکئی کی روٹیاں کھانا نہایت ہی مزا دیتا تھا۔"

سر سید کے والد کو اکبر شاہ کے زمانہ میں ہر سال تاریخی جلوس کے جشن پر پانچ پارچے اور تین رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا۔ مگر اخیر میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، انھوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سر سید کو، باوجودیکہ ان کی عمر کم تھی، دلوانا شروع کر دیا تھا۔

سر سید کہتے تھے "کہ ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد بہت سویرے اٹھ کر قلعے چلے گئے اور میں بہت

دن چڑھے اٹھا - ہر چند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا ، مگر پھر بھی دیر ہو گئی - جب لال پردے کے قریب پہنچا ، تو قاعدے کے موافق اول دربار میں جا کر آداب بجا لانے کا وقت نہیں رہا تھا - داروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہن کر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا - جب خلعت پہن کر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا تھا اور بادشاہ تخت پر سے اٹھ کر ہوادار پر سوار ہو چکے تھے - بادشاہ نے مجھے دیکھ کر والد سے جو اس وقت ہوادار کے پاس ہی تھے ، پوچھا کہ 'تمھارا بیٹا ہے ؟' ، انھوں نے کہا 'حضور کا خانہ زاد ہے'، بادشاہ چپکے ہو رہے - لوگوں نے جانا کہ بس اب محل میں چلے جائیں گے - مگر جب تسبیح خانے میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے - تسبیح خانے میں بھی ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے - اس چبوترے پر بیٹھ گئے اور جواہر خانے کے داروغہ کو کشتیِ جواہر حاضر کرنے کا حکم ہوا - میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا - بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بلایا اور کمال عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ 'دیر کیوں کی ؟' حاضرین نے کہا : عرض کرو کہ تقصیر ہوئی - مگر میں چپکا کھڑا رہا - جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ سو گیا تھا - بادشاہ مسکرائے اور فرمایا : بہت سویرے اٹھا کرو اور ہاتھ چھوڑ دیے - لوگوں نے کہا: آداب بجا لاؤ - میں آداب بجا لایا - بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پنھائیں - میں نے نذر دی اور بادشاہ اٹھ کر خاص ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے - تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے "- سر سید کہتے تھے کہ "اس زمانہ میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہوگی - تقریباً ان ہی دنوں میں راجا رام موہن رائے جو برہموسماج کے بانی تھے ، ان کو اکبر شاہ نے کلکتے سے بلایا تھا تاکہ اضافۂ پنشنِ بادشاہی کے لیے ان کو لندن بھیجا جائے - چنانچہ وہ بادشاہ کی

طرف سے لندن بھیجے گئے اور ۱۸۳۱ء میں وہاں پہنچے"، سر سید نے لندن جانے سے پہلے ان کو متعدّد دفعہ دربار شاہی میں دیکھا تھا۔

سر سید کی تعلیم

سر سید کہتے تھے کہ "مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت اور آدمی کثرت سے جمع تھے۔ خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا سا ہو گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ انھوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے اور بسم اللہ پڑھ کر اقرا کی اول کی آیتیں مَالَمْ یَعْلَمْ تک پڑھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا۔" سر سید نے جب یہ ذکر کیا تو بطور فخر کے اپنا یہ فارسی شعر جو خاص اسی موقع کے لیے انھوں نے کبھی کہا تھا پڑھا:

بہ مکتب رفتم و آموختم اُسرار یزدانی
ز فیض نقشبندِ وقت و جانِ جان جانانی

سر سید کہتے تھے کہ "شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے، الّا ماشاء اللہ صرف میرے والد پر جو غایت درجے کی شفقت تھی، اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے۔"

بسم اللہ ہونے کے بعد سر سید نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ ان کی ننھیال میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی نوکر رہتی تھی۔ سر سید نے استانی ہی سے جو ایک اشراف گھر کی پردہ نشین بی بی تھی، سارا قرآن ناظرہ پڑھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "میرا قرآن ختم

ہونے پر ہدیے کی مجلس جو زنانے میں ہوئی تھی، اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی۔" قرآن پڑھنے کے بعد وہ باہر مکتب میں پڑھنے لگے۔ مولوی حمیدالدین ایک ذی علم اور بزرگ آدمی اُن کے نانا کے ہاں نوکر تھے، جنھوں نے اُن کے ماموؤں کو پڑھایا تھا۔ اُن سے معمولی کتابیں کریما، خالق باری، آمد نامہ وغیرہ پڑھیں۔ جب مولوی حمیدالدین کا انتقال ہو گیا تو اور لوگ پڑھانے پر نوکر ہوتے رہے۔ انھوں نے فارسی میں گلستاں، بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ اور کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا۔ پھر عربی پڑھنی شروع کی۔ عربی میں شرح ملّا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی اور مطوّل ما انا قلت تک پڑھی مگر طالب علموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی کے ساتھ۔ اس کے بعد ان کو اپنا خاندانی علم یعنی ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا، جس میں ان کی ننھیال کے لوگ دلّی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔

محمد حسین آزاد

(۱۸۳۰-۱۹۱۰ء)

نام محمد حسین ، آزاد تخلص ۔ آپ کے والد محمد باقر ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے ۔ انھوں نے دہلی سے اُردو اخبار نکالا تھا جو ایک بڑا کام تھا ۔ آزاد نے ایک ادبی ماحول میں آنکھ کھولی ۔ اُنھوں نے دہلی میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی اور کامل زبان دان اور ایک اہل زبان عالم ہو کر نکلے ۔ اس کے ساتھ ایک اچھے مقرِر بھی تھے ۔

آزاد کے والد اور ذوق میں دوستی بھی تھی ۔ آزاد نے شعر و شاعری میں ذوق کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کیا ۔ مگر جلد ہی اُن کو پُر آشوب زمانے سے دوچار ہونا پڑا ۔ لاہور آنے کے بعد یہاں اُن کی ملاقات اتفاق سے اُردو کے قدردان ڈائریکٹر میجر فلر سے ہو گئی ۔ اُن کی وساطت سے گورنمنٹ کے ایک اخبار "اتالیق" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے ۔ آزاد کی فطری صلاحیتوں کو ابھرنے کا یہاں بہترین موقع ملا ۔ ۱۸۶۶ء میں کابل و بدخشاں کا سفر اختیار کیا ، جس سے اُن کی مادری زبان فارسی میں اور جلا پیدا ہو گئی ۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی فارسی کے پروفیسر مقرر ہوگئے اور ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی پہلی جوبلی میں حکومت نے اُن کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا ۔

اُردو سے آزاد کو بے پناہ لگاؤ تھا ۔ آزاد ہمیشہ اس کی خدمت کرتے رہے ۔ آپ نے اُردو میں ایک نئی راہ نکالی ۔ وہ ایک نئی طرز کے مُوجد ہیں ۔ ان کا یہ رنگ اُن کی نظموں سے زیادہ اُن کی نثر میں نمایاں ہے ۔ اس میدان میں وہ بالکل تنہا آترے ۔ بعد میں اُن کے نقش قدم پر چلنے کی ہر شخص نے تمنا کی ، اُن کی بلندی کو کوئی نہ پہنچ سکا ۔

آبِ حیات ، سخندان فارس ، آئینِ اکبری ، نیرنگِ خیال وغیرہ میں ہر جگہ رنگین تشبیہیں بھی ہیں اور ظرافت کی چاشنی بھی مگر سب سنجیدگی کے زیور سے آراستہ ہیں ۔ ان کی تحریروں میں سے نیرنگِ خیال اور آبِ حیات کا جواب کوئی

پیدا نہ کر سکا۔ نیرنگِ خیال جس میں انھوں نے یونانی تمثیلی طرز پر رنگین عبارت میں قصے لکھے ہیں اور آبِ حیات جو اپنی طرز کا اردو شعراء کا ایک اچھوتا تذکرہ ہے، ڈرامائی کیفیت، ظرافت اور وسیع معلومات کا خزانہ نظر آتا ہے۔ یہ آزاد کا کمالِ فن تھا کہ اُن کے کسی بیان کو سامع مان لینے سے انکار نہ کر سکے۔ کیونکہ اُن کا ہر ہر لفظ دل و دماغ میں اترتا چلا جاتا ہے اور یہی حقیقی فن کی تکنیک ہے حالانکہ تاریخی اعتبار سے ان کے اکثر بیانات غلط نظر آتے ہیں۔ آزاد اردو کے پہلے قابلِ فخر نقاد، مؤرّخ اور زبان دان تھے۔ آزاد اس دَور کے انشاء پردازوں میں تنہا انشاء پرداز ہیں جن کی عبارت میں رنگینیِ بیان پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس میں عربی فارسی کی آمیزش بھی کثرت سے ہے اور زورِ بیان کا یہ عالَم ہے کہ کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طرز تحریر خیالی مضامین میں تو نبھ جاتا ہے لیکن علمی، تاریخی اور تنقیدی تصانیف میں اس طرز تحریر کی وجہ سے خامی پیدا ہو جاتی ہے۔ آبِ حیات اور ان کی تاریخی کتابوں پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، ان کا ایک سبب یہ خاص طرزِ تحریر ہے۔ لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ اپنے معاصرین میں وہ تنہا ایسے شخص ہیں جو خاص انشاء پرداز کی حیثیت سے بھی ممتاز ہیں۔

اورنگ زیب کی فوجی تیاریاں

اکبر کے آئین اور جہانگیر کی خوش مستیوں نے عہد شاہجہاں کے امن و امان میں پرورش پاکر عجیب و غریب رنگ پیدا کیے تھے، یعنی سلطنت کی شان و شوکت کے ساتھ فوج کا بھی ڈھنگ بدل گیا تھا۔ چنانچہ جب دیکھنے والے انہیں دیکھ کر تیموری اور بابری سواروں کا، ان کی بگٹٹ یلغاروں کا خیال کرتے تھے تو تعجُّب آتا تھا۔ لشکر کے ادنٰی رسالے کا یہ عالم تھا کہ اس کے

ساتھ رسالہ ایک دولھا کی بارات معلوم ہوتی تھی - خیال کرنا چاہیے
کہ ایک ایک شہزادے کا اور خود بادشاہ کی سواری کا کیا عالم
ہوگا ۔ غرض لشکر شاہی نے نشان چڑھایا اور دکن کو روانہ ہوا -
سب سے پہلے ایک ہاتھی پر علم اژدہا پیکر ، پیچھے اس کے ہاتھیوں
پر ہندوستان کا ماہی مراتب،اپنی ولایت کے طوغ و علم پرنجی اور
فولادی نقارے اور دمامے ، بعد ان کے ہزاروں ہاتھی ہودج عماری
سے سجے، سونڈوں میں فولادی زنجیریں لیے، گلے میں ہیکلیں، پیشانیاں
شام شفق کی طرح رنگین ، اس پر سنہری ، روپہلی ڈھالیں ، زربفت
کی جھولیں پاؤں تک لٹکتی ، کسی پر ہودج کسی پر عماری ،
ریشمی اور کلابتونی رسیوں سے کَسی،گردنوں پر مہاوت ، جن کے
گلے میں زربفت کی کرتیاں ، سر پر جوڑے دار پگڑیاں ، کمر میں
کٹار ، ایک ہاتھ میں گجباک ، ایک میں آنکس ، جھومتے جھامتے
چلے جاتے تھے - آگے پیچھے چرکٹے،سانٹے مار ، بھالے دار ، برچھیت،
باندار فتیلے سلگاتے بھاگے چلے جاتے تھے - پھر ہزاروں سواروں کے
پرے سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبے بہادر جوان ، ترک بچے ،
افغان ، حبشی ، راجپوت ، دو دو تلواریں باندھے، فولادی خود سروں
پر دھرے ، کمر میں قرولی اور کٹار ، پشت پر گینڈے کی ڈھال ،
چار آئینہ سجے ، کہنیوں تک دستانے چڑھے ، ہاتھ میں سات گز کا
برچھا ، نگاہوں سے خون ٹپکتا ، موچھوں کو تاؤ دیتے ، گھوڑے
اڑاتے چلے جاتے تھے - پھر ہزاروں سانڈنیاں ، خوش رفتار کہ جن
کے سو سو کوس کے دم ، ان پر بانکے راجپوت لال پگڑیاں باندھے ،
زرد انگرکھے پہنے ، آبی بانات کے پاجامے چڑھائے ہتھیار لگائے ،
مہاریں اٹھائے ۔ جب یہ گزر گئے تو سواری کے خاص خاصے نظر
آئے ۔ عربی ، ترکی ، عراقی ، یمنی، کاٹھیاواڑ کے دکھنی، چاندی سونے
کے بھاری بھاری ساز، کسی پر جڑاؤ زین دھرا، کسی پر چارجامہ کسا،
دُمچیاں اور پاکھریں پٹھوں پر پڑیں، جن میں قاقم و سمور کی جھالر،
کلابتون کے پھندنے گلے میں ، سُرا گائے کی چوڑیاں لٹکیں ، سر پر

کلغیاں ، طلائی اور نقرئی،ریشمی باگ ڈوریں ، سائیسوں کے ہاتھوں میں الیل کرتے ، چوکڑیاں بھرتے چلے جاتے تھے - ان کے بعد عربی، رومی، تاتاری ، فرنگی ، ہندی باجے، نقیبوں اور چوبداروں کے آوازے، دمامے کی چوٹ کے ساتھ کڑکیتوں کے کڑکوں کا وہ خیال بندھا ہوا کہ بزدلوں کے دلوں میں لہو جوش مارنے لگے - ان کے بعد احدیوں اور خواصوں کا انبوہ - کندھوں پر بندوقیں ، جن پر بانات کے غلاف - پھر خاص برداروں کا غول - سروں پر کشمیری شالیں بندھی ، کم خواب کے انگرکھے ، زربفت کی نیم آستین پہنے، گجراتی شروع کے گھٹنے چڑھائے ، اصفہانی تلواریں سونتے ، مرصّع قبضے ہاتھ میں ، سنہری رو پہلی میان کمر میں - ان کے بعد سقوں کا غول آیا کہ چھڑکاؤ سے روئے زمین کو تر و تازہ کر دیا - غلام اور خواجسرا انگیٹھیاں اور عود سوز لیے ، خوشبوؤں سے دماغ معطر کرتے چلے گئے - پھر ارکان دربار کے جمگھٹ ، بیچ میں شاہ خورشید کلاہ ، سفید ڈاڑھی ، بڑھاپے کا نور منہ پر ، ہوادار میں سوار ، ساتھ ایک خاصے کا گھوڑا ، پیچھے ایک سونے کی عماری ہاتھی پر دھری ، جروب کا پیانہ اور کوس کا پیالا پڑتا چلا جاتا تھا - سواری سے کوس بھر پیچھے سینکڑوں ہاتھی ، مست جنگی دیوزاد کی صورت مستکوں پر فولادی ڈھالیں - ایک کالی گھٹا چلی آئی تھی کہ جس سے بجائے پانی کے مستی ٹپکتی تھی - پیچھے چیتوں کے چھکڑے - آنکھوں پر زردوزی دیدہ بند ، کمر میں کلابتونی اور ریشمی حلقے پڑے - ساتھ ہی شکاری کتے - تازی ، ولائتی بودار ، بول ڈوگ ، کہ شیر کا سامنا کریں اور پلنگ سے منہ نہ پھیریں - پیچھے کوسوں تک شاہزادوں اور ارکان دولت کے لشکر ، راجوں مہراجوں کی فوجیں ، پیادوں کے غول اور سواروں کے رسالے رنگا رنگ کے نشان جدا جدا پھریرے اڑاتے چلے آتے تھے - بھیر بنگاہ کا تانتا لگا تھا کہ جس کا صبح سے شام تک خاتمہ نہ تھا -

---

(۱۸۵۷ء—۱۹۱۴ء)

مولانا شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ یہیں قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر غازی پور، رام پور اور لاہور میں دوسرے علوم حاصل کیے، جن میں عربی ادب، منطق و فلسفہ اور علم حدیث وغیرہ شامل ہیں۔ کچھ دنوں سرکاری ملازمت کی اور اس کے بعد وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ کچھ دنوں وکالت بھی کی، لیکن طبیعت کی مناسبت نہ ہونے سے ترک کر دی۔ سر سید نے ان کی ذہانت اور طبیعت کا رجحان دیکھ کر علی گڑھ کالج میں شعبۂ فارسی و عربی کی پروفیسری کی جگہ دے دی۔ یہاں سر سید اور پروفیسر آرنلڈ کی صحبت سے اور چار چاند لگ گئے۔ آرنلڈ کے ساتھ اسلامی ممالک کی سیاحت کی۔ سر سید کے انتقال کے بعد انھوں نے بھی علی گڑھ کو چھوڑ دیا اور ریاست حیدر آباد کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔

ندوۃ العلماء سے ان کو بڑا لگاؤ تھا اور اس کو نئے سرے سے منظم کرنے کی ٹھان لی۔ مگر آپس کے جھگڑوں سے بہت دل برداشتہ ہو گئے اور اعظم گڑھ آ کر دارالمصنفین اور نیشنل سکول کی بنیاد ڈالی۔ حکومت وقت نے ان کو ان کی خدمت کے صلے میں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا۔

مولانا شبلی کی تصانیف لائق ستائش ہیں۔ مثلاً شعر العجم، الغزالی، الفاروقؓ، المامون، سوانح مولانا روم، سیرۃ النبیؐ، موازنہ انیس و دبیر، سفر نامۂ روم و شام، مثنوی صبح امید، قطعات مولانا شبلی اور دیوان شبلی وغیرہ۔ مولانا شبلی نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور انتہائی کامیابی کے ساتھ اس کو پورا کیا۔ اس سے ان کی غیر معمولی ذہانت اور ذکاوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حصول علم کا اس قدر

شوق تھا کہ شاید ہی کوئی علم آن سے بچا ہو - انھوں نے شاعری ، تاریخ ، فلسفہ ، ادب ، منطق اور مذہب کا بغور مطالعہ کیا ہے -

مولانا شبلی بڑے سلیم الطبع تھے - انھوں نے اپنے پیشرو شاعروں اور ادیبوں کی کمزوریوں کو محسوس کر لیا تھا اور نتیجے کے طور پر ان کمزوریوں سے گریز کیا - ان کے یہاں حالی کی طرح انگریزی الفاظ جا و بیجا نظر آتے ہیں اور نہ آزاد کی طرح نثر میں شاعری کرتے ہیں -

مولانا نہ صرف ایک پایے کے ادیب تھے بلکہ وہ اونچے نقاد بھی تھے - انھوں نے باقاعدہ تنقید کے اصول تحریر کیے تھے، جو تنقید کے فن کی ایک منزل ہے - اپنے بنائے ہوئے ان اصولوں پر انھوں نے شعراء کے کلام کی جانچ بھی کی ہے ، جو اپنی قسم کی ایک مکمل تنقید ہے - شبلی کی تحریر نہایت آسان اور عام فہم ہے - اس میں آزاد کا زور بیان ، نذیر احمد کا روز مرہ ، حالی کی متانت اور سر سید کا منطقی استدلال سب کچھ شامل ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں ان عیوب سے پاک ہیں جو معاصرین کی انشاء پردازی میں ملتے ہیں اور ان سب کی امتیازی خصوصیات شبلی نے اپنے خاص انداز میں اس طرح سے سموئی ہیں کہ ان کا ایک الگ اسلوب پیدا ہو گیا ہے -

---

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر

(عیب ہا جملہ بگفتی ، ہنرش نیز بگو)

ایک طول طویل افسانہ جو مدت میں جا کر ختم ہوا اس کا حاصل صرف اس قدر نکلا کہ عالمگیر اتنا برا نہ تھا جتنا اس کے مخالف اُس کو بتاتے ہیں - لیکن کیا عالمگیر کی قسمت میں اسی قدر ہے ؟ کیا اس کو اسی پر قناعت کرنی چاہیے کہ تحسین نہ سہی

نفرین سے بچ جائے؟ ہم کو مخالف مؤرّخوں کی اس حق گوئی کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے گو عالمگیر کے معائب جی کھول کر لکھے لیکن محاسن کے اظہار میں کچھ کمی نہیں کی۔ یہ البتہ ہے کہ معائب کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ خوبیوں کی بھنک کانوں میں نہ آ سکی۔ لیکن اب جب کہ الزامات کا تیرہ و تاریک مطلع کسی قدر صاف ہو گیا ہے، عالمگیر کی حقیقی خوبیوں کو پیشِ نظر کرنے کا موقع ہے۔

ملکی اصلاحات اور انتظامات

تیمور اپنے جانشینوں کے کارناموں میں ہمیشہ ملکی فتوحات اور وسعت حدود ڈھونڈے گا۔ عالمگیر اس امتحان میں پورا اُتر سکتا ہے۔ وہ آسام اور تبت کو مسخر کر چکا ہے۔ دکن کی دو سلطنتیں حدودِ حکومت میں شامل ہو گئی ہیں۔ مختصر یہ کہ اس عہد میں تیموری حکومت کے حدود جس قدر وسیع ہوئے، کبھی نہیں ہوئے تھے۔ ہم کو عالمگیر کی تاریخی حکومت میں تیمور کے مذاق کی پیروی کی ضرورت نہیں۔ چنگیز خاں نے بھی ملک فتح کیے تھے۔ سکندر بھی بہت بڑا کِشور کُشا تھا۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ملکی انتظامات میں عالمگیر نے کیا کیا کِیا۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ٹیکسوں کی موقوفی

(۱) سلاطین کے زمانے میں مالگزاری کے علاوہ بیسیوں ناجائز ٹیکس اور محصول جاری تھے، جن کی مجموعی تعداد مالگزاری کے برابر پہنچ جاتی تھی۔ مثلاً چنگی، باندری (مکان کا ٹیکس)، سر شماری، بر شماری، طوفانہ، جرمانہ، شکرانہ وغیرہ وغیرہ۔ ان محصولوں کی تعداد ۸۰ تک پہنچتی تھی اور ان کی آمدنی، جیسا کہ خافی خاں نے لکھا ہے، کروڑوں سے زیادہ تھی۔ عالمگیر نے یہ تمام محاصل یک قلم موقوف کر دیے۔

قانون مالگزاری اور بندوبست اراضی

(۲) اکبر کے زمانے میں مالگزاری اور خراج کا جو دستورالعمل مرتب ہوا تھا اس کی پھر تجدید اور ترمیم کبھی نہ ہوئی ۔ عالمگیر نے اپنے زمانے میں ترمیم و اصلاح کر کے ایک جدید دستورالعمل تیار کیا ۔ چنانچہ ہمارے ایک بنگالی دوست جادو ناتھ سرکار پروفیسر پٹنہ کالج نے اس کو مع انگریزی ترجمے کے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتے کے جرنل میں چھاپا ہے ۔ ہم تطویل کے لحاظ سے اس کو نقل نہیں کر سکتے ۔ اس موقع پر یہ ظاہر کرنا مناسب ہوگا کہ عالمگیر کے زمانے میں محاصل سلطنت اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ اکبر اعظم کے عہد سے اس وقت تک کبھی نہیں ہوا تھا ۔ چنانچہ ہم عہد بعہد کی تفصیل لکھتے ہیں :

اکبر	شاہجہاں	عالمگیر
ایک کروڑ نوے لاکھ پونڈ	دو کروڑ ۲۷ لاکھ ۵۰ ہزار پونڈ	چار کروڑ پونڈ یعنی ۶۰ کروڑ روپیہ

عالمگیر کے حدود حکومت میں جو اضافہ ہوا تھا وہ حیدرآباد ، بیجاپور ، آسام ، چاٹگام اور تبت تھا ۔ لیکن ان تمام ممالک کی آمدنی دس بارہ کروڑ سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی ۔ باقی اضافہ جو ہے وہ صرف بندوبست کی خوبی اور ملک کی آبادی کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے ۔

عہدیداروں کے مرنے پر ان کی جائداد و مال کی ضبطی کا موقوف کرنا

(۳) عالمگیر کے زمانے تک یہ عام قاعدہ تھا کہ جب کوئی عہدے دار سلطنت مر جاتا تھا تو اس کی تمام جائداد ضبط ہو کر شاہی خزانہ میں داخل ہو جاتی تھی ۔ اگرچہ یہ قاعدہ جیساکہ آج ظالمانہ نظر آتا ہے اس زمانے میں نہ تھا اور درحقیقت بعض خاص مصالح پر مبنی تھا ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ بہت سی

برائیوں اور بے رحمیوں کا سر چشمہ بن گیا تھا ۔ عالمگیر نے اس قاعدے کو سرے سے موقوف کر دیا ۔

خافی خاں اور لین پول بھی اصل واقعے سے انکار نہیں کرتے ۔ لیکن کہتے ہیں کہ اس حکم کی تعمیل کم ہوتی تھی ۔ کیونکہ عالمگیر کے امراء اس کے احکام کی پوری تعمیل نہیں کرتے تھے ۔ اس کا فیصلہ ناظرین کے ہاتھ ہے ۔

(۴) سب سے بڑا کام جس سے شاید دنیائے اسلام کی تاریخ خالی ہے یہ ہے کہ بادشاہ وقت کے مقابلے میں اگر کوئی شخص داد رسی چاہے تو نہ اس کی مجال تھی نہ اس کا کوئی قاعدہ مقرر تھا ۔ عالمگیر نے ۱۰۸۲ھ میں یہ فرمان نافذ کیا کہ تمام اضلاع میں سرکاری وکیل مقرر کیے جائیں اور عام منادی کرا دی جائے کہ جس کسی کو بادشاہ پر کوئی دعویٰ ہو پیش کرے اور سرکاری وکیل اس کی جواب دہی کرے اور اس کا حق ثابت ہو تو سرکاری وکیل سے اپنا مطالبہ وصول کرے ۔

واقعہ نگار اور پرچہ نویس

(۵) ملک اور رعایا کی حالت دریافت کرنے کے لیے پرچہ نویسی اور واقعہ نگاری کے صیغے کو نہایت وسعت دی ۔ اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ یہ محکمہ خطرے سے خالی نہ تھا ۔ اگر پرچہ نویس خود غرض اور مرتشی ہوں تو ان سے بڑھ کر کوئی چیز ملک کو برباد کرنے والی نہیں ہو سکتی ۔ لیکن اس میں بھی شبہہ نہیں کہ ملک کے ایک ایک جزئی واقعے سے واقف ہونے کا کوئی ذریعہ اگر ہے تو یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو خلفاء اور سلاطین مثلاً عمر فاروقؓ ، مامون الرشید ، ناصرالدین ، عدل و انصاف کے نمونے تھے ، سب نے یہ محکمہ قائم کیا تھا اور اس کو نہایت وسعت دی تھی ۔ البتہ بڑی احتیاط سے اس کے متعلق کام لیتے تھے ۔ عالمگیر

بھی نہایت احتیاط برتتا تھا اور اس کے خطرات سے بخوبی واقف تھا۔ ایک موقع پر خود ایک رقعے میں لکھتا ہے :

”از آنجا کہ سوانح نگاران برایِ اغراضِ نفسانی، چیز ہای بسیار بر خانہ زادان ترتیب کردہ، حالامی باید کہ آن فدوی بدیوان بر نگارد کہ ہمہ مراتب را، چنان چہ باید، تحقیق نماید و بحضور معروض دارد ۔“

معزالدین اپنے پوتے کو ایک رقعے میں ایک واقعہ نگار کے متعلق لکھتا ہے :

”اگر دانند خدمت واقعہ نگاری بدیگری مقرر نمایند کہ حالا واقعہ نگار، واقعہ نگار نماند ۔“

اعظم شاہ کو ایک رقعہ لکھتا ہے :

”واقعہ نگار و ہرکارہ ہای معتبر و محتاط در محال بگذارند و روزمرہ احکام اعمال بخوانند ۔“

پرچہ نویسی کے انتظام کی وجہ سے وسیع ملک کے ایک ایک کونے کی خبر عالمگیر کو پہنچتی تھی ۔ اس کے عہد کی یہ مخصوص بات ہے کہ وہ جس قدر رعایا کی اصل حالت سے خبر رکھتا تھا اور ان کی آسائش و آرام کا انتظام کرتا، کسی سلطنت میں اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے ۔ اس کے رقعات پڑھو ۔ شہزادوں، صوبیداروں، عاملوں کی ایک ایک فروگذاشت کو پکڑتا ہے اور واقعہ نگار کا حوالہ دیتا ہے ۔ ہزاروں کوس پر کسی سوداگر یا کسی راہ چلتے کی کوئی چیز ضائع ہو جاتی ہے تو فوراً اس کو خبر لگ جاتی ہے اور وہاں کے عامل سے باز پرس کرتا ہے ۔

(٦) عالمگیر کی تاریخ حکومت کا سب سے حیرت انگیز واقعہ اس کا کلیات اور جزئیات پر یکساں حاوی اور باخبر ہونا ہے ۔ وہ

ایک طرف تو ایسی بڑی مہمات میں مصروف رہتا تھا جن سے دم لینے کی مہلت بھی نہیں مل سکتی تھی، تو دوسری طرف چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اس کی آگہی سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا اور وہ ان کو بھی اسی توجّہ اور غور رسی سے انجام دے سکتا تھا۔ الفنسٹن صاحب سے زیادہ عالمگیر کا کوئی دشمن نہیں گذرا ہے۔ ان کو بھی مجبوراً لکھنا پڑا:

''وہ خود تن تنہا اپنی حکومت کی ہر شاخ کی کار گذاری جزوی کاموں کے لحاظ و حیثیت سے کرتا رہا۔ لشکر کشیوں کے نقشے سوچتا تھا۔ لشکر کشیوں کے زمانے میں ہدایتیں جاری کرتا تھا۔ سردار اس کے قلعوں کے نقشے بایں مقصود اس کی خدمت میں ارسال کرتے تھے کہ حملوں کے مقاموں کو مقرر کرے۔ اس کے رقعوں میں پٹھانوں کے ناہموار ملکوں میں سڑکوں کے جاری کرانے اور ملتان اور آگرے کے فسادوں کو دبانے بلکہ قندھار کو دوبارہ حاصل کرنے کی تدبیریں مندرج پائی جاتی ہیں اور اسی عرصے میں فوج کا کوئی ٹکڑا یا بار برداری کی کوئی رسد نہ تھی جس کا کوچ و مقام ایسے حکموں کے بدون پایا جائے جن میں سے تھوڑے بہت حکموں کو اورنگزیب نے خاص اپنے ہاتھوں سے جاری نہ کیا ہو۔ ضلع کی مال گزاری کے ادنٰی افسر کا تقرر یا کسی محرّر کا انتخاب اپنی توجہ فرمائی کے نامناسب نہ سمجھتا تھا اور سارے کار گذاروں کی کار گزاری کی نگرانی جاسوسوں اور آنے جانے والوں کے ذریعے سے کرتا تھا اور خبروں کی اصل و بنیاد پر ہمیشہ فہمائش اور ہدایتوں کے وسیلے سے ان کو آگاہ اور خبردار رکھتا تھا۔ مگر تفصیل، جزئیات پر ایسے ذوق و شوق سے ملتفت ہونا جیسے کہ ہوشیاری اور بیدار مغزی کی دلیل ہے، ویسے ہی کام کاج کی اصل ترقی اور اجرائے کار ذاتی عروج کے لیے چنداں مفید نہیں، مگر چوں کہ اورنگ زیب کی ذات و طبیعت میں التفات جزئیات کے ساتھ بڑی

چابکی و چالاکی سلطنت کے عمدہ عمدہ کاموں میں بھی پائی جاتی تھی تو اس سے اس کی آمادگی اور نہایت گرمجوشی ایسی معلوم ہوتی ہے جو ہر زمانے میں بڑی عجیب و غریب سمجھی جاتی ہے -

(۷) ایشیائی سلطنتیں اس بات میں ہمیشہ بدنام رہیں کہ عُمّال اور عہدے دار اکثر رشوت خور ہوتے تھے - اس رشوت خوری کے اسباب میں سے بہت بڑا سبب پیش کش اور نذرانے کی رسم تھی - یعنی تمام وزراء ، امراء ، عمال سالانہ جشن میں بادشاہ کو نہایت گراں قیمت نذرانے پیش کرتے تھے - یہ نذرانے اکثر ان لوگوں کی سالانہ تنخواہ کے قریب قریب برابر پڑ جاتے تھے - اس بنا پر ان لوگوں کو اس تلافی کے لیے خواہ مخواہ رعایا سے رشوت لینی پڑتی تھی - جہانگیر اپنی توزک میں ان نذرانوں کا ذکر بڑے لطف اور مسرت کے لہجے سے کرتا ہے اور ایک ایک چیز کی تفصیل لکھتا ہے - بعض نذرانوں کی تعداد کروڑ سے زائد پہنچ گئی ہے - اگرچہ اس کے مقابلے میں بادشاہ بھی بے شمار انعامات و اکرامات کرتا تھا ، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان انعامات سے نذرانوں کا پورا بندوبست ہوتا تھا - اس کے علاوہ انعامات اکثر نقد کی صورت میں نہیں ہوتے تھے اور نذرانے میں جو چیزیں پیش کی جاتی تھیں خرید کر مہیا کرنی پڑتی تھیں - بہر حال یہ قطعی ہے کہ یہ نہایت برا طریقہ تھا اور سینکڑوں مفاسد اس سے پیدا ہوتے تھے -

عالمگیر نے اس طریقے کو بالکل بند کر دیا - چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے -

عدل و انصاف

(۸) عالمگیر کے عہدِ حکومت کا سب سے بڑا روشن کارنامہ اس کا عدل و انصاف ہے - جس میں عزیز و بیگانہ ، غریب و امیر ، دوست و دشمن کی تمیز نہ تھی - ایک رقعے میں خود لکھتا ہے کہ

معاملات انصاف میں شہزادوں کو عام آدمیوں کے برابر سمجھتا ہوں۔ یہ محض دعوٰی نہیں بلکہ غیروں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

لین پول جس کی ذاتی سند تو چنداں قابل اعتبار نہیں، لیکن جس نے اپنی رائے ایسے نکتہ چینوں کی تحریر سے اخذ کی ہے جن کو اورنگ زیب کی ذرا بھی پاس داری نہ تھی، یعنی یہ نکتہ چین بمبئی اور سورت کے تاجر ہیں، لین پول صاحب عالمگیر کے سوانح میں لکھتے ہیں: ”مغل اعظم عدل کا دریائے اعظم ہے۔ ججے تلے انصاف وہ عموماً تجویز کرتا ہے۔ کیوں کہ شاہنشاہ کے حضور میں سفارش، امارت اور منصب کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ بالکل ادنٰی سے ادنٰی آدمی کی اورنگ زیب اس مستعدی سے بات سنتا تھا جس طرح بڑے سے بڑے افسر کی“۔ ڈاکٹر کریری نے بھی، جس نے اورنگ زیب کو بمقام دکن ۱۶۹۵ء میں دیکھا تھا، اس کا یہی چال چلن بیان کیا ہے۔

ایک اور موقع پر لین پول لکھتا ہے:

”سیاحوں کی مخالفانہ نکتہ چینیاں اورنگ زیب کے چال چلن پر اسی زمانے تک تھیں جبکہ وہ شاہزادہ تھا۔ لیکن وہ سیاح جس وقت اس کے زمانۂ شہنشاہی کا حال لکھتے ہیں تو سوائے کلمات تحسین کے اور کچھ نہیں لکھتے۔ اس کے پچاس سالہ دراز عہد حکومت میں ایک ظالمانہ فعل بھی اس کے خلاف ثابت نہیں ہے، حتّٰی کہ ہندوؤں کے ستانے میں بھی جو اس کی دینداری کا ایک جزو تھا، سب کو تسلیم ہے کہ کوئی قتل یا جسمانی تکلیف رسانی نہیں پیش آئی“۔

عالمگیر نے اپنی زندگی کا مقصد سلطنت کے جاہ و جلال، شان و شوکت، ناز و نعم کے بجائے صرف رعایا کی خدمت اور راحت رسانی قرار دیا تھا۔ وہ انتہائے پیری تک دربار میں کھڑے

ہو کر رعایا کی عرضیاں لیتا تھا اور خود اپنے ہاتھ سے ان پر حکم لکھتا تھا - وہ بیان کرتا ہے کہ: "وہ صاف و سفید ململ کی پوشاک پہنے ہوئے عصائے پیری کے سہارے امیروں کے جھرمٹ میں کھڑا ہوا تھا - داد خواہوں کی عرضیاں لیتا جاتا تھا ، اور بلا عینک پڑھ کر خاص اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا جاتا تھا اور اس کے ہشاش بشاش چہرے سے صاف مترشّح تھا کہ وہ اس مصروفیت سے نہایت شاداں و فرحاں ہے" -

وہ دن میں دو تین دفعہ دربارِ عام کرتا تھا اور مطلق کسی کی روک ٹوک نہ تھی - ادنٰی سے ادنٰی جو چاہتا تھا کہتا تھا اور عالمگیر نہایت توجہ سے سنتا تھا - مرزا کام بخش عالمگیر کا نہایت چہیتا بیٹا تھا - اس کے کوکہ پر قتل کا الزام قائم ہوا - عالمگیر نے حکم دیا کہ عدالت میں تحقیقات کی جائے - کام بخش نے اس کی حمایت کی - عالمگیر نے دربار میں کام بخش کو بلا بھیجا - کام بخش اس کو بھی ساتھ لایا تھا اور اپنے آپ سے جدا نہیں کرتا تھا - عالمگیر نے حکم دیا کہ کام بخش کو کوکہ کے ساتھ قید کیا جائے - چنانچہ اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی -

---

مولانا عبدالحلیم شرر

(۱۸۶۰ - ۱۹۲۶ء)

مولانا ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے - ان کے والد تفضّل حسین ایک بلند پایہ طبیب اور عربی فارسی کے فاضل تھے - شرر بھی شروع میں اُن ہی سے فیضیاب ہوئے - اس کے بعد کلکتے میں تعلیم پائی اور منطق، ادب اور معقولات وغیرہ میں کمال حاصل کیا - انگریزی اور فرانسیسی زبانیں بھی سیکھ لیں - اسی زمانے میں لکھنؤ کے مشہور اخبار اودھ اخبار سے وابستہ ہو گئے -

دو ہی سال بعد اخبار سے علاحدگی اختیار کر کے ناول نگاری شروع کر دی اور سب سے پہلا ناول 'دلچسپ' لکھا جو بہت مشہور ہوا - اس کے بعد رسالہ دلگداز جاری کیا - یہ بڑا مقبول رسالد تھا -

ملازمت کے سلسلے میں مولانا نے حیدرآباد دکن کے دو سفر اختیار کیے - اسی دوران میں نواب وقار الامراء کے لڑکے کے اُستاد مقرر ہوئے جس کے ساتھ وہ انگلستان گئے - بعد میں مستقلاً لکھنؤ آ گئے اور تاریخی ناول نگاری کرتے رہے -

مولانا عبدالحلیم شرر ایک بڑے ناول نگار ہونے کے علاوہ اچھے تاریخ نویس اور انشاء پرداز بھی تھے - مختلف رسالے نکالتے رہے، مثلاً محشر، دل افروز اور دلگداز وغیرہ -

اُن کے ناولوں میں پلاٹ اور فن کی کمزوری اُن کے معاصر ناول نگاروں کے مقابلے میں بہت کم نظر آتی ہے - ایک کمی جو ہمیں اکثر و بیشتر مولانا کے یہاں نظر آتی ہے وہ اُن کے کرداروں اور معاشرت کے واضح تصور کی ہے - جس ماحول کو وہ پیش کرتے ہیں اُس کی وضاحت میں تشنگی پائی جاتی ہے -

تاریخ نویسی کے سلسلہ میں انھوں نے تاریخ سندھ لکھی جس پر ان کو حیدرآباد حکومت نے پانچ ہزار روپیہ کا انعام دیا - اس کے علاوہ مولانا کے ناولوں میں حسن و عشق کے معرکے بھی نظر آتے ہیں جو مقبولِ خاص و عام ہیں ، مثلاً ملک العزیز ورجنا ، فردوس بریں ، دربار حرام پور ، بابک خرمی ، منصور موہنا ، درگیش نندانی ، ایام عرب ، زوال بغداد اور فتح اندلس وغیرہ۔ شرر دراصل اردو تاریخی ناولوں کے موجد ہیں - منظر نگاری کی اتنی پر کیف مثال بھی ہمیں شرر سے پہلے نہیں ملتی - یہ کارنامے مولانا کی انفرادیت اور ان کے نام کو باقی رکھنے کے لیے بہت کافی ہیں -

---

صحبتِ برہم

کچھ آج ہی پر منحصر نہیں ، لوگ ہمیشہ سے مانتے چلے آئے ہیں کہ جو مزہ گزری صحبتوں میں تھا موجودہ صحبت میں نہیں - ہمیں یاد وہی صحبت آتی ہے جو برہم ہو چکی اور جس کے نقش دنیا سے مٹ جانے کے بعد صرف ہمارے دل میں رہ گئے ہیں - یوں تو گزرے دوستوں اور پرانی صحبتوں کو ہم رات دن یاد کرتے ہیں ، مگر ایک گھڑی کے لیے ہم گردن جھکا کے اس دھن میں بیٹھ جائیں جس کا مزہ کچھ غالب مرحوم ہی خوب جانتے تھے جو کہتے ہیں :

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت ، کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

تو حافظے کا دفتر ہمارے خیال کی آنکھوں کے سامنے کھل جائے گا اور شکار گاہ کی قندیل کی طرح فانوس خیال ایسی ایسی پر لطف باتوں کو ہمارے سامنے پیش کرکے بتائے گا اور ایسی

ایسی مزیدار صحبتوں کو جا جا کے برہم کرے گا کہ ہمیں ایسے دھوکے میں ڈال دے گا کہ خود اپنی ہستی میں بھی ہمیں تردّد ہو جائے گا۔ ہمیں شک ہو جائے گا کہ ہم زندہ بھی ہیں یا نہیں، جیتے ہیں یا انھی مرحومین کے ساتھ ہم بھی دنیا سے رخصت ہو گئے جن کی یاد ہمیں بیتاب کیے ہوئے ہے۔ اس موقع پر معلوم ہوتا ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بھول اور نسیان بھی خدا کی بھاری نعمتیں ہیں۔ یہ نہ ہوتیں اور حافظے کا یہ ہوشربا اور جگر خراش منظر ہر گھڑی نظر کے سامنے ہی رہتا تو ہم جی نہ سکتے۔ نسیان ہمارے خیال کے تھیٹر میں پردوں کا کام دیتا ہے۔ اس کی برکت ہے کہ ایک سین کے ہٹنے کے بعد ہم دوسرے سین کی کرشمہ سازیوں میں محو ہو جاتے ہیں اور گذشتہ سین کی دلچسپیوں پر پردہ پڑ جاتا ہے اور حقیقتاً نسیان ہی ہے جو موجودہ زمانے اور اس پیش نظر حالت کو ہماری نگاہ میں دلچسپ بناتا ہے۔

صحبت برہم کی جگر خراش تصویر دیکھنے کے لیے آؤ ہم ان پردوں کو ابتدا سے الٹنا شروع اور حافظے کے البم کی اول سے آخر تک ورق گردانی کر جائیں۔ اگرچہ یہ تصویریں ہماری نظر میں نہایت ہی دلچسپ ہوں گی اور ہر صفحے کا یہ عالم ہوگا کہ ''کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست''، لیکن جب وہ نگاہ کے سامنے سے گزر جائیں گی اور نظر سے گزر جانے کے بعد ہم انھیں یاد کریں گے، تو ہمارے لیے حسرت و اندوہ اور یاس و حرمان کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ اس البم کا پہلا صفحہ ہمارا بچپن ہے جو ہماری زندگی کی پہلی صحبت ہے، جب ہم بالکل سادہ لوح ہیں اور اپنے نفع و ضرر سے ناواقف۔ ہماری فکریں محدود ہیں اور ہماری آرزوئیں اور تمنائیں چھوٹی اور مختصر، جو بہت تھوڑی ہیں اور آسانی سے پوری ہو جاتی ہیں۔ مگر خدا نے ہماری مختصر و محدود آرزوؤں کے پورا کرنے کے لیے چند ایسے لوگ موجود کر رکھے

ہیں جو ہماری اس بچپن کی صحبت کے سراپا محبت ارکان ہیں ۔ ان
میں خلوص ہے ، اور انتہا درجے کی گرمجوشی ۔ ہم ان کے ہاتھ کا
کھلونا بنے ہوئے ہیں ۔ ہم ان کی نظر میں کسی بات کے مکلف نہیں
اور ہماری نظر میں وہ اس قدر زیادہ مکلّف ہیں جتنا مکلّف شاید دنیا
میں کوئی نہ ہوگا ۔ باوجود اس کے وہ ہماری ضدوں کو پورا کرتے ،
ہماری فکروں کو بھلاتے اور ہر گھڑی ہماری خاطر داشت کرتے ہیں ۔
اس صحبت کے زمانے میں ہمارے حال پر خدا کی سب سے بڑی رحمت
یہ تھی کہ ہماری کل آرزوئیں پوری ہونے والی اور تمام تمنائیں بر
آنے والی تھیں ۔ ہم جو چاہتے تھے اول تو کوئی وہ ایسی چیز ہوتی
ہی نہ تھی جو نہ ہو سکتی ہو اور اگر اس میں کچھ دشواری ہوتی
بھی تو خدا نے ہمیں ایسے شفیق و نازبردار ہم صحبت دیے تھے کہ
اسے جس طرح بنتا ، کر ہی دکھاتے ۔ اس صحبت کے ہزاروں رنگ
ہمارے خیال کی آنکھوں کے سامنے ہیں ۔ کبھی ہم ضد کر رہے ہیں
اور وہ ہمیں بہلا پھسلا کے منا رہے ہیں ۔ کبھی ہم بھولی اور
ناسمجھی کی باتیں کرتے ہیں اور وہ ان پر خوش ہو رہے ہیں ۔
کبھی شرارت پر انھوں نے ہمیں ڈانٹ دیا ہے اور کبھی ہم بیمار ہیں
اور وہ نہایت ہی جاں کاہی سے ہماری تیمارداری کر رہے ہیں ۔ بھلا
یہ دلچسپ اور پاکیزہ محفل اور ہماری بیگناہی و معصومی کی صحبت
برہم ہونے کے قابل تھی ؟ مگر نہیں ۔ زمانے نے ورق الٹا اور
افسوس وہ صحبت ایسی برہم ہوئی کہ پھر نصیب نہ ہوگی ۔ دوسرا
ورق اس زمانے کا ہے جب ہم شیر خوارگی کے دَرجے کو طے
کر کے بڑے لڑکوں میں شامل ہوئے تھے اور تعلیم پا رہے تھے ۔
اب ہمیں گھر کی اور بزرگوں کی صحبت سے نکل کر غیروں سے
ملنے جلنے کا اتفاق ہوا تھا ۔ مکتب اور اساتذہ کی مختلف صحبتیں
تھیں جن میں ہم سبق نہ یاد کرنے پر پٹتے اور کبھی لیاقت کا
کوئی ثبوت دے دینے پر شاباشی پاتے تھے ۔ کبھی سزا پانے پر

روتے اور کبھی انعام ملنے پر خوش ہو جاتے تھے۔ اگر ان تمام باتوں سے قطع نظر کر لیا جائے تو بھی ساتھ کھیلنے والوں ہم سبقوں اور ہم مکتبوں سے ایسی ایسی ہزارہا صحبتیں ہوئیں جن کے مزے آج بھی یاد آتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے بڑھاپے کی متانت بھول جاتی ہے۔ آہ! کیا بے فکریاں تھیں اور کیا دلچسپیاں تھیں۔ کبھی زندہ دلی تھی اور کبھی بے غمی۔ ایسے ایسے خالص دوستوں سے سابقہ پڑا کہ بغیر ان کی صحبت کے چین نہ آتا تھا اور ایسے ایسے ہم مذاقوں میں بیٹھنے اٹھنے کا اتفاق ہوا کہ عزیزوں اور گھر کے پرانے ناز برداروں کو بھی بھول گئے۔ وہ پیاری دلچسپ اور مزیدار صحبتیں جب اپنے ہم عمر دوستوں کے جھرمٹ میں باغوں اور پر فضا مقاموں، لب دریا اور جھیلوں کی سیر کو جاتے تھے، یا وہ صحبت کی پُر لطف بذلہ سنجیاں جب دل لگی کی باتوں اور بذلہ سنجیوں میں ہم میں سے ہر ایک دوسرے پر فوقیت لے جاتا تھا، کبھی صفحۂ دل پر سے مٹ نہیں سکتیں۔ افسوس اس دور میں کیسے کیسے خوش رو اور زندہ دل دوستوں سے ملتے جلتے اور قہقہوں اور چہچہوں میں رہتے تھے۔ ان صحبتوں کے بہت سے دوستوں کی صورتیں آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہیں۔ ان کے بشاش چہروں کو آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ مگر آہ! کہیں پتہ نہیں۔ ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے۔ ان میں سے بہت سے دوست اب بھی موجود ہیں مگر ہماری طرح وہ بھی بدل گئے۔ نہ وہ ہم ہی رہے ہیں اور نہ وہ وہی رہے ہیں۔ پرانی صحبت کو یاد کرکے ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے مگر جاتے ہیں تو اب ان میں وہ بات نہیں پاتے جو پہلے تھی اور جیسے دل چاہتا ہے۔ ہماری ہی سی افسردہ دلی ان پر بھی طاری ہو گئی اور جن افکار نے ہمیں وہ اگلی زندگی بھلا دی، انھی نے ان کو بھی افسردہ اور پژمردہ بنا دیا ہے۔ افسوس یہ صحبتیں کیسی برہم ہوگئیں! اے ناہنجار زمانے! یہ مٹنے والی صحبتیں

تھیں ؟ یہ دل فریب نقش بھلا اس قابل تھے کہ تو انھیں بگاڑ دے ؟
مگر کیا کیا جائے ، کہ تو ظالم ہے اور بے رحم ! ان صحبتوں نے
زندگی کے البم کا ایک ہی صفحہ یا ورق لیا ہوگا ۔ خدا جانے ان
دلچسپیوں اور ان محفلوں کے مزوں میں محو اور از خود رفتہ ہوئے
ہم کتنے ایک ورق الٹ گئے ہوں گے ۔ کیوں کہ اس تھوڑے ہی
زمانے میں ہماری پُر لطف صحبتوں نے جیسے جیسے رنگ بدلے اور
یکے بعد دیگرے جن ہم مذاق و زندہ دل دوستوں سے صحبت گرم
ہوئی ان کی حالتیں دکھانے کے لیے چند اوراق کیسے ، کوئی بڑا
ضخیم البم بھی کافی نہیں ہو سکتا ۔ غرض اب ہم اپنی عمر کے البم
کی دوسری جلد کھولتے ہیں اور اپنے آپ کو اس زمانے میں پاتے ہیں
جب کہ عہد شباب تھا اور گو فطرت کا مزاج شناس شاعر خوب
کہہ گیا ہے کہ :

عہدِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

مگر ہم یہ خواب دیکھیں گے اور اپنے دوستوں کو بھی دکھائیں
گے ، کیوں کہ اس عہد کی صحبتوں سے اچھی صحبتیں اور کبھی
نہیں نصیب ہوئی تھیں اور ان کے برہم ہونے کا صدمہ سب صدموں
پر غالب ہے ۔ جوش اور امنگ کا یہی زمانہ تھا ۔ اسی عہد میں ہم
اس انسانی کمال کو پہنچے تھے جب تمام جذبات پوری قوت پر
ہوتے ہیں اور ہر مزیدار جذبہ جوش پر ہوتا ہے ۔ آہ ! شباب کا خیال
آتے ہی خدا جانے کون کون صحبتیں یاد آ گئیں؟ کبھی پری وشوں
کے جھرمٹ میں تھے ۔ ناز آفرینی اور ناز برداری کی صحبت گرم
تھی اور کبھی بذلہ سنجوں میں نشست و برخاست تھی اور یہ حالت
تھی کہ ''کھانا بے دل لگی نہ پچتا تھا'' اور لطف یہ کہ دونوں
جگہ ہماری سحر گری ایسی بڑھی چڑھی تھی کہ ہمیں کوئی مزہ
نہیں آتا تھا بلکہ ہم سے اور سب لوگ بھی ویسا ہی لطف اٹھاتے

تھے - بے وفا کافر ماجراؤں کے فراق میں اگر ہم بیتاب رہتے تھے تو ہمارے بغیر ان سنگدلوں کو بھی چین نہ پڑتا تھا - ان کی رکاوٹیں اگر ہمارے دل میں چراغ الفت اکساتی تھیں تو ہمارا چلبلاپن اور ہماری شوخ طبعیاں ان کے پہلو بھی گد گداتی تھیں - وہ بگڑتے تھے اس لیے کہ ہم منائیں اور ہم چھیڑتے تھے تو اس لیے کہ وہ روٹھیں - وہ بگڑ کر مارتے تھے تو ڈھیلے ہاتھوں سے اور ہم جوش میں آ کر دست درازی کرتے تھے تو اس لیے کہ ایسے ہی دو چار ہاتھ اور پڑ جائیں - آہ ! یہ صحبت ! افسوس کیسی برہم ہوئی !

پیارے ہم صحبتوں میں وہ ناز آفرینی رہی اور نہ ہم میں وہ ناز برداری - نہ ان میں وہ بگڑنے اور منہ تھوتھا لینے کا مزہ رہا اور نہ ہم میں اس چھیڑ چھاڑ اور دست درازی کا لپکا - اس صحبت کو یاد کرکے بار بار یہ نعرہ بلند کرتے ہیں کہ ”ایک بار دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس“ - مگر کوئی حاتم نہیں ملتا کہ ہمارا یہ سوال پورا کرے -“ جوانی کی بے قرار طبیعت ہمیشہ نکتہ سنج و با مذاق دوستوں اور پری جمال دل رباؤں ہی کی صحبت میں نہیں رکھتی تھی اور اوقات میں مقدس مقتداؤں اور مہذب پاکبازوں کے حلقۂ ذوق میں بھی جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور وہاں بھی ہمارا جوشِ شباب بغیر کچھ رنگ دکھائے نہ رہتا تھا -

ہم اگرچہ اپنے آپ کو اس صحبت کا مردِ میدان نہیں پاتے تھے ، مگر پھر بھی عقیدت ہی کا جوش ایسے کرشمے دکھا دیتا تھا کہ حضرت شیخ اور زاہدِ خشک کو بھی ہمارے ساتھ ایک خاص قسم کا انس ہو جاتا تھا - ہم اگر ان کی صحبت کو سرمایۂ برکت خیال کرتے تو وہ ہماری ملاقات کو اپنی مقبولیت اور مرجعیت کی گرم بازاری خیال کرکے ہماری طرف زیادہ التفات کرتے تھے - سچ یہ ہے کہ چاہے ان کی علمی صحبت میں ہم ایک ابجد خواں کی حیثیت بھی نہ رکھتے ہوں ، مگر پھر بھی ہماری صحبت ان کی محفل

کے لیے بھی باعث رونق تھی - ہماری بیتابانہ گرمجوشی اور ہماری
محویت اور دُھن ان پاکبازی کی صحبتوں اور ان مبارک محفلوں میں
بھی ایسا رنگ ضرور دیا کرتی تھی کہ اور عمر والوں سے زیادہ
ہماری قدر ہوتی تھی - آہ ! ان دنوں ایک محفل اور ایک ہی طرح
کی صحبت نہ تھی - ہزارہا صحبتیں تھیں اور سب دلچسپ تھیں ،
اور ہم سب کے رکن بنے ہوئے تھے - کیا وہ یاروں کی بے فکریاں ،
ناچ گانے کی محفلیں ، کلیجے میں اتر جانے والی دلکش تانوں پر ہماری
بیقراریاں ، وہ تاک جھانک کا لپکا ، وہ میلوں اور تماشوں میں سب
سے پہلے پہنچنا ، وہ کوئے یار میں صدہا چکر لگانا اور نہ تھکنا ،
بھولنے والی باتیں ہیں ؟ ہرگز نہیں یہ باتیں مرتے دم تک یاد
آئیں گی اور یقین نہیں کہ اس عالم میں جانے کے بعد بھی بھولیں -
جوانی کی صحبتیں رخصت کرنے کے بعد کچھ ایسے صدمے پہنچے
تھے کہ دل و دماغ میں ایک دائمی افسردگی و مردہ دلی پیدا ہو گئی
تھی - مگر اب ہمارے سامنے چند زیادہ متین و مہذب صحبتیں قائم
تھیں جن میں دل کچھ نہ کچھ ضرور بہل جاتا تھا - اس میں شک
نہیں کہ اکثر ہم عالمِ شباب کے گذرے ہوئے خواب کو یاد
کرکے روتے اور آپ اپنی مرثیہ خوانی کیا کرتے ، مگر خُردوں میں
اپنا ادب اور ہم صحبتوں میں اپنا احترام و وقار دیکھ کے اکثر اس
بات کا خیال کرکے اطمینان بھی ہو جاتا تھا کہ اب ہم پہلے سے
زیادہ معزز ہیں اور جو عزت ہمیں اب حاصل ہے کبھی نہیں حاصل
تھی - اسی وجہ سے اس عہد کی صحبتوں میں ہماری رائے کی زیادہ
وقعت ہوتی تھی - ہمارے خیالات کی زیادہ قدر کی جاتی تھی - لوگ
ہمیں پختہ مغز و تجربہ کار خیال کرکے ہمارا ادب و لحاظ کرتے
تھے اور اکثر محض ہمارے دعوے کو سن کر اپنی دلیلوں کو
اٹھا رکھتے تھے - اب ہم ان ارباب حل و عقد میں تھے جو اپنی قوم
اور اپنی جماعت کی رہبری کرتے ہیں - بجائے اس کے کہ نوجوان

بیٹھ کے ہنسی مذاق کی باتیں کریں اور اپنی بذلہ سنجی و خوش مذاق کی بے تکلفیاں دکھائیں ، ہمارے سامنے ادب سے بیٹھتے تھے اور ہماری باتیں ان کے نزدیک ناصح مشفق یا حضرت شیخ کی نصیحتیں تھیں - پیٹھ پیچھے یا شاعری کی دھن میں چاہے ہمیں برا بھلا کہیں اور ہماری توہین کریں ، مگر سامنے حسن عقیدت اور ارادت مندی ہی کی شان سے بیٹھتے تھے - وہ نازنین پری جمال جن کا کام تھا کہ ظلم و جور کریں اور جن کی ناز برداری ہمارے لیے زندگی کا سب سے بڑا سرمایۂ نشاط تھی ، اب ہماری ہر بات پر ہاں اور بجا کہتی تھیں - اب ان میں بے مہری اور بیوفائی نہ تھی - ہم جو کہیں اسے نہایت ہی خلوصِ عقیدت سے مان لیتی تھیں اور گویا ہمارے اشاروں پر چلنے کو تیار تھیں - مگر افسوس ہمارے جذبات مردہ ہو چکے تھے اور چاہے دکھانے کے لیے ہم زندہ ہوں مگر دل و دماغ کب کے مر چکے تھے -

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

بہر تقدیر یہ ارمان اور حسرتیں جو مردہ ہو چکی تھیں چاہے کسی کسی وقت یاد آکے بیتاب و بیقرار کر دیں ، مگر غور سے دیکھیے تو ہم برے نہ تھے اور یہ صحبتیں بھی غنیمت تھیں - یہ بھول نہیں سکتا کہ ہم کیسے کیسے معزز و محترم اور مشہور و معروف لوگوں سے ہم صحبت تھے ؟ کیسے کیسے اعلی درجے کے لوگ ہم سے مشورہ لیا کرتے تھے ! اور بوڑھی مجلسوں میں کبھی کبھی مخلّی بالطبع ہو کے ہم کیسی کیسی جوان مزاجیاں اور شوخ طبعیاں دکھا دیا کرتے تھے ؟ جس مجمع میں گزر جاتے لوگ کس حسنِ عقیدت اور کیسی سادگی و خلوص کی محبت سے ہمارا استقبال کرتے تھے - کس طرح ہاتھوں ہاتھ لیتے اور ہمارے لیے آنکھیں بچھاتے تھے - آخر فرشتۂ اجل نے آ کر اس دَور کو بھی ختم کر دیا - اب ہم قبر

میں لیٹے ہوئے ہیں ، تنہا ہیں اور خاموش ۔ اپنے اچھے کاموں کے صلے اور اپنی سیہ کاریوں کی پاداش کا انتظار کر رہے ہیں ۔ قیامت آتی نہیں مگر اس کے دھڑکے مارے ڈالتے ہیں ۔ تنہائی میں معمول ہے کہ نظر کے سامنے جب واقعات اور معاملات نہیں آتے تو خیالات کا ہجوم ہوتا ہے ۔ لہٰذا جس طرح ہم ایک خیال بن کے اپنے دوستوں اور اپنے سے بچھڑے ہوؤں کے دل میں آتے اور سنا جاتے ہوں گے اسی طرح خود بھی شب و روز خیال ہی کے عالم میں رہا کرتے ہیں۔ یہ عالم جس میں اب ہمارا مسکن و نشیمن ہے ، اس کو موجودہ حالات سے کوئی علاقہ ہی نہیں ۔ یا یوں کہیے کہ اس میں زمانہ حال ہی نہیں ۔ یا تو گذرا زمانہ ہے یا استقبال اور اسی وجہ سے یا تو اگلی صحبتوں کی یاد ہے یا آنے والی صحبتوں کا دھڑکا ۔ آرزوئیں اور تمنائیں ہیں جو بے نکلے رہ گئیں اور یہ اندیشہ ہے کہ دیکھیے اب کس سے اور کیا سابقہ پڑتا ہے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ مرنے پر اگرچہ وہ سب اگلی صحبتیں چھوٹ گئیں اور ان سے کوئی علاقہ نہیں رہا ، مگر ان کی یاد دم نکلنے پر بھی نہیں بھولتی ۔ وہ تمام برہم صحبتیں آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہیں اور خدا جانے کیسی کیسی پیاری دلچسپ صورتیں خیال کے سامنے آ آ کر تڑپاتی ہیں اور ہماری بوسیدہ ہڈیاں اپنی زبانِ حال سے یہ شعر پڑھنے لگتی ہیں جو زندگی میں کبھی تفنُنِ طبع کے طریقے پر زبان سے نکل جاتا ہے ۔

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز یہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

غرض عدم آباد کی ساری بستی اور موت کی خلوت و فرصت میں سوا

اس کے اور کوئی مشغلہ نہیں کہ شب و روز اپنی زندگی کی صحبت ہائے برہم کے اس البم کی ورق گردانی کیا کرتے ہیں۔ ہزارہا بار اول سے آخر تک دیکھ گئے اور ہر منظر کو گھنٹوں دیکھا، مگر جی نہیں بھرتا۔ جب آخر تک دیکھ چکتے، تو پھر سرے سے آلٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ جس طرح کوئی مُستَسقی پانی پی پی کے پانی مانگتا ہے اسی طرح ہم ان صحبت ہائے برہم کے مناظر کو دیکھ دیکھ کے بیتابی سے پکار اٹھتے ہیں۔ ''ایک بار دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔''

————

نسیم حجازی

مقبول عام ادیب اور صحافی نسیم حجازی کا اصل نام محمد شریف ہے - وہ ۱۹۱۴ء میں ضلع گرداسپور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے - اسلامیہ کالج لاہور سے گریجوایٹ ہوئے - پہلی کتاب داستان مجاہد ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی - انہوں نے اسلامی تاریخ اور مسلمان مجاہدین کے بارے میں کئی ولولہ انگیز ناول لکھے ہیں - جن میں محمد بن قاسم ، انسان اور دیوتا ، آخری چٹان ، خاک اور خون ، شاہین ، یوسف بن تاشفین ، معظم علی اور قیصر و کسریٰ بہت مقبول ہوئے - سفید جزیرہ ، سو سال بعد اور ثقافت کی علامتوں میں انہوں نے طنز و مزاح کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں - پاکستان سے دیارِ حرم تک ایک سفر نامہ بھی لکھا ہے - انہوں نے روزنامہ تعمیر راولپنڈی اور روزنامہ کوہستان لاہور جاری کیا اور ایک مدت تک ان کے ایڈیٹر رہے -

زیر نظر مضمون "پانی پت کی تیسری جنگ" ان کے ناول معظم علی سے لیا گیا ہے -

---

پانی پت کی تیسری جنگ

۱۳ جنوری ۱۷۶۱ء کا آفتاب ہندوستان کی تاریخ کا ایک عظیم ترین معرکہ دیکھ رہا تھا - طلوع سحر کے ساتھ مرہٹہ فوج نے میلوں لمبی صفوں میں اپنے پڑاؤ سے نکل کر آگے بڑھنا شروع کیا - ان کے میسرہ پر گاردی کے تربیت یافتہ دستے تھے - ان کے ساتھ

گیکواڑ کی فوجیں تھیں - مَیمنے میں ملہار راؤ ہلکر اور جنکو جی سندھیا تھے - قلب لشکر میں بھاؤ اور بشواش راؤ ایک جنگی ہاتھی کے ہودج میں بیٹھے ہوئے تھے - مسلمانوں کے لشکر کے قلب میں ابدالی کا وزیر اعظم شاہ ولی خاں تھا اور اس کی کمان میں دُرّانی فوج کے وہ آزمودہ کار جانباز تھے جو کئی میدانوں میں داد شجاعت دے چکے تھے - مَیسرے پر شاہ پسند خان اور نجیب الدولہ تھے - شجاع الدولہ کی افواج مَیسرے اور قلب لشکر کے درمیان تھیں - مَیمنے کی قیادت برخوردار خان کے ہاتھ میں تھی اور روہیلہ ، مغل اور بلوچ سپاہیوں کے کئی دستے اس کے ساتھ تھے -

احمد شاہ ابدالی ایک سفید گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی عقابی نگاہوں سے میدان جنگ کا نقشہ دیکھ رہا تھا - برق رفتار سواروں کی ایک جمعیت فوج کے جرنیلوں اور سالاروں کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کی ہدایات پہنچانے میں مصروف تھی - جنگ کی ابتداء مرہٹہ توپوں کی آتشباری سے ہوئی اور اس کے بعد گاردی کے تربیت یافتہ دستوں نے افغان فوج کے دائیں بازو کے روہیلہ دستوں پر سنگینوں سے حملہ کر دیا - روہیلوں کے پیچھے ہٹتے ہی بھاؤ نے اپنے سواروں کو ایک عام حملے کا حکم دیا اور افغان فوج کی اگلی تین صفیں درہم برہم کر دیں - پانی پت کا معرکہ اب پوری شدت کے ساتھ شروع ہو چکا تھا - گرد و غبار کے بادلوں میں گھوڑوں کی ٹاپ ، توپوں کی دھنا دھن ، بندوقوں کے دھماکوں ، تلواروں کی جھنکار اور زخمیوں کی چیخ و پکار کے ساتھ ایک طرف سے "اللہ اکبر" اور دوسری طرف سے "ہر ہر مہادیو" کے نعرے سنائی دے رہے تھے - شاہ ولی خان نے افغانوں کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو گھوڑے سے اتر کر پوری قوت سے چلایا ، "میرے رفیقو ! تم کہاں جا رہے ہو ؟ ہمارا وطن بہت دور ہے " - لیکن اس کی آواز جنگ کے مہیب ہنگاموں میں گم ہو کر رہ گئی - جنگ کے ابتدائی دور میں مرہٹوں کا

پانسہ بھاری معلوم ہوتا تھا ۔ افغانوں کے مَیمنے اور قلب لشکر میں افراتفری پھیل چکی تھی ۔ لیکن مَیسرے کی افواج ابھی تک پوری طرح منظم تھیں ۔ نجیب الدولہ جوابی حملہ کر چکا تھا اور اس کے ساتھ حافظ رحمت خاں اور دوسرے روہیلہ سرداروں کی افواج پوری شدت کے ساتھ مرہٹوں پر دباؤ ڈال رہی تھیں ۔ نجیب الدولہ کے پیادہ سپاہی دشمن کی صفوں پر ہوائیاں اور گولے پھینکتے اور جب دشمن پیچھے ہٹتا تو نیزہ باز ٹوٹ پڑتے ۔ معظم علی کی کمان میں ایک ہزار روہیلہ سوار تھے اور ان میں سے اکثر اکبر خان کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے ۔ اس نے مرہٹہ لشکر کے مَیمنے پر حملہ کیا اور چند منٹ کے اندر اندر جنکوجی سندھیا کی فوج کی کئی صفیں الٹ کر رکھ دیں ۔ اس کے بعد دوسرے روہیلہ سردار اور نجیب الدولہ کے چند دستے اس کے ساتھ جا ملے اور انھوں نے مل کر پے در پے حملے کر کے دشمن کو پیچھے ہٹانا شروع کر دیا ۔

سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا ۔ لیکن لڑنے والوں کو گرد و غبار کے بادلوں میں اس کے صرف دھندلے سے آثار نظر آتے تھے ۔ جنگ اب اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی کہ جب ہر وقت فریقین میں سے کسی ایک کے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلنے کا امکان تھا ۔ اس ہنگامۂ محشر میں جس شخص کے چہرے پر اضطراب ، گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے وہ احمد شاہ ابدالی تھا ۔ اس کی پیشانی پر اپنے سپاہیوں کے لیے فتح کی بشارت لکھی ہوئی تھی ۔ مرہٹے اپنی ساری قوت میدان میں لا چکے تھے ۔ لیکن احمد شاہ ابدالی کے ترکش میں ایک آخری تیر ابھی باقی تھا ۔ دوپہر کے وقت اس نے اپنی محفوظ فوج کے ان چودہ ہزار سواروں کو میدان میں آنے کا حکم دیا ۔ جنھیں جنگ شروع ہونے سے قبل میدان سے پیچھے ہٹا دیا تھا ۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہر محاذ سے اپنے جرنیلوں کو فیصلہ کن حملہ کرنے کا حکم دیا ۔ اب گرد و غبار کی یہ حالت

تھی کہ زمین اور آسمان میں تمیز کرنا مشکل تھا ۔ ابدالی کے محفوظ دستے اس کے لشکر کے عقب سے ایک آندھی کی طرح نمودار ہوئے اور دشمن کے مَیمنے اور مَیسرے کی صفیں چیرتے ہوئے اس کے عقب میں جا پہنچے ۔ تازہ دم فوج کے میدان میں آنے سے محفوظ فوج کے دستے دشمن کی صفیں روندتے ہوئے کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف نکل جاتے تھے ۔ سوا دو بجے کے قریب بشواش راؤ گولی لگنے سے زخمی ہوگیا ۔ بھاؤ نے دل برداشتہ ہوکر آخری بار پوری شدت کے ساتھ حملہ کیا اور بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا ۔ سپہ سالار کی موت سے مرہٹوں کے حوصلے پست ہو گئے اور شام کے چار بجے کے قریب یکایک ان کی ساری فوج میدان سے بھاگ نکلی ۔ فاتح فوج نے ان کا پیچھا کیا اور مرہٹہ کیمپ کی خندق لاشوں سے بھر دی ۔ آفتاب کی واپسیں نگاہیں کوسوں دور تک مرہٹوں کی تباہی کا منظر دیکھ رہی تھیں ۔ ۔ ابدالی کا لشکر چاندنی رات میں طلوع سحر تک مرہٹوں کا تعاقب کرتا رہا ۔ اگلی صبح کیمپ میں پناہ لینے والے بچے کھچے دستوں پر بھی یلغار کی گئی ۔ بشواش راؤ زخمی ہونے کے چند گھنٹے بعد مر چکا تھا ۔ میدان سے بھاگنے والی مرہٹہ فوج کا تعاقب کرنے والے صرف افغان روہیلے بلوچ اور مغل ہی نہ تھے بلکہ قرب و جوار کے وہ دیہاتی جن پر مرہٹوں نے پانی پت میں قیام کے دوران میں ان گنت مظالم کیے تھے ۔ تلواروں ، برچھیوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہو کر جگہ جگہ انھیں موت کے گھاٹ اتار رہے تھے ۔ مرہٹوں سے عوام کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ دیہات کی عورتیں ان کا پیچھا کر رہی تھیں ۔ مرہٹہ کیمپ کا مال غنیمت کسی بڑی سلطنت کے خزانوں سے کم نہ تھا ۔ جواہرات ، سونے اور چاندی کے علاوہ ہزاروں بیل گاڑیاں ، کوئی دو لاکھ مویشی ، ہزاروں گھوڑے اور اونٹ اور پانچ سو ہاتھی افغانوں کے ہاتھ لگے ۔

چند دن بعد احمد شاہ ابدالی کی افواج دلّی کا رخ کر رہی تھیں۔

پانی پت کی شکست مرہٹہ تاریخ کی ایک مکمل شکست تھی - ہلکر ، داماجی گیکواڑ ، نارو شینکر ، مہادیوجی سندھیا اور نانا فرنویس کے سوا تمام بڑے بڑے مرہٹہ سردار مارے جا چکے تھے - ابراہیم گاردی ، جسے مسلمانوں کا بدترین غدار سمجھا جاتا تھا ، گرفتار ہونے کے بعد قتل کیا گیا - شمشیر بہادر اور انتاجی منگیشوَر ، جو زخمی ہو کر بھاگے تھے - راستے میں مر گئے - مرہٹوں کی عظیم فوج میں سے صرف ایک چوتھائی سپاہی ایسے تھے جنھیں دوبارہ اپنا وطن دیکھنا نصیب ہوا - احمد شاہ ابدالی کو بھی اس فتح کے لیے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی لیکن وہ عظیم مقصد جس کے لیے یہ جنگ لڑی گئی تھی ، پورا ہو چکا تھا - شمالی ہندوستان میں پاؤں پھیلانے کے متعلق مرہٹوں کے عزائم ہمیشہ کے لیے خاک میں مل چکے تھے -

---

آفتاب حسن

۱۹۰۹ء میں بہار کے مردم خیز خطہ بازیدپور میں پیدا ہوئے - ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۳ء تک علی گڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے اور وہیں سے ایم - ایس - سی پاس کیا - اُن کی طالب علمی کا زمانہ نہایت کامیاب رہا - تصنیف و تالیف اسی دور سے شروع ہوئی - علی گڑھ کے بعد وہ لندن گئے ، جہاں سے انھوں نے کیمیا میں بی - ایس - سی کی ڈگری حاصل کی - واپسی پر حیدرآباد (دکن) میں ملازم ہو گئے - ابتدا میں انسپکٹر تعلیم سائنس ہوئے - پھر مددگار ناظم تعلیمات - اس کے بعد پرنسپل اورنگ آباد کالج -

سقوط حیدرآباد سے ذرا پہلے ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کو سڈنی کاٹن کے جہاز سے پاکستان پہنچے اور ۱۹۴۹ء میں صدر شعبۂ سائنس و ریاضیات پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول مقرر ہوئے جہاں انھیں میجر کا درجہ دیا گیا - ۱۹۵۲ء میں اردو کالج کراچی کے پرنسپل مقرر ہوئے اور ۱۹۵۹ء تک نہایت کامیابی کے ساتھ اس ادارہ کو چلایا -

آج کل کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کے ناظم ہیں اور شعبۂ کیمیا کی بھی دیکھ بھال کرتے ہیں -

مختلف کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں - معلومات سائنس ، جدید معلومات سائنس ، سائنس کی باتیں ، سائنس سب کے لیے ، سائنس ہمارے لیے ، آئنسٹائن اور کائنات ، سائنس کی پہلی کتاب تا چوتھی کتاب طریقۂ تعلیم سائنس وغیرہ وغیرہ - کئی رسالوں کے مدیر اعزازی بھی رہے ہیں - مثلاً رسالہ سائنس ، جدید سائنس وغیرہ -

پٹرولیم

ہماری زمین انمول خزانوں سے بھری پڑی ہے اور ان خزانوں سے جو دولت نکلتی ہے اس میں پٹرولیم ایسی شے ہے جس کا بدل ملنا بہت مشکل ہے۔ جدید دنیا دراصل مشین کی دنیا ہے۔ مشین قوت سے چلتی ہے۔ مشینوں کو قوت پہنچانے کے لیے اس وقت تین اہم ذریعے ہیں بجلی، کوئلہ اور پٹرول۔ بجلی ایک جگہ قائم رہنے والی مشینوں کے لیے بہت موزوں ہے۔ حمل و نقل کی مشینوں میں بھی بجلی استعمال ہوتی ہے لیکن اس کے لیے تار کی ضرورت ہے۔ یہ لازمی ہے کہ مشینوں کا تعلق تار کے ذریعے بجلی کے کارخانوں سے رہے۔ سردست یہ ممکن نہیں ہے بجلی کی بڑی مقدار کو جمع کر کے رکھا جائے اور اس سے موٹر اور ہوائی جہاز چلائے جائیں۔ کوئلہ عام طور پر کارخانوں، جہازوں اور ریلوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس میں مصیبت یہ ہے کہ قوت کی مناسبت سے اس میں وزن زیادہ ہوتا ہے۔ تیزرو اور ہلکی مشینوں میں یہ کام نہیں دے سکتا۔ اب رہ گیا پٹرول۔ یہی وہ صاف ستھری جلد بھڑک اٹھنے والی چیز ہے جو مشینوں کے جسم میں خون کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کی تیز ترین مشینیں اس سے چلتی ہیں۔ ہوائی جہاز، موٹریں اور طرح طرح کی گاڑیاں اس کے بل پر طول طویل فاصلے پل بھر میں طے کر لیتی ہیں۔

خشکی، تری اور ہوا میں جب کسی مشین کو آپ حرکت کرتے ہوئے دیکھیں تو یقین کیجیے کہ اس میں پٹرولیم کسی نہ کسی صورت میں استعمال ہو رہا ہے۔ اگر ایندھن کی حیثیت سے نہیں تو کم از کم چکنائی کی حیثیت سے۔ کیوں کہ پٹرولیم سے ایسے گاڑھے تیل بھی نکلتے ہیں جن سے مشینوں کے مختلف حصوں کو چکنا کر کے ان کی مزاحمت کو کم کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

پٹرولیم کو معدنی تیل بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ تیل اور ذریعوں سے بھی حاصل ہو سکتا ہے - پودوں میں سے جو تیل حاصل ہوتا ہے اسے نباتاتی تیل کہتے ہیں - حیوانوں سے بھی تیل حاصل ہوتا ہے - اس کو چربی کا نام دیا گیا ہے - پٹرولیم کو معدنی تیل یوں کہا جاتا ہے کہ وہ زمین سے نکلتا ہے -

پرانے لوگ پٹرولیم سے واقف تھے : پٹرولیم کوئی نئی دریافت نہیں ہے - پرانے لوگ اس سے واقف تھے - انجیل میں اس کا ذکر موجود ہے - قدیم مؤرّخ ہیروڈوٹس ، بابل کے قریب ایک تیل کے چشمے کا ذکر کرتا ہے - یہی مُؤرِّخ بیان کرتا ہے کہ جزیرۂ زانٹے میں بھی ایک تیل کا چشمہ ہے - خاص بات یہ ہے کہ دو ہزار سال گزر گئے لیکن زانٹے میں اب بھی تیل کا چشمہ موجود ہے -

بلنیاس (پلینی) نے صِقلیہ میں معدنی تیل کی موجودگی کا ذکر کیا ہے - پرانی جاپانی اور چینی کتابوں میں بھی جگہ جگہ معدنی تیل کا بیان ہے - مشہور سیاح مارکو پولو اپنے سفر نامے میں باکو کے قریب تیل کے چشموں کا بڑی تفصیل سے ذکر کرتا ہے - اس کا بیان ہے کہ صرف ایک چشمے سے تیل اس قدر نکلتا ہے کہ اس سے سو جہازوں کو بھرا جا سکتا ہے - ساتھ ہی ساتھ مارکو پولو یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ تیل کھانے کے لائق نہیں ، اس کو صرف جلانے کے کام میں لایا جا سکتا ہے -

پرانے لوگ تیل کو جلانے کے علاوہ دوا کے کام میں لایا کرتے تھے - زخموں کو اچھا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا - پٹرولیم سے جب تمام آسانی سے بخارات میں تبدیل ہو جانے والے اجزاء نکل جاتے ہیں ، تو ایک گاڑھی شے بن جاتی ہے - اس کو قیر (پچ) کہتے ہیں - اس کو قدیم زمانہ میں کشتیوں کو پانی کے اثر سے محفوظ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا -

چینی لوگ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بہت پہلے زمین کو کھود کھود کر تیل نکالا کرتے تھے - برما میں ایراودی ندی کے کنارے جو چشمے ہیں ، بہت قدیم ہیں - آج بھی زبردست برموں سے کھودے ہوئے کنوؤں اور جدید آلات سے مزین کارخانوں کے پہلو بہ پہلو ہاتھ سے کھودے ہوئے تیل کے کنوئیں موجود ہیں جن سے برمی لوگ تیل نکالا کرتے ہیں - اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین کے اندر یہ تیل کہاں سے آ گیا ؟

زمین کے اندر تیل کس طرح بنا : کیمیاوی نقطۂ نگاہ سے پٹرولیم ایک بہت سادی چیز ہے - یہ صرف دو عناصر کاربن اور ہائیڈروجن سے مل کر بنا ہے - ہائیڈروجن اور کاربن کے مرکب کو کیمیا کی زبان میں ہائیڈرو کاربن کہتے ہیں - پٹرولیم مختلف قسم کے ہائیڈرو کاربنوں کا ایک آمیزہ ہے - اس سوال کا کہ زمین کے اندر یہ ہائیڈرو کاربن کہاں سے آ گئے ، قطعی جواب دینا مشکل ہے - ناظرین کو تعجب ہوگا کہ گو پٹرولیم کی صنعت اس قدر اہم ہے کہ دنیا کی اکثر مشینوں میں اس کی ضرورت کسی نہ کسی شکل میں پیش آتی ہے ، اور اس کو دریافت ہوئے بھی کافی عرصہ ہو چکا ، لیکن لوگوں کو ابھی تک قطعی طور پر نہیں معلوم کہ یہ چیز کس طرح وجود میں آئی - بات ہے تعجب انگیز ، لیکن واقعہ یہی ہے - ابھی تک اس کے متعلق کوئی نظریہ پیش نہیں کیا جا سکا ہے ، جس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ قطعی صحیح ہے -

مختلف لوگ مختلف خیال رکھتے ہیں - پرانے لوگوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ پٹرول کا کاربن اور ہائیڈروجن معدنیات سے آیا ہے - زمین کے اندر یہ عناصر مختلف مرکبات کی شکل میں موجود ہیں - انھیں مرکبات پر زمین کا زبردست دباؤ پڑا - اندرونی حرارت کا اثر اور لاکھوں سال اس حالت میں رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاربن اور ہائیڈروجن کے جوہر آپس میں ملے اور ہائیڈرو

کاربن تیار ہوا - اس نظریے کو غیر نامیاتی نظریہ کہتے ہیں - اگر یہ نظریہ صحیح ہوتا تو دنیا والوں کی بڑی خوش قسمتی ہوتی ، کیونکہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور پٹرولیم ختم ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے - لیکن افسوس ہے کہ یہ نظریہ زیادہ قابل قبول نہیں ہے - اس کی صحت پر بہت کم لوگ یقین رکھتے ہیں -

کثرت رائے نامیاتی نظریے کی طرف ہے - اس نظریے کے مطابق پٹرولیم کے کاربن اور ہائیڈروجن کے ماخذ مردہ معدنی اشیاء نہیں بلکہ نہایت ہی ننھے ننھے حیوانی اور نباتاتی جان دار ہیں -

یہ جو سنگ مرمر ، ریت پتھر ، چونا پتھر ، شیل اور دوسرے قسم کے تہ بہ تہ جمے ہوئے پتھر ہمیں زمین پر نظر آتے ہیں ، ان کو رسوبی چٹانیں کہا جاتا ہے - یہ چٹانیں اب تو خشکی میں ہیں لیکن دراصل یہ سمندر کی تہ میں لاکھوں سال کے عمل سے تیار ہوئی ہیں - آج سے کروڑوں سال پہلے زمین کی حالت مختلف تھی - آج جہاں خشکی ہے ، لوگ رستے بستے ہیں ، وہاں سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا ، اور جہاں سمندر پھیلا ہوا ہے ، وہاں گھنے جنگل اور پہاڑ اپنے زمانے کے جانوروں سے بھرے ہوئے تھے -

بارش کے سبب نالے ، ندیاں ، دریا خشکی سے ریت اور مٹی کی بڑی بڑی مقداریں سمندر میں بہا کر لاتے رہتے ہیں - یہ مٹی سمندر کی تہ میں آہستہ آہستہ بیٹھتی جاتی ہے اور پانی کے بہاؤ اور مد و جزر کے سبب سمندر کی تہ میں یکساں طور پر پھیل جاتی ہے - یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس مٹی کی تہ پر اوپر سے اور زیادہ مٹی آ جاتی ہے - اس طرح یہ تہ موٹی ہوتی رہتی ہے - اس کا بوجھ بڑھنے لگتا ہے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیچے کی تہیں دب کر پتلی ہوتی جاتی ہیں اور ان میں سختی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ پتھر کی

حیثیت اختیار کر لیتی ہیں -

زمین گو دیکھنے میں ٹھوس قسم کی چیز معلوم ہوتی ہے لیکن اس کو اندر اور باہر کہیں بھی قرار نہیں ہے - اس کے اندرونی مادے میں ہلچل سی مچی رہتی ہے - کبھی اس کی سطح دبتی رہتی ہے کبھی اٹھ جاتی ہے - ان سطحی حرکات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی سمندر کی سطح بلند ہو کر خشک زمین بن جاتی ہے اور اس کا پانی بہ کر کسی خشک زمین کو غرق کر کے سمندر بنا دیتا ہے - یہی سبب ہے کہ آج ہم خشک زمین پر ، کبھی سطح کے اوپر اور کبھی سطح کے نیچے پتھروں کی تہ پر جمی ہوئی چٹانیں دیکھتے ہیں -

نامیاتی نظریے والوں کا خیال ہے کہ دریا کی مٹی کے ساتھ بے شمار ننھے ننھے جاندار (حیوانی اور نباتاتی) بھی سمندر میں داخل ہوتے رہتے ہیں اور خود سمندر میں بھی اس قسم کے جانداروں کی بڑی کثرت ہوتی ہے جو مر مر کر اس کی تہ میں بیٹھتے رہتے ہیں- اس طرح یہ ننھے نامیے بہت بڑی مقدار میں سمندر کی تہ میں جمع ہوتے رہتے ہیں - جب اوپر ایک اور تہ آ جاتی ہے تو گویا وہ دفن ہو جاتے ہیں ، اور باہر کی ہوا سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور سمندر کا نمکین پانی ان کو سڑنے گلنے سے بھی بچائے رکھتا ہے - پھر اندرونی حرارت اور زبردست دباؤ کے تحت ان کی آہستہ آہستہ تحلیل شروع ہو جاتی ہے - لاکھوں سال یہ عمل قائم رہتا ہے - اس کا نتیجہ آخرکار پٹرولیم کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے - پٹرولیم اس طرح تیار ہو کر یکساں طور پر مٹی کی تہ میں پھیل جاتا ہے - لیکن جب اور زیادہ دباؤ پڑتا ہے تو مٹی کی تہ دب کر شیل بن جاتی ہے اور اس سے تیل نچڑ کر ایسے حصوں میں جو زیادہ مسام دار ہوں ، مثلاً جہاں ریت ہو ، جمع ہو جاتا ہے - ریت کے ذرات کے درمیان تیل جمع رہنے کی بہت جگہ ہوتی ہے -

نامیاتی نظریے کے ماننے والوں کے تین گروہ ہیں ۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ تیل صرف ننھے ننھے (خوردبینی) کیڑوں کی تحلیل سے پیدا ہوتا ہے ۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ننھے ننھے پودوں کے سبب سے اور تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ اس میں دونوں قسم کے جانداروں کا حصہ ہے ۔

کن جگہوں میں تیل پایا جاتا ہے : اب سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ خطۂ زمین پر کون کون سی ایسی جگہیں ہیں جہاں تیل پایا جا سکتا ہے اور کہاں اس کے موجود ہونے کے امکان نہیں ہیں ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ زمین کے ہر حصے میں پٹرول پائے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے اور اگر کسی حصے میں پٹرول کسی زمانے میں تیار ہوا بھی ہو تو اس کا موجود رہنا کوئی ضروری نہیں ہے ، کیوں کہ جب تک اس کے جمع رہنے اور محفوظ رکھنے کا کوئی سامان نہ ہو تیل کا ضائع ہو جانا یقینی ہے ۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ تیل کے پائے جانے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس جگہ مسام دار چٹانیں موجود ہوں جن میں تیل جمع رہے ۔ دوسری ضروری چیز ایک غیر مسام دار چٹان ہے جو مسام دار تہ کے اوپر ہو اور تیل کو محفوظ رکھ سکے ۔ اکثر تیل کی سطح کے نیچے سے پانی بڑے دباؤ کے تحت اوپر اٹھنا شروع ہوتا ہے اور تیل کو اپنے آگے دھکیلتا جاتا ہے ۔ اگر غیر مسام دار چٹان اس کے اوپر موجود نہ ہو تو تیل اوپر اٹھتے اٹھتے سطح زمین پر آ جائے گا اور ضائع ہو جائے گا ۔ تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ زمین کی اندرونی بناوٹ ایسی ہونی چاہیے کہ تیل دور دور سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جائے ۔ ایسا نہ ہو تو تیل کا حاصل کرنا ناممکن ہو جائے ۔ اگر تیل موجود ہو ، لیکن سینکڑوں میل میں پھیلا رہے ، تو اس کا نکالنا اور حاصل کرنا ناممکن ہو جائے ۔ چوتھی اور سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ایسا ماخذ ہونا چاہیے جس سے تیل نکل

سکے - کیونکہ جب تک کوئی خطہ ایسا نہ ہو جس میں کسی زمانے میں تیل تیار ہوا ہو ، جس سے تیل نکل کر موزوں مقامات پر جمع ہو سکے ، باقی سب چیزوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے - جب تک یہ چاروں چیزیں ایک جگہ نہ پائی جائیں ، تیل پائے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے -

زمین کے بہت سے حصے ایسے ہیں جو بڑی سخت آتش فشانی چٹانوں سے بنے ہوئے ہیں - یہ چٹانیں جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے ، زمین کے اثرات کے سبب سے بنتی ہیں - آتش فشاں دھاتوں سے جو مادہ اندر ہی اندر جم جاتا ہے ، وہ سنگ خارا اور دوسرے سخت پتھروں کی شکل میں نظر آتا ہے - ان کے علاوہ ایسی بھی چٹانیں ہیں جن کی حالت بالکل بدلی ہوئی ہوتی ہے - ابتداء میں جو حالت ہوتی ہے وہ آتش فشانی یا دوسرے اسباب کے سبب بالکل بدل جاتی ہے - ایسے خطوں میں تیل کی تلاش بیکار ہے جہاں تیل پایا نہیں جا سکتا - افسوس اس بات کا ہے کہ سطح زمین کا تقریباً آدھا حصہ اس قسم کی چٹانوں سے بنا ہے - اس لیے جب تیل ڈھونڈنا ہو تو صرف ایسی جگہیں دیکھی جائیں جہاں رسوبی چٹانیں موجود ہوں یا قریب میں ہوں - جہاں آتش فشانی چٹانیں نہ ہوں - ریت پتھر ، چونے کا پتھر ، یا ریت یا اسی قسم کی دوسری ایسی تہ موجود ہو جہاں تیل جمع رہ سکے - پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ زمین کے اندر کوئی حصہ ایسا ہے یا نہیں جہاں تیل تیار ہوا ہو - ارضیات کا ماہر سطح کے اندر سے نکالی ہوئی مٹی اور پتھر کا امتحان کر کے یہ بتا سکتا ہے - اس کے بعد دیکھنا چاہیے کہ زمین کی بناوٹ ایسی ہے یا نہیں کہ اس میں دور دور سے تیل آ کر ایک محدود علاقے میں جمع ہو سکے اور مسام دار تہ کے اوپر ایک غیر مسام دار تہ بھی موجود ہے یا نہیں - یہ سب باتیں موجود ہوں تو تیل کا پایا جانا ضروری ہے -

جب زمین کے کسی حصے میں تیل تیار ہو چکا ہے تو پہلے وہ اس جگہ، جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے، مٹی کی تہ میں پھیلا رہتا ہے۔ اس وقت اس کا حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن جب مٹی کی تہ پر زیادہ دباؤ پڑتا ہے تو یہ دب جاتی ہے اور تیل اس سے باہر نکل کر زیادہ مسام دار اور کم دبنے والے حصوں، مثلاً ریت وغیرہ کی تہ میں چلا جاتا ہے۔ پھر چٹانوں کے دباؤ، پانی کے دباؤ، اندرونی سطح کی تبدیلیوں یا کسی اور سبب سے تیل اپنی جگہ سے حرکت کرنا شروع کرتا ہے اور اس جگہ جمع ہونے لگتا ہے جہاں سے وہ نکل نہیں سکتا۔

ارضیاتی تبدیلیوں اور زمین کی سطحی حرکات کے سبب اس کی تہوں میں شکنیں پڑ جاتی ہیں اور جگہ جگہ تہ بہ تہ اٹھ کر کوہان اور گنبد نما بن جاتی ہے اور یہی حصے آئندہ تیل کے ماخذ بن جاتے ہیں۔ تیل نیچے سے اٹھتا ہوا غیر مسام دار سطح تک پہنچ جاتا ہے، اور پھر اس کے نیچے نیچے چلتا گنبدوں تک پہنچ جاتا ہے۔ نیچے کا پانی اس کو دھکیل کر گنبد کے اندر داخل کر دیتا ہے۔ گنبد کے اندر تیل محفوظ ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ نہ اب نیچے ہی آ سکتا ہے نہ آزو بازو سے نکل سکتا ہے۔ گنبد کا لفظ مثال کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، تاکہ تہوں کا خم سمجھ میں آ جائے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ تیل جن گنبدوں میں مقیّد ہوتا ہے وہ بھی ہماری عمارتوں کے گنبد جیسے چھوٹے ہوتے ہیں۔

جہاں تیل ہوتا ہے وہاں گیس بھی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن یہ لازمی نہیں ہے کہ جہاں گیس ہو وہاں سے تیل بھی نکلے۔ اکثر جگہ زمین میں سوراخ کرنے سے صرف گیس نکلتی ہے۔ وہاں تیل کا نام بھی نہیں ہوتا۔ گنبد کے اندر گیس، تیل اور پانی اپنی اپنی کثافت کے لحاظ سے جمع ہو جاتے ہیں۔ گیس سب سے ہلکی ہوتی ہے اس لیے اوپر رہتی ہے، اس کے نیچے تیل ہوتا ہے اور سب سے

لیچے پانی - پاکستان میں سوئی گیس بلوچستان کے علاقے میں تیل تلاش کرتے ہوئے اسی طرح اتفاقیہ دریافت ہو گئی -

یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جن جگہوں میں تیل جمع رہتا ہے ان کی حیثیت تالاب کی سی نہیں ہوتی کہ جن میں تیل بھرا ہوا موجود ہو - یہ جگہیں دراصل مسام دار چٹانوں یا ریت وغیرہ سے بھری ہوتی ہیں اور انھی میں تیل موجود رہتا ہے -

---

منشی پریم چند

(۱۸۸۵—۱۹۳۶ء)

منشی پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا - یہ ضلع بنارس میں ایک جگہ پانڈے پور میں پیدا ہوئے اور شروع میں رواج کے مطابق فارسی پڑھی - چونکہ شروع ہی سے ذمے داریاں باپ کے بعد انھی کے سر پر آ گئی تھیں اس لیے انٹر کرنے کے بعد ملازمت کر لی - ادبی ذوق ابتداء ہی سے تھا - ملازمت کے دوران میں بی - اے پاس کیا - ۱۹۰۱ء سے باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ہوا - ناول ، افسانے اور ڈرامے شائع کیے - ترک موالات سے متاثر ہو کر ملازمت چھوڑ دی اور باقاعدہ تصنیف کی طرف متوجّہ ہو گئے -

افسانہ نگاروں کی صف میں پریم چند سب سے آگے نظر آتے ہیں - انھوں نے فرضی داستانوں اور حسن و عشق کے خیالی ، بیکار اور فرسودہ قصوں پر اپنا وقت ضائع نہیں کیا ، بلکہ حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا - غربت ، بھوک ، افلاس، بیماری ، سرمایہ داری کے نتائج ، تقسیم دولت اور تقسیم مذہب و ملت جیسے موضوعات سے اپنے شاہکار تیار کیے اور ان کے خلاف ایک مؤثر آواز اٹھائی - پریم چند اُخُوّتِ انسانی اور مساوات کی تبلیغ کرتے ہیں - یہی ان کے ناولوں کا مقصد ہے - اس لیے ان کی سادہ تحریر میں ایک ولولہ اور ایک بیتابی کی کیفیت محسوس ہوتی ہے ، جو رفتہ رفتہ انقلاب لانے کا موجب ہوتے ہیں -

پریم چند کی زاد راہ ، میدان عمل ، غبن، گئودان ، بیوہ، فردوسِ خیال ، آخری تحفہ ، پردۂ مجاز ، بازار حسن اور خاک پروانہ پوری انسانیت کے لیے عظیم تحائف ہیں -

ان کا طرز تحریر بالکل فطری ہوتا ہے - افسانوں اور ناولوں میں جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ کرداروں کی عمر، حیثیت اور ماحول کے عین مطابق ہوتی ہے - خاص کر دیہاتیوں اور ہندو گھرانوں کی زبان پر انھیں زبردست قدرت حاصل ہے - ان کی زبان ایسی ہے جسے بلا تأمل خالص ہندوستانی کہا جا سکتا ہے - یہ بدقسمتی ہے کہ سیاسی حالات سے متأثر ہو کر آخر میں انھوں نے آردو میں لکھنا ترک کر دیا اور صرف ہندی میں لکھتے رہے - لیکن اردو میں جو سرمایہ ہے وہ ان کا درجہ متعین کرنے کے لیے کافی ہے -

---

نادان دوست

(۱)

کیشو کے گھر میں ایک کارنس کے اوپر ایک چڑیا نے انڈے دیے تھے - کیشو اور اس کی بہن شیاما دونوں بڑے غور سے چڑیا کو وہاں آتے جاتے دیکھا کرتے - سویرے دونوں آنکھیں ملتے کارنس کے سامنے پہنچ جاتے اور چڑا اور چڑیا دونوں کو وہاں بیٹھا پاتے - ان کو دیکھنے میں دونوں بچوں کو نہ معلوم کیا مزہ ملتا تھا - دودھ اور جلیبی کی سدھ بھی نہ رہتی تھی - دونوں کے دل میں طرح طرح کے سوال اٹھتے تھے - انڈے کتنے بڑے ہوں گے ؟ کس رنگ کے ہوں گے ؟ کتنے ہوں گے ؟ ان میں سے بچے کس طرح نکل آئیں گے ؟ بچوں کے پر کیسے نکلیں گے ؟ گھونسلا کیسا ہے ؟ لیکن ان باتوں کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا - نہ اماں کو گھر کے کام دھندوں سے فرصت تھی نہ بابو جی

کو پڑھنے لکھنے سے - دونوں بچے آپس ہی میں سوال جواب کر کے اپنے دل کو تسلی دے لیا کرتے تھے -

شیاما کہتی : "کیوں بھیا ! بچے نکل کر پُھر سے آڑ جائیں گے؟"

کیشو عالمانہ غرور سے کہتا : "نہیں ری پگلی ، پہلے پر نکلیں گے - بغیر پروں کے بچارے کیسے آڑیں گے؟"

شیاما : "بچوں کو کیا کھلائے گی بچاری ؟"

کیشو اس پیچیدہ سوال کا جواب کچھ نہ دے سکتا تھا -

اس طرح تین چار دن گزر گئے - انھوں نے قیاس کیا : "اب ضرور بچے نکل آئے ہوں گے -" بچوں کا سوال اب ان کے سامنے آ کھڑا ہوا - چڑیا بچاری اتنا دانہ کہاں پائے کہ سارے بچوں کا پیٹ بھرے - غریب بچے بھوک کے مارے چوں چوں کر کے مر جائیں گے -

اس مصیبت کا اندازہ کر کے دونوں گھبرا اٹھے - دونوں نے فیصلہ کیا کہ کارنس پر تھوڑا سا دانہ رکھ دیا جائے - شیاما خوش ہو کر بولی : "تب تو چڑیوں کو چارے کے لیے کہیں آڑ کر نہ جانا پڑے گا -"

کیشو : "نہیں ، تب کیوں جائیں گی ؟"

شیاما : "کیوں بھیا ، بچوں کو دھوپ نہ لگتی ہوگی ؟"

کیشو کا دھیان اس تکلیف کی طرف نہ گیا تھا - بولا "ضرور تکلیف ہو رہی ہوگی -" آخر یہی فیصلہ ہوا کہ گھونسلے کے اوپر کپڑے کی چھت بنا دینی چاہیے - پانی کی پیالی اور تھوڑے سے چاول رکھ دینے کی بھی تجویز منظور ہو گئی -

دونوں بچے بڑے شوق سے کام کرنے لگے - شیاما ماتا کی

آنکھ بچا کر مٹکے سے چاول نکال لائی ۔ کیشو نے پتھر کی پیالی کا تیل چپکے سے زمین پر گرا دیا اور اسے خوب صاف کرکے اس میں پانی بھرا ۔

اب چاندنی کے لیے کپڑا کہاں سے لائے ۔ پھر اوپر بغیر چھڑیوں کے کپڑا ٹھہرے گا کیسے اور چھڑیاں کھڑی ہوں گی کیسے؟

کیشو بڑی دیر تک اسی ادھیڑ بن میں رہا ۔ آخرکار یہ مشکل بھی حل کر لی اور شیاما سے بولا : ”جا کر کوڑا پھینکنے والی ٹوکری اٹھا لاؤ ۔ اماں جی کو مت دکھانا ۔“

شیاما : ”وہ تو بیچ سے پھٹی ہوئی ہے ۔ اس میں سے دھوپ نہ جائے گی ؟“

کیشو نے جھنجلا کر کہا : ”تو ٹوکری لا ۔ میں اس کا سوراخ بند کرنے کی کوئی حکمت نکالوں گا ۔“

شیاما دوڑ کر ٹوکری اٹھا لائی ۔ کیشو نے اس کے سوراخ میں تھوڑا سا کاغذ ٹھونس دیا اور تب ٹوکری ایک ٹہنی سے لٹکا کر بولا :

”دیکھو ! ایسے ہی گھونسلے پر اس کی آڑ کر دوں گا ۔ تب کیسے دھوپ جائے گی ؟

شیاما نے دل میں سوچا کہ ”بھیا کتنے چالاک ہیں !“

(۲)

گرمی کے دن تھے ، بابو جی دفتر گئے ہوئے تھے ۔ ماتا دونوں بچوں کو کمرے میں سلا کر خود سو گئی تھی ۔ لیکن بچوں کی آنکھوں میں آج نیند کہاں ! اماں جی کو بہلانے کے لیے دونوں

دم روکے آنکھیں بند کیے موقع کا انتظار کر رہے تھے - جونہی معلوم ہوا کہ اماں جی اچھی طرح سو گئیں ، دونوں چپکے سے اٹھے اور بہت آہستہ سے دروازے کی چٹکنی کھول کر باہر نکل آئے - انڈوں کی حفاظت کی تیاریاں ہونے لگیں -

کیشو کمرے سے ایک سٹول اٹھا لایا - لیکن جب اس سے کام نہ چلا تو نہلانے کی چوکی لا کر سٹول کے نیچے رکھی اور ڈرتے ڈرتے سٹول پر چڑھا - کیشو نے جونہی کارنس پر ہاتھ رکھا دونوں چڑیاں اڑ گئیں - کیشو نے دیکھا کہ کارنس پر تھوڑے تنکے بچھے ہوئے ہیں اور ان پر تین انڈے پڑے ہوئے ہیں - جیسے گھونسلے درختوں پر دیکھے تھے ، ایسا گھونسلا نہیں ہے -

شیاما نے نیچے سے پوچھا : "کَے بچے ہیں بھیا !"
کیشو : "تین انڈے ہیں - ابھی بچے نہیں نکلے -"
شیاما : ذرا ہمیں دکھا دو بھیا کتنے بڑے ہیں -"

کیشو : "دکھا دوں گا - پہلے ذرا چیتھڑے لے آ - نیچے بچھادوں - بچارے انڈے تنکوں پر پڑے ہیں -"

شیاما دوڑ کر اپنی پرانی دھوتی پھاڑ ایک ٹکڑا لائی - کیشو نے جھک کر کپڑا لے لیا - اس کے کئی تہ کرکے اس نے ایک گدی بنائی اور اسے تنکوں پر بچھا کر تینوں انڈے اس پر آہستہ سے رکھ دیے -

شیاما نے پھر کہا : "ہم کو بھی دکھا دو بھیا !"

کیشو : "دکھا دوں گا - پہلے ٹوکری تو دے دو ، اوپر سایہ کردوں -"

شیاما نے ٹوکری نیچے سے تھما دی اور بولی : "اب تم اتر آؤ میں بھی تو دیکھوں -"

کیشو نے ٹوکری کو ایک ٹہنی سے لٹکا کر کہا: "جا! دالان اور پانی کی پیالی لے آ۔ میں اتر آؤں تو تجھے دکھا دوں۔"

شیاما پیالی اور چاول لے آئی۔

کیشو نے دونوں چیزیں ٹوکری کے نیچے رکھ دیں اور آہستہ سے اتر آیا۔

شیاما نے گڑ گڑا کر کہا: "اب ہم کو بھی چڑھا دو بھیا۔"

کیشو: "تو گر پڑے گی۔"

شیاما: "نہ گروں گی بھیا۔ تم نیچے سے پکڑے رہنا۔"

کیشو: "نہ بھیا۔ کہیں تو گر گرا پڑے تو اماں جی میری چٹنی کر ڈالیں۔"

شیاما نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "تم نے مجھے نہیں دکھایا۔ میں اماں جی سے کہہ دوں گی۔"

کیشو: "اماں جی سے کہے گی تو بہت ماروں گا۔ کہے دیتا ہوں۔"

شیاما: "تو تم نے مجھے دکھایا کیوں نہیں۔"

کیشو: "اور اگر گر پڑتی تو چار سر نہ ہو جاتے۔"

شیاما: "ہو جاتے تو ہو جاتے۔ دیکھ لینا میں کہہ دوں گی۔"

اتنے میں کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ماتا نے دھوپ سے آنکھیں بچاتے ہوئے کہا: "تم دونوں باہر کب نکل آئے؟ میں نے کہا تھا کہ دوپہر کو نہ نکلنا۔ کس نے کواڑ کھولا۔"

کواڑ کیشو نے کھولا تھا۔ لیکن شیاما نے یہ بات ماتا سے نہیں کہی۔ اسے خوف ہوا کہ بھیا پٹ جائیں گے۔ کیشو دل میں

کانپ رہا تھا کہ کہیں شیاما کہ نہ دے۔ انڈے نہ دکھائے تھے۔ اس سے اب اس پر اعتبار نہ تھا۔ شیاما صرف محبت کے مارے چپ تھی یا اس قصور میں حصے دار ہونے کی وجہ سے، اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ شاید دونوں ہی باتیں تھیں۔

ماتا نے دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر کمرے میں بند کر دیا اور آہستہ آہستہ انہیں پنکھا جھلنے لگی۔ ابھی صرف دو بجے تھے۔ باہر تیز لو چل رہی تھی۔ اب دونوں بچوں کو نیند آ گئی تھی۔

(۳)

چار بجے یکایک شیاما کی آنکھ کھلی۔ کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ وہ دوڑی ہوئی کارنس کے پاس آئی اور اوپر کی طرف تاکنے لگی۔ ٹوکری کا پتہ نہ تھا۔ اتفاقاً اس کی نگاہ نیچے گئی اور وہ الٹے پاؤں دوڑتی ہوئی کمرے میں جا کر زور سے بولی:

"بھیا! انڈے تو نیچے پڑے ہیں۔ بچے تو اڑ گئے!"

کیشو گھبرا کر اٹھا اور دوڑا ہوا باہر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ تینوں انڈے نیچے ٹوٹے پڑے ہیں اور ان سے کوئی چونے کی سی چیز باہر نکل آئی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ سہمی ہوئی آنکھوں سے زمین کی طرف دیکھنے لگا۔

شیاما نے پوچھا: "بچے کہاں اڑ گئے؟"

کیشو نے افسوسناک لہجہ میں کہا: "انڈے تو پھوٹ گئے۔"

"اور بچے کہاں گئے!"

کیشو: "تیرے سر میں۔ دیکھتی نہیں، انڈوں میں سے اجلا اجلا پانی نکل آیا ہے۔ وہی تو دو چار دن میں بچے بن جاتے!"

ماتا نے سوئی ہاتھ میں لیے ہوئے پوچھا : ”تم دونوں وہاں دھوپ میں کیا کر رہے ہو ؟

شیاما نے کہا : ”اماں جی، چڑیا کے انڈے ٹوٹے پڑے ہیں۔“

ماتا نے ٹوٹے ہوئے انڈوں کو دیکھا اور غصہ سے بولی : ”تم لوگوں نے انڈوں کو چھوا ہوگا۔“

اب تو شیاما کو بھیا پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ اسی نے شاید انڈوں کو اس طرح رکھ دیا کہ وہ نیچے گر پڑے۔ اس کی اسے سزا ملنی چاہیے۔ بولی :

”انھوں نے انڈوں کو چھیڑا تھا ، اماں جی“

ماتا نے کیشو سے پوچھا : ”کیوں رے ؟“ کیشو بھیگی بلی بنا کھڑا رہا۔

ماتا : ”تو وہاں پہنچا کیسے ؟“

شیاما : ”چوکی پر سٹول رکھ کر چڑھے تھے ، اماں جی۔“

کیشو : ”تو سٹول تھامے نہیں کھڑی تھی۔“

شیاما : ”تم نے ہی تو کہا تھا۔“

ماتا : ”تو اتنا بڑا ہوا ہے تجھے ابھی اتنا بھی نہیں معلوم کہ چھونے سے چڑیوں کے انڈے گندے ہو جاتے ہیں۔ چڑیا پھر انھیں نہیں سیتی۔“

شیاما نے ڈرتے ڈرتے پوچھا : ”تو کیا چڑیا نے انڈے گرا دیے ہیں ، اماں جی ؟“

ماتا : ”اور کیا کرتی۔ کیشو کے سر اس کا پاپ پڑے گا۔ ہا ! ہا ! تین جانیں لے لیں ڈشٹ نے۔“

کیشو رونی صورت بنا کر بولا : "میں نے تو صرف انڈوں کو
گدی پر رکھ دیا تھا ، اماں جی !"

ماتا کو ہنسی آ گئی ۔

مگر کیشو کو کئی دنوں تک اپنی غلطی پر افسوس ہوتا
رہا ۔ انڈوں کی حفاظت کرنے کے زعم میں اس نے ان کا ستیاناس کر
ڈالا ۔ اسے یاد کرکے وہ کبھی کبھی رو پڑتا تھا ۔

دونوں چڑیاں وہاں پھر نہ دکھائی دیں ۔

سجاد حیدر یلدرم

(۱۸۸۰ء تا ۱۹۴۳ء)

یلدرم قصبہ نہٹور ضلع بجنور میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ شروع ہی سے بڑے ذہین تھے۔ علی گڑھ کالج کے مشہور طالب علم رہے ہیں۔ ادبی ذوق ان میں بچپن ہی سے تھا۔ بی۔ اے کے بعد حکومت کے ایما پر بغداد گئے۔ وہاں ترکی زبان میں اچھی خاصی مہارت پیدا کی۔ وہاں سے آ کر ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ پھر راجا صاحب محمود آباد کے پرائیویٹ سیکریٹری رہے۔ کچھ مدت بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر ہو گئے۔ بعدِپنشن راجا صاحب محمود آباد کے دوبارہ سیکریٹری ہو گئے اور آخر تک وہیں رہے۔

سجاد حیدر جدید دور میں بڑا نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔ دراصل ان کی تحریروں کی کشش اس لیےاور بڑھ گئی ہے کہ ان میں ترکی، فارسی اور انگریزی کی وسعتیں شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ایوان کو ایک طرف فارسی کی گھلاوٹ، دوسری طرف ترکی کے زور بیان اور تیسری طرف انگریزی کی وسعت سے سجایا ہے۔

سجاد حیدر نے افسانے بھی لکھے ہیں ڈراموں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ طبع زاد مضامین بھی لکھے ہیں۔ مگر ہر جگہ جدت، جذبات کی مصوری، خیال آفرینی، شگفتگی اور لطافت بیان کو قائم رکھا ہے۔

سجاد حیدر کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ اصل تصنیف معلوم ہوتا ہے ۔ ثالث بالخیر ، خوارزم شاہ ، حکایات و احتساسات اور خیالستان آپ کی بہترین تصنیفات و تالیفات ہیں ۔

سجاد حیدر کی انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے اور اردو لکھنے والوں میں مہدی افادی اور سجاد انصاری کے علاوہ شاید ہی کسی کی تحریر میں اتنی رعنائی ہو ۔

سَیلِ زمانہ

بہے جا ، بہائے لیے جا ۔ نہ تجھ میں سلامتی نہ تیرے کنارے سلامتی ۔ مٹے ہوؤں کے نشان مٹائے جا ، تیرا کوں کو ڈبا ، غوّاصوں کو نہ ابھار ، یہی تیرا کام ہے ۔

تجھ میں جو خوش نما ہرے جزیرے نظر آتے ہیں ، جو پھولوں اور پھلوں سے مالا مال ہیں ، جن میں خوبصورت پرند چہچہا رہے ہیں ، کیا یہی لذائذ حیات ہیں ؟ وہ حسین سحرکار عورتیں جو ہاتھ میں ستار لیے دلربا گانے گا رہی ہیں اور جادو بھری نظریں ڈال ڈال کر مجھے اپنی طرف بلا رہی ہیں ، کیا یہی جوانی کی اُمنگیں ہیں ؟ آہ ! مجھے اس جزیرے کو دیکھنے دے ، ان دیویوں سے ، ان پریوں سے تو ملنے دے ، ان کے گانے سے اپنے دل کو راحت تو پہنچانے دے ، مگر تو کس کی سنتا ہے ۔ تو نے کسی اور تنکے کی سُنی ہے جو میری سنے گا ۔ اچھا اے ، تجھے بھی قسم ہے ، بہائے لیے جا ، بھگائے لیے جا ، ذرا نہ ٹھہر ۔ مگر یہ تو بتا دے ، تو مجھے کہاں سے لا رہا ہے ، کب سے لا رہا ہے ، کیوں لا رہا ہے ، کب تک بہائے گا ؟

یہ کیا ؟ کیا اور تیزی سے بہنا ، بھنور میں پڑنا ، طوفان کا اٹھنا ، موجوں کا مجھے تھپیڑے مارنا ، میرے سوالوں کا جواب ہے؟ تجھے میرے سوالوں سے غصہ آ گیا ؟ میں نے بے ادبی کی ؟ اچھا ، اچھا ، جواب نہ دے ، بہے جا ، بہائے جا ۔

میری روح مُتَجَسِّس دزدیدہ نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتی ہے ۔ نینوا ، بابل ، قدیم ہند ، قدیم مصر کے ٹکڑے تجھ میں نظر آتے ہیں ۔ واعظ کہتا ہے ، "باطل ، باطل سب باطل ہے ۔"

سکندر ، ہنیبال ، نوشیرواں ، دارا ، تیری موجوں سے کبھی کبھی ان کی آوازوں سے ملتی جلتی آوازیں آتی ہیں ۔ کیا شہرتِ رفتگاں یہی ہے ؟ فلاسفر کہتا ہے ، "دھوکا ، دھوکا ، سب دھوکا ہے ، شہرت دھوکا ہے ، خود زندگی دھوکا ہے !"

لیکن نہیں ، میں نہ حال سابقہ کو باطل ، نہ شہرتِ رفتگاں کو دھوکا سمجھتا ہوں ۔ اُن کی شہرت ہمت بڑھاتی ہے ۔ لیکن یہ خیال کر کے کہ کیا ہوں میں اور کیا ہے میری ہمت پست و بود ، دل بیٹھ جاتا ہے ۔

اس لیے بہتر یہی ہے کہ لاتعداد خس و خاشاک کی طرح جو مجھ سے پہلے آئے اور بعد میں آئیں گے ، بہے جاؤں ۔

پس اے سیل زمانہ ۔ بہے جا ، بہائے لیے جا ، اور اس بحرِ ناپیدا کنار میں اس عُمّانِ عظیم‌الشان میں ، اس اوقیانوس میں اور اب یا جب تیرا دل چاہے ، گرا دے ۔

احمد شاہ بخاری پطرس

(۱۸۹۸ء - ۱۹۵۸ء)

پطرس کا اصلی نام سید احمد شاہ بخاری ہے - ان کی پیدائش یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو پشاور میں ہوئی - انھوں نے لاہور گورنمنٹ کالج سے انگریزی ادب میں ایم - اے کیا، اور پوری یونیورسٹی میں اول آئے - پھر کیمبرج یونیورسٹی سے علمی اعزاز کے ساتھ آنرز کیا - وہاں سے واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور ہی میں ادبیات انگریزی کے استاد ہو گئے - پھر محکمۂ تعلیمات کو چھوڑ کر ریڈیو میں ملازم ہو گئے اور اتنی ترقی کی کہ تقسیم سے پہلے ہی آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر جنرل مقرر ہوئے - پاکستان بننے کے بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہوئے اور پھر وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے مقرر کیے گئے - اس کے بعد اقوام متحدہ کے اسسٹنٹ سیکریٹری جنرل ہوئے اور وہیں پر انتقال ہوا -

پطرس بہت کم نویس ہیں - ان کی ادبی شہرت صرف گنتی کے چند مضامین پر ہے - لیکن یہ چند مضامین بھی اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک نئے باب کا درجہ رکھتے ہیں - وہ زندگی کے نہایت معمولی اور روزمرہ کے واقعات میں مزاح کا بہت انوکھا پہلو نکال لیتے ہیں - زبان ان کے مزاح میں شہ رگ کا درجہ رکھتی ہے ان کا مزاح ایک ذہنی کیفیت ہے - "مرحوم کی یاد میں"، "لاہور کا جغرافیہ"، "مرید پور کا پیر" اور "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" ایسے مضامین ہیں جو اردو کے مزاحیہ ادب میں مستقل اضافہ ہیں -

---

میبل اور میں

میبل لڑکیوں کے کالج میں تھی - لیکن ہم دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے - اس لیے اکثر لیکچروں میں ملاقات ہو جاتی تھی - اس کے علاوہ ہم دوست بھی تھے - کئی دلچسپیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے - تصویروں اور موسیقی کا شوق اسے بھی تھا - میں بھی ہمہ‌دانی کا دعویدار - اکثر گیلریوں یا کانسرٹوں میں اکٹھے جایا کرتے تھے - دونوں انگریزی ادب کے طالب علم تھے - کتابوں کے متعلق باہم بحث مباحثے رہتے- ہم میں سے اگر ایک کوئی نئی کتاب یا نیا مصنف "دریافت" کرتا تو دوسرے کو ضرور اس سے آگاہ کر دیتا اور پھر دونوں مل کر اس پر اچھے برے کا حکم صادر کرتے -

لیکن اس تمام یک جہتی اور ہم آہنگی میں ایک خلش ضرور تھی - ہم دونوں نے بیسویں صدی میں پرورش پائی تھی - عورت اور مرد کی مساوات کے قائل تو ضرور تھے ، تاہم ان خیالات میں اور بعض اوقات اپنے رویے میں کبھی نہ کبھی اس کی تکذیب ضرور کر دیتے تھے - بعض حالات کے ماتحت میبل ایسی رعایت کو اپنا حق سمجھتی جو صرف صنف ضعیف ہی کے ایک فرد کو ملنی چاہیے اور بعض اوقات میں تحکم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کر لیتا - جس کا مطلب یہ تھا کہ گویا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میرا فرض یہی ہے - خصوصاً مجھے یہ احساس بہت زیادہ تکلیف دیتا تھا کہ میبل کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع ہے - اس سے میرے مردانہ وقار کو صدمہ پہنچتا تھا - کبھی کبھی میرے جسم کے اندر میرے ایشیائی آباء و اجداد کا خون جوش مارتا ، اور دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف‌المخلوقات ہے - اس طرف میبل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغے کے ساتھ کرتی تھی ، یہاں

تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کو کائنات کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے -

لیکن اس بات کو میں کیوں کر نظر انداز کرتا کہ میبل ایک دن دس بارہ کتابیں خریدتی اور ہفتے بھر کے بعد انھیں میرے کمرے میں پھینک کر چلی جاتی اور ساتھ ہی کہہ جاتی کہ میں انھیں پڑھ چکی ہوں ، تم بھی پڑھ چکو گے تو ان کے متعلق باتیں کریں گے -

اول تو میرے لیے ایک ہفتہ میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا - لیکن فرض کیجیے مردوں کی لاج رکھنے کے لیے راتوں کی نیند حرام کر کے ان سب کا پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا ، تو بھی ان میں دو یا تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضرور ایسی ہوتیں کہ ان کے سمجھنے کے لیے مجھے کافی عرصہ درکار ہوتا - چنانچہ ہفتے بھر کی جانفشانی کے بعد مجھے ایک عورت کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں - جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہتی میں کچھ کھسیانا سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا، اور وہ نہایت عالمانہ انداز میں بھویں اوپر کو چڑھا چڑھا کر باتیں کرتی - جب میں اس کے لیے دروازہ کھولتا ، اس کے سگریٹ کے لیے دیا سلائی جلاتا یا اپنی سب سے زیادہ آرام دہ کرسی اس کے لیے خالی کر دیتا تو وہ میری خدمات کو حق نسوانیت نہیں بلکہ حق استادی سمجھ کر قبول کرتی -

میبل کے چلے جانے کے بعد ندامت بتدریج غصے میں تبدیل ہو جاتی - جان یا مال کا ایثار سہل ہے لیکن ان کی خاطر نیک سے نیک انسان بھی ایک نہ ایک دفعہ تو ضرور ناجائز ذرایع کے استعمال پر اتر آتا ہے - اسے میری اخلاق پستی سمجھیے ، لیکن یہی حالت میری بھی ہو گئی - اگلی دفعہ جب میبل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نے نہیں پڑھی تھیں ، ان پر بھی میں نے رائے زنی شروع

کر دی ۔ لیکن جو کچھ کہتا تھا سنبھل سنبھل کر کہتا تھا، تفصیلات کے متعلق کوئی بات منہ سے نہ نکالتا تھا، سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدت کا رنگ دیتا تھا ۔

کسی ناول کے متعلق میبل نے مجھ سے پوچھا تو جواب میں نہایت لاابالیانہ کہا :

"ہاں اچھی ہے ۔ لیکن کچھ ایسی اچھی بھی نہیں ۔ مصنّف سے دور جدید کا نقطۂ نظر کچھ نبھ نہ سکا ۔ لیکن پھر بھی بعض نکتے نرالے ہیں ۔ بری نہیں ۔ "

کنکھیوں سے میبل کی طرف دیکھتا گیا ۔ لیکن اسے میری ریاکاری بالکل معلوم نہ ہونے پائی ۔ ڈرامے کے متعلق کہا کرتا تھا :

"ہاں پڑھا تو ہے، لیکن ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جو کچھ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے وہ سٹیج پر جا کر بھی باقی رہے گا یا نہیں ۔ تمھارا کیا خیال ہے ؟"

اور اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی، اور گفتگو کا بار بھی میبل کے کندھوں پر ڈال دیتا ۔

تنقید کی کتابوں کے بارے میں فرماتا :

"اس نقاد پر اٹھارھویں صدی کے نقادوں کا کچھ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن یونہی نامعلوم سا کہیں کہیں، بالکل ہلکا سا اور شاعری کے متعلق اس کا رویہ دلچسپ ہے، بہت دلچسپ، بہت دلچسپ" ۔ رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال حاصل ہو گیا ۔ جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا، اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا ۔ اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب ہوتی ۔

اب میبل سے نہ دبتا تھا ۔ اسے بھی میرے علم و فضل کا معترف ہونا پڑا ۔ وہ اگر ہفتے میں دس کتابیں پڑھتی تھی تو میں دو دن کے بعد ان سب کتابوں پر رائے زنی کر سکتا تھا ۔ اب اس کے سامنے ندامت کا کوئی موقع نہ تھا ۔ میری مردانہ روح میں اس احساسِ فتح مندی سے بالیدگی سی آ گئی تھی ۔ اب میں اس کے لیے کرسی رکھتا یا دیا سلائی جلاتا تو عظمت و برتری کے احساس کے ساتھ جیسے ایک تجربہ کار تنومند نوجوان ایک نادان کمزور بچی کی حفاظت کر رہا ہو ۔

صراط مستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو سراہیں نہ سراہیں ، لیکن میں کم از کم مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں ۔ خواتین میری اس حرکت کے لیے مجھ سے دہری دہری لعنتیں بھیجیں گی کہ ایک تو میں نے مکاری اور جھوٹ سے کام لیا اور دوسرے ایک عورت کو دھوکا دیا ۔ ان کی تسلی کے لیے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین مانیے کہ کئی دفعہ تنہائی میں مَیں نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا ۔ بعض اوقات اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ۔ ساتھ ہی اس بات کا بھلانا بھی مشکل ہو گیا کہ بغیر پڑھے ہی کے علمیت جتاتا رہتا ہوں ۔ میبل تو سب کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گفتگو کرتی ہے ، تو بہر حال اس کو مجھ پر تفوّق تو ضرور حاصل ہے ۔ میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے دیتا ۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے نا کہ میں کتابیں نہیں پڑھتا ۔ میری جہالت ، اس کے خیال سے اطمینان قلب پھر مفقود ہو جاتا اور اپنے آپ ایک عورت کے مقابلے میں ، میں حقیر نظر آنے لگتا ۔ پہلے میبل کو صرف ذی علم سمجھتا تھا ، اب وہ اپنے مقابلے میں پاکیزگی اور راستبازی کی دیوی بھی معلوم ہونے لگی ۔

علالت کے دوران میں میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے ۔ بخار

کی حالت میں کوئی بازاری سا ناول پڑھتے وقت بھی بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ صحت یاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے۔ لیکن اس وقت اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ میری بد قسمتی کہ انھی دنوں مجھے خفیف سا انفلوئنزا ہوا۔ مہلک نہ تھا۔ بہت تکلیف دہ بھی نہ تھا۔ تاہم گذشتہ زندگی کے تمام چھوٹے چھوٹے گناہ، گناہ کبیرہ بن کر نظر آنے لگے۔ میبل کا خیال آیا، ضمیر نے سخت ملامت کی اور میں بہت دیر تک بستر پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ شام کے وقت میبل کچھ پھول لے کر آئی۔ خیریت پوچھی، دوا پلائی، ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے کہا (میری آواز بھرائی ہوئی تھی): میبل مجھے خدا کے لیے معاف کر دو۔ اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے میں نے مکاری کی ہر ایک تفصیل بیان کر دی۔ ہر اس کتاب کا نام لیا جس پر میں نے بغیر پڑھے لمبی لمبی فاضلانہ تقریریں کی تھیں۔ میں نے کہا: ''میبل، پچھلے ہفتہ جو تین کتابیں تم مجھے دے گئی تھیں ان کے متعلق میں تم سے کتنی بحث کرتا رہا ہوں، لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔ میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہوگی جس سے میرا پول تم پر کھل گیا ہوگا۔''

کہنے لگی ''نہیں تو۔''

میں نے کہا: ''مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ کیرکٹروں کے متعلق میں جو کچھ بک رہا تھا وہ سب من گھڑت تھا۔''

کہنے لگی ''کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔''

میں نے کہا ''پلاٹ کے متعلق میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ذرا ڈھیلا ہے۔ یہ بھی ٹھیک تھا۔''

کہنے لگی "ہاں ! پلاٹ کہیں کہیں ڈھیلا ضرور ہے۔"

اس کے بعد میری گزشتہ ، فریب کاری پر وہ اور میں دونوں ہنستے رہے۔ میبل رخصت ہونے لگی تو بولی "وہ کتابیں میں لیتی جاؤں۔"

میں نے کہا ، "ایک تائب انسان کو اپنی اصلاح کا موقع تو دو۔ میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا۔ لیکن اب انھیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انھیں یہیں رہنے دو۔ تم تو انھیں پڑھ چکی ہو۔"

کہنے لگی ، "ہاں میں تو پڑھ چکی ہوں۔ اچھا میں یہیں چھوڑ جاتی ہوں۔"

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی دفعہ کھولا۔ تینوں میں سے کسی ایک کے ورق تک نہ کٹے تھے۔ میبل نے بھی انھیں ابھی تک نہ پڑھا تھا۔

مجھے مرد اور عورت دونوں کی برابری میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

(۱۸۸۴—۱۹۴۷ء)

مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا بدخشاں سے آئے تھے۔ دربار میں ان کی بڑی عزت و تکریم تھی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے سینٹ سٹیفنز کالج سے بی۔اے کیا۔ اس کے بعد ریاست حیدر آباد چلے گئے اور چند دن بعد اسسٹنٹ سیکرٹری ہوگئے۔ حیدرآباد کی ادبی سرگرمیاں زوروں پر تھیں، جنھوں نے مرزا کے ادبی ذوق کو ابھارا اور بڑی استقامت بخشی۔ ان کی مزاح نگاری بہت پسند کی گئی۔ تحقیقی مقدمہ نگاری میں بھی مرزا صاحب اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مگر ان کی زیادہ شہرت مزاحیہ تحریروں ہی کی وجہ سے ہوئی۔

ان کے مضامین میں نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی، آخری وصیت، پھول والوں کی سیر، دادا جان کا پارلیامنٹ میں جانا، دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ، نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

مرزا صاحب سادہ طرز بیان کے دلدادہ ہیں۔ ہر جگہ ظرافت ایک معقول سنجیدگی میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ دہلی کی ٹکسالی زبان، الفاظ کا انتخاب، پُرکشش اندازِ بیان اور ان سب پر ظرافت کا رنگ پڑھنے والے کی توجّہ کو جذب کر لیتا ہے۔

کل کا گھوڑا

مُوجِد دنیا میں سینکڑوں ہیں اور ہوتے چلے آئے ہیں ، مگر توبہ توبہ ، خدا کسی کو میرے دوست مسٹر مور جیسا موجد نہ کرے ۔ بندۂ خدا کو دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا تھا ، جب دیکھو اپنے دارالتجربہ میں بیٹھے ہیں ۔ جب جاؤ اس کو توڑ ، اس کو جوڑ رہے ہیں ۔ بیٹھے بیٹھے اونگھ آ جاتی توی مگر وہ اللہ کا بندہ یہ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ میاں خیریت سے ہو اور دنیا میں کیا ہو رہا ہے ۔ جنگ عظیم میں ان کی بیسیوں ایجادیں کام میں لائی گئیں ۔ لیکن ان کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ جنگ کب چھڑی ، کیوں چھڑی ، کون جیتا ، کون ہارا ؟ ایک دن میں نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ اس لڑائی میں بلجیم نے اپنی بساط سے بہت زیادہ ہمت دکھائی ۔ پوچھنے لگے کہ یہ مسٹر بلجیم کون صاحب ہیں اور کہاں رہتے ہیں ؟ بھلا ایسوں کی صحبت میں کسی کا کیا دل بہل سکتا ہے ؟

میں تو ٹھہرا بیوپاری کہ پیسوں کے لیے مردے کا کفن اتروا لوں اور مسٹر مور ٹھہرے ایسے بے پروا کہ اپنی کسی ایجاد کی رجسٹری تک نہ کروائی ۔ میں نے کئی دفعہ کہا بھی اور ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ ہر ایجاد عامۂ خلائق کے فائدے کے لیے ہے ، کسی خاص شخص کا حق نہیں ہے اور نہ ٹکے پیدا کرنے کے لیے ہے ۔ ایک دوربین ایجاد کی تھی ۔ گھر کے باہر سے گھر کے اندر کا حال دکھاتی تھی ۔ لیکن میرے یار نے اس کی بھی رجسٹری نہ کرائی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کارخانہ نے اپنے نام سے اس کی رجسٹری کراکے لاکھوں روپے کھرے کر لیے ۔ جب میں نے مور سے اس کا ذکر کیا تو وہ یہ بھی نہ سمجھے کہ اس کارخانہ پر ہرجے کا دعوٰی ہو سکتا ہے ۔ بہر حال مور کی ایجادات دریا کی لہریں تھیں کہ

یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی تھیں ، بغیر ان کو فائدہ پہنچائے ، ان کی حد تک فنا ہو جاتی تھیں - گو دوسرے ان سے پوری طرح متمتّع ہوتے تھے - اگر باپ دادا نے جائداد نہ چھوڑی ہوتی تو میرے یار کبھی کے محتاج خانے پہنچا دیے گئے ہوتے - ان کی ذات سے سبھی کو فائدہ پہنچتا تھا ، نہ پہنچتا تھا تو مجھ کو - کیونکہ مجھے خبر تک نہ ہوتی کہ ان کی کوئی تازہ ایجاد کب نصیب دشمناں ہو گئی- مور سے اس کی توقع رکھنا فضول تھی کہ وہ اس کا ذکر مجھ سے کرتے - اگر حال کھلتا تو اخباروں سے اور "اب پچھتائے کیا ہوت ، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت" کی مثل ہمیشہ مجھ پر صادق آتی تھی اور اگر میری مالی حالت اچھی ہوتی تو میں پروا بھی نہ کرتا - لیکن کاروبار کے مندے اور اکثر بیوپاریوں کی نادہندی نے مجھ کو کھک کر دیا تھا - ایسی صورت میں آپ ہی انصاف کیجیے کہ ایسے سچے مگر حاجت مند دوست کے ساتھ مور کی یہ بے اعتنائی قابل شکایت ہے یا نہیں - ایک دن میں پریشانی کی حالت میں دفتر سے سیدھا مور کے یہاں پہنچا - معلوم ہوا کہ وہ اپنے دارالتجربہ میں کام کر رہے ہیں - وہیں چلا گیا - اس روز ان کی طبیعت کچھ بشاش سی معلوم ہوتی تھی - میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر پوچھنے لگے : "یہ کیا کتاب ہے ؟" میں نے کہا "دہلی کے ایک شاعر میر حسن نے ایک مثنوی اردو میں لکھی تھی ، اس کا انگریزی ترجمہ ہے" - پوچھا "مضمون کیا ہے ؟" "یونہی واہی تباہی بکا ہے - ایک کل کا گھوڑا بنایا ہے ، اس پر سوار ہو کر شہزادہ آسمان پر ہوا خوری کو جایا کرتا تھا - غرض اس طرح کی بے تکی باتیں ہیں -" مجھ سے اتنا سنتے ہی مور کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی - آنکھیں چمکنے لگیں اور کہنے لگے : "ذرا مجھ کو کل کے گھوڑے کا قصہ سناؤ -" میں نے کتاب میں سے وہ داستان نکالی اور پڑھنا شروع کیا - لیکن پڑھنے کے ساتھ خلاف فطرت باتوں کے متعلق شاعر

کا مذاق بھی اڑاتا گیا ۔ میں پڑھ ہی رہا تھا کہ مور نے نہایت غصیلی آواز سے کہا : "او بے ادب خاموش ! تجھ جیسا جاہل اس عالی قدر شاعر کو سمجھ سکتا ہے ! معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر ہی نہ تھا بلکہ بجلی کی قوت اور کل پرزوں کی ترکیب کا بھی پورا ماہر تھا ۔ تم جیسوں کے لیے اس کی باتیں مضحکہ خیز ہوں تو ہوں ، لیکن سمجھنے والے کے لیے اس کا نکتہ چراغ ہدایت ہے ۔" یہ سن کر میں دم بخود ہو گیا ۔ کیونکہ ڈر تھا کہ یہ حضرت کہیں بجلی کے ایک جھٹکے میں میرے جسم کے ذرات بنا کر ہوا میں نہ اڑا دیں ۔ اس لیے مسکرا کر کہا کہ اگر "تم کو یہ کتاب پسند ہے تو میں چھوڑ جاتا ہوں ۔ میرے کسی کام کی نہیں ۔ اس سے کیا بہتر ہے کہ میرے کسی دوست کے کام آ جائے ۔" مور نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی ۔ میرا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا "یار عزیز ! اس کتاب نے اس وقت دماغ میں ایک خیال پیدا کر دیا ہے ۔ اس کو عملی صورت دینا چاہتا ہوں ۔ بس اب آپ اپنے گھر سدھاریں تو بہتر ہے ۔ اچھا خدا حافظ !" اس کی یہ اکھڑی باتیں سن کر بڑی کوفت ہوئی اور میں دل میں اس کو صلواتیں سناتا اپنے گھر چلا آیا ۔

چند روز تک میرا مور کے پاس جانا نہ ہو سکا ۔ ایک دن جو ادھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مور کے دارالتجربہ میں ایک نہایت خوبصورت مشکی گھوڑا ہنہنا رہا ہے ۔ مجھے مور کے پاس گھوڑا دیکھ کر بڑا تعجب ہوا ، کیونکہ بھلا ایسے شخص کو ایسی چیزوں سے کیا واسطہ ۔ میں خود گھوڑوں کا شوقین ہوں ۔ کوئی گھوڑ دوڑ ایسی نہیں ہوتی جس میں اپنا کام ہرج کر کے نہ جاؤں ۔ اس گھوڑے کو دیکھا تو بظاہر تو جاندار پایا ۔ پاس جا کر تھپکا ، سم دیکھے ، بھونریاں دیکھیں ، جوڑ دیکھے ۔ غرض ہر طرح بے عیب پایا ۔ اتنے میں مور بھی اپنے تجربے سے فارغ ہو کر آ کھڑے ہوئے ۔ میں نے پوچھا "یار من ! گھوڑا کہاں سے لائے اور کہاں لا کر

رکھا ہے ؟ دارالتجربہ میں کیا خون کا امتحان کر رہے ہو یا بجلی سے علاج ؟" مور نے بڑے زور سے قہقہہ مارا اور کہا "یار جانی ! یہ وہ ہی میر حسن کی مثنوی والا گھوڑا ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اڑ نہیں سکتا ۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا ، یہ شاعر غضب کا دماغ لے کر آیا تھا ۔ پرزے تو میں نے بھی نکال لیے مگر ان کو بٹھا نہیں سکتا ۔ خیر آئندہ دیکھا جائے گا ۔" مجھے مور کی یہ گفتگو بہت بری معلوم ہوئی ۔ گویا ہم کو اندھا بنا رہا ہے ۔ میں اس کو برا بھلا کہتا رہا ، مگر وہ برابر ہنستا رہا ۔ آخر کہنے لگا ، "کیا واقعی تم اس کو اصلی گھوڑا سمجھتے ہو ؟" میں نے کہا "اور نہیں تو کیا مٹی کا ہے ؟"

مور : مٹی کا نہیں تو کل کا ضرور ہے ۔

میں : تو کیا میں اندھا ہوں ؟

مور : تو اس کا اندازہ خود کر لو ۔

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کے ایک پہلو کو دبایا اور پہلو کا پہلو اٹھا کر دوسری طرف الٹ دیا ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گھوڑے کے پیٹ میں ہزاروں تار ادھر سے ادھر دوڑے ہوئے ہیں ۔ سینکڑوں پرزے اس سرے سے اس سرے تک بیٹھے ہوئے ہیں اور بیسیوں مقناطیس اور بیٹریاں جا بجا جمی ہوئی ہیں ۔ یہ دیکھ کر میرے ہوش گم ہوگئے ۔ جب ذرا سنبھلا تو پوچھا کہ "مور ، کیا واقعی گھوڑا دوڑ سکتا ہے ؟

مور : تو کیا میں نے بچوں کا کھلونا بنایا ہے ؟ ہاں ، دوڑے گا اور خوب دوڑے گا ۔

میں : اس کی انتہائی رفتار ؟

مور : اس کا تو میں کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتا ، لیکن میرے خیال میں کم از کم ۳۰۰ میل فی گھنٹہ ہو گی ۔

میں : ۲۰۰ میل !

مور : ہاں ، ۲۰۰ میل بلکہ کچھ زیادہ۔

یہ سنتے ہی مجھے ٹکے پیدا کرنے کا خیال آ گیا اور سوچا کہ اس گھوڑے سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں نے مور پر ڈورے ڈالنے شروع کیے ، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اگر یہ دو تین دوڑیں بھی جیت گیا تو بس میرے دلدر دور ہو گئے۔

میں : کیوں یار اسے ڈربی کی گھوڑ دوڑ میں کیوں نہیں دوڑاتے ؟

مور : ڈربی کیا بلا ہے ؟

میں نے اسے سمجھانا چاہا ، مگر گھوڑ دوڑ کا مطلب نہ اس کی سمجھ میں آنا تھا نہ آیا ! آخر تھک کر میں نے اس سے کہا "اچھا یہ بتاؤ اس کی رفتار کم زیادہ ہو سکتی ہے ؟"

مور : یہ بھی ایک ہی کہی۔ اگر رفتار کم زیادہ نہ ہو سکے تو ایجاد ہی کیا خاک ہوئی ؟

میں : خیر ، یہ تو بتاؤ کہ اس گھوڑے کا تم کیا کرو گے ؟ کیا اچار ڈالو گے ؟

مور : کچھ نہیں۔ کوئی صاحب آ کر اٹھا کر لے جائیں گے - پھر نہ گھوڑے کو مجھ سے کچھ کام اور نہ مجھ کو گھوڑے سے کچھ غرض۔

میں : تو پھر یہ مجھے ہی دے ڈالو۔

مور : تم ہی لے جاؤ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ حق بھی تمھارا ہی ہے۔ تمھاری کتاب سے یہ پیدا ہوا ہے اور تم ہی اس کے سب سے زیادہ مستحق ہو۔

اندھا کیا چاہے ، دو آنکھیں ۔ میں نے مور سے اس کے چلانے کی پوری ترکیب سیکھ لی ۔ گھوڑے کو کمرے سے نکالا اور سوار ہو کر گھر آیا اور تھان پر باندھ دیا ۔ اس کے ایک دو روز بعد مور کے پاس گیا ۔ اس گھوڑے کا کچھ ذکر بھی چھیڑا ، لیکن میرے یار کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس نے ایسا کوئی گھوڑا بنایا بھی تھا یا نہیں ۔ چلو گئی گزری بات ہوئی ۔

میرا ارادہ ہوا کہ ڈربی سے پہلے اس گھوڑے کو دو تین چھوٹی موٹی دوڑوں میں بھگالوں تاکہ لوگ اس کی حالت سے آگاہ ہو جائیں اور ایک دفعہ ہی ایسی بڑی دوڑ میں شریک ہونے کے متعلق کوئی ضابطے کا اعتراض نہ ہو سکے ۔ رجسٹر میں گھوڑے کا اندراج کرانے کے لیے گھوڑ دوڑ کے مہتمم نے اس کا نام دریافت کیا ۔ یہ ٹیڑھی کھیر تھی اور میں اس کے لیے تیار نہ تھا ۔ لیکن میری تیزی طبع نے اس مشکل کو بآسانی رفع کر دیا ۔ پہلے اس کا نام آدم بتایا ۔ مہتمم نے ماں اور باپ کا نام پوچھا ۔ میں نے کہا کہ آدم کی پیدائش کے لیے ماں باپ کی ضرورت نہیں ہے ۔ مگر جب انھوں نے ضابطے کی دفعہ بتائی تو لاچار مجھے نام تبدیل کرنا پڑا ۔ آخر سوچتے سوچتے ''ایجاد'' نام سمجھ میں آیا ۔ ''ضرورت'' کو ''ایجاد'' کی ماں بتایا اور ''تجربے'' کو اس کا باپ ۔ دادا پردادا کا نام دریافت کیا گیا تو نادر شاہ کے نسب نامہ پر عمل کرکے شمشیر ابن شمشیر ابن شمشیر کی بجائے ترقی ابن ترقی کا سلسلہ ستر پشت تک گنا دیا ۔ یہ بیان کافی سمجھا گیا اور ایجاد کے نام سے میرے گھوڑے کی رجسٹری ہو گئی ۔

(۱۹۰۲ — ۱۹۵۵ء)

چراغ حسن حسرت اُردو ادب میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ مختلف جرائد میں بہ حیثیت ایڈیٹر کامیابی کے ساتھ کام کیا۔ ہندو دیو مالا کو اُردو ادب میں اس انداز میں روشناس کرایا ہے کہ ہر فقرہ اور ہر جملہ اپنی خاص جاذبیت رکھتا ہے۔

مردم دیدہ متذکرہ بالا صفات کی متحرک تصویر ہے۔ انھوں نے جو سوانح حیات لکھی ہیں، ان میں پرانی روایات سے ہٹ کر حسرت نے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ اس میں واقعات کو کسی ضابطہ تاریخ اور سن کے تحت پیش نہیں کیا گیا ہے۔ ایک مسلسل افسانے کی سی کیفیت ہے، جس میں نشیب و فراز دونوں دلچسپ اور ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ اس میں حسرت کی آپ بیتی بھی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عام شخصیت نگاروں سے حسرت بالکل الگ اور منفرد ہیں۔ چراغ حسن حسرت کو ان کی دلچسپ اور رنگین تحریر، ان کی ظرافت اور خوش طبعی نے مل کر اُردو ادب میں ایک ممتاز جگہ دی ہے۔

شفاء الملک مرحوم

آپ کی نظر سے شفاء الملک فقیر محمد صاحب چشتی کی آخری تصویر ضرور گزری ہوگی جو انھوں نے موت سے صرف چند مہینے

پہلے کھنچوائی تھی - لیکن تصویر آخر تصویر ہے - اس سے نہ ان کے سن و سال کا اندازہ ہوتا ہے نہ قد و قامت کا - پھر اس تصویر سے نہ وہ طبیب معلوم ہوتے ہیں نہ ادیب - اگر تصویر کے نیچے ان کا نام نہ لکھا ہوتا تو بہتیرے لوگ جنھوں نے مرحوم کو ان کی زندگی میں نہیں دیکھا یہی سمجھتے کہ اخبار والوں نے کسی صوبیدار میجر یا سرحد کے کسی لیڈر کی تصویر چھاپ دی ہے - اور تصویر پر کیا موقوف ہے ، اگرچہ یہ لوگ حکیم صاحب کو دیکھ لیتے جب بھی یہی کہتے -

اصل میں ادیبوں اور شاعروں کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ وہ بہت دبلے پتلے اور ہمیشہ کے روگی ہوں - اگرچہ پنجاب کے بعض ادیبوں نے بہت حد تک اس خیال کی تردید کر دی ہے - اور جن لوگوں نے صرف اسی قسم کے بعض پنجابی ادیب دیکھے ہیں ، وہ سمجھتے ہیں کہ کوئی اچھا ادیب گاماں پہلوان سے کیا کم ہوتا ہو گا ؟ لیکن ابھی تک یوپی کے بعض دھان پان شاعروں کی وجہ سے اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ فطری ادیب کو فسانۂ آزاد کے میاں خوجی کا ہم رنگ ہونا چاہیے - باقی رہا طبیب تو جب تک اس کے چہرے سے یہ معلوم نہ ہو کہ بو علی سینا نے جتنے امراض کا ذکر کیا ہے وہ بیچارہ ان سب میں مبتلا رہ چکا ہے ، لوگ اس کی طبابت اور حذاقت پر کیسے ایمان لائیں -

یہ عجیب بات ہے کہ حضرت شفاءالملک مرحوم طبیب بھی تھے اور ادیب بھی - لیکن طبیبوں اور ادیبوں کی اس مشترک خصوصیت سے بالکل محروم ، قد کوئی چھ فٹ کے قریب ، چوڑا سینہ، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں ، گھنی داڑھی ، گندمی رنگت ، چار کم ستر سال کی عمر میں وفات پائی ، لیکن پچاس سال سے زیادہ کا سن معلوم نہیں ہوتا تھا - سید احمد علی شاہ جو پہلے پطرس کے لقب سے مشہور اور اب ریڈیو تخلص فرماتے ہیں ، ان کا قد و قامت ،

شکل و شمائل دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ حکیم صاحب کو تو شادی بیاہ کی محفلوں کے لیے کرایہ پر چلانا چاہیے - یعنی جہاں کوئی برات ہو حکیم صاحب کو بیعانہ بھیج دیا جائے کہ اپنے دوستوں سمیت تشریف لے آئیے - مجھے یقین ہے کہ برات کی رونق دوبالا ہو جائے گی -

حکیم صاحب کا وطن مالوف جگراؤں تھا ، جو ضلع لدھیانہ کا ایک قصبہ ہے - نوجوانی میں دہلی چلے گئے اور حکیم عبدالمجید خاں سے طب پڑھی - پھر چند سال ان کے مطب میں رہ کر طب کی عملی تعلیم حاصل کی - طبیعت بچپن سے شوخ تھی - دہلی کا قیام سونے پر سہاگا ہو گیا -

ایک دن مطب میں بیٹھے تھے کہ ایک نازک اندام ہندو عورت آئی - اس کا دوپٹہ گوٹے سے لپا ہوا تھا - حکیم عبدالمجید خاں کے سامنے اور تو کچھ کہہ نہ سکتے تھے ، اپنے ایک ہم درس کو جو دوائیں دے رہا تھا ، پکار کر کہا :

"خمیرہ گاؤزبان بہ ورق نقرہ پیچیدہ"

شاہ نصیر کے متعلق اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ مشہور ہے - ایک عورت وسمے کی رضائی اوڑھے گزری - شاہ صاحب نے فوراً کہا :

اودی وسمے کی نہیں ہے یہ رضائی سر پر
مہ جبیں رات ہے تاروں بھری چھائی سر پر

لیکن "خمیرہ گاؤزبان بہ ورق نقرہ پیچیدہ" کا جواب نہیں -

میں جن دنوں "تہذیب نسواں" میں نیا نیا تھا ، ایک مرتبہ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا - کہنے لگے : "کوئی نئی خبر سناؤ - میں نے آج اخبار نہیں دیکھا -" میں نے کہا : " صاحب میں خود کئی کئی دن اخبار نہیں دیکھتا -"

ایک مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے ساتھ مظفر حسین صاحب شمیم بھی تھے۔ میں نے حکیم صاحب سے ان کا تعارف کرایا تو پوچھا، ”وطن مالوف؟“ شمیم صاحب نے کہا، ”رائے پور“۔ کہنے لگے، ”رائے پور کہاں ہے؟“ وہ بولے، ”سی۔ پی میں۔“ کہنے لگے، ”اچھا یوں کہیے آپ سی۔ پی سے آئے ہیں۔ تو پھر شمیم تخلص کیسا۔ موتی تخلص کیا کیجیے۔“ حکیم صاحب مرحوم جس طرح خود صاحب کمال تھے، اسی طرح اہل ہنر کے قدر شناس بھی تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے ملنے والوں میں سے کسی کی اچھی نظم یا اچھا مضمون پڑھیں یا کوئی شوخ فقرہ یا اچھی پھبتی سنیں اور داد نہ دیں۔ کبھی کبھی یار لوگ خود ان پر پھبتیاں کہہ جاتے تھے، اور وہ بڑی فیاضی سے داد دیتے تھے۔

میں ایک دن حاضر ہوا، تو وہ خضاب کیے اور ڈھاٹا باندھے بیٹھے تھے۔ میں نے عرض کیا، ”آج کیا بات ہے کہ حضور نے چہرے کو بکل حکمت کر رکھا ہے؟“ ہر چند کہ پھبتی پرانی تھی، لیکن موقع کے لحاظ سے ایسی مناسب کہ سنتے ہی اچھل پڑے۔

اخبار نویسوں کی نوک جھوک میں انھیں بڑا لطف آتا تھا۔ مجھ سے بارہا کہا کہ بھئی کچھ سالک صاحب کے متعلق ضرور لکھو۔ سالک صاحب سے بھی کئی مرتبہ کہا کہ آپ سے اور حسرت سے چل جائے تو بڑا لطف رہے۔ لیکن ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ میں نے سالک صاحب کو چھیڑا اور وہ طرح دے گئے، یا انھوں نے میرے متعلق کچھ لکھا اور میں پی گیا، یا کبھی سلسلہ چھڑ گیا تو صرف دو تین دن تک، ہلکی ہلکی چوٹیں چلتی رہیں اور قصہ ختم ہو گیا۔

(۱۸۹۶ء - ۱۹۷۷ء)

پروفیسر رشید احمد صدیقی مڑیاہو ضلع جون پور میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے آئے، جہاں فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ لکھنے کا شوق شروع ہی سے تھا۔ کالج میگزین میں ہمیشہ آپ کے مضامین شایع ہوتے رہے، جس کے مدتوں وہ اڈیٹر بھی رہے۔ ادب سے اسی ذوق کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ کالج میں اردو کے لیکچرار مقرر ہو گئے۔ بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی ہی میں ۱۹۲۲ء سے شعبۂ اردو کی صدارت کا عہدہ سنبھالا۔

رشید صاحب منفرد طنز و مزاح نگار ہیں۔ ان کے لکھنے کا ڈھنگ بالکل اچھوتا ہے۔ ان کے یہاں وسیع النظری اور فکر کا نمایاں پہلو، ادراک و مشاہدے کی عظیم قوت، وسیع مطالعہ غرض کہ کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز کے بارے میں اتنی وسیع معلومات اور فلسفیانہ نکات کا مہیا کر دینا انھی کا خاصہ ہے۔

ان سب خصوصیات نے رشید صاحب کے طنز و مزاح میں ایک خوشگوار رنگینی اور معنی آفرینی پیدا کر دی ہے۔ ان کے یہاں ابتذال کا کہیں گزر نہیں۔ سنجیدہ ظرافت اس دَور میں ان ہی کی مرہونِ منت ہے۔

رشید احمد صدیقی کی کئی تصانیف ہیں: مثلاً مضامینِ رشید، خنداں، طنزیات و مضحکات وغیرہ۔ اس کے علاوہ گنج ہائے گراں مایہ اور ہم نفسان رفتہ آن کے سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اکثر کتابوں کے مقدمے بھی آپ نے لکھے ہیں، جو بجائے خود ادب کے نادر شہ پارے ہیں۔

اردو ادب میں رشید صاحب نے ایک نئے دَور کا آغاز کیا ہے - اس سے پہلے طنزیہ مضامین میں اتنی مقصدیت، رعنائی، توانائی اور شگفتگی نظر نہیں آتی اور نہ طنز و ظرافت کی ذہنی سطح اتنی بلند ہے جتنی رشید صاحب کے یہاں ملتی ہے - یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ الفاظ سے کھیلتے ہیں اور پڑھنے والا گدگدی محسوس کرتا ہے اور بالآخر ان سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے -

---

الیکشن

جس زمانہ کا تذکرہ میں کر رہا ہوں - اس میں قانونی عدالتیں کچھ یوں ہی ہوا کرتی تھیں، اور حاکم عدالت بھی ضابطے یا قانون دانی کے اعتبار سے کچھ نیاز مند ہی سے ہوتے تھے، جیسے آج کل ہیں - آج کے قانون یا قانون دانوں کے کمالات دیکھ کر تو اکثر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ افسوس تمام عمر یوں ہی گزار دی کیوں نہ کوئی سنگین جرم کیا - شہرت بھی ہوتی اور بری بھی ہو جاتا - لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاً یہ خطرہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ رب کا شکر ادا کر بھائی! بغیر کسی جرم کے بھی تو سزا پا جاتے ہیں - اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ ان سے دور ہی رہا جائے' -

یہی حال ڈاکٹروں کا ہے - ان کا کمال فن یہ ہے کہ مرض سمجھ میں نہ آئے تو کوئی ایسا مرض پیدا کر دینا چاہیے جو سمجھ میں آتا ہو- اس کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ مرض کا علاج شروع کر دینا چاہیے - اس طور پر کوئی تیسرا مرض یقیناً پیدا ہو جائے گا اور پھر

اس کو قابو میں لانے کی کوشش کر لی جایا کرے گی ۔ قابو میں آ گیا تو خیر ، ورنہ جہاں تک مریض کا تعلق ہے پوسٹ مارٹم کے نتائج تو آسانی سے متعین ہو جائیں گے ۔

ہاں تو میں تذکرہ کر رہا تھا اگلے زمانے کے حاکموں اور قانون دانوں کا ۔ چنانچہ جن بزرگ یعنی حاکم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ آپ کی دعا سے ضابطے یا قانون سے کچھ زیادہ واقف نہ تھے۔ اور وکیلوں اور مختاروں سے اتنے ہی خائف یا مشتبہ رہتے تھے جتنا خود ملزم حاکم عدالت اور وکیل اور مختار دونوں سے ۔ حاکم نے سوچتے سوچتے یہ ترکیب نکالی کہ وکیل مختار سے گلو خلاصی حاصل کر لی جائے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ قانون کی گھری گھری ٹھوس باتوں سے دماغ یکسو نہیں رہنے پاتا ، اس لیے نفسِ معاملہ پر صحیح رائے قائم کرنے میں دقت واقع ہوتی ہے ۔ یہ صحیح ہے یعنی کچھ غلط بھی نہیں ہے یعنی اس کے غلط ہونے کا بھی امکان ہے ۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ یہ بات ذرا گھری ہے اور ممکن ہے میں اسے واضح نہ کر سکا ہوں ۔ لیکن اس سے تو یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ آپ بھی کچھ نہ کچھ سمجھ سکے ہوں یا حاکم کی نیت بخیر نہ ہو ۔

چنانچہ حاکم نے وکیلوں اور مختاروں سے کہا : ”حضرات ! آپ لوگ قانون کی ایسی بال کی کھال نکالتے ہیں کہ نفسِ معاملہ گاؤ خورد ہو جاتا ہے اور انصاف کا حق ادا نہیں ہوتا ۔ اس لیے آپ لوگ خاموش رہا کیجیے ۔ میں چاہتا ہوں کہ فریقین خود ایک دوسرے سے بحث کریں ۔ یہ خود بحث کریں گے تو حق کا فرشتہ یا ناحق کا شیطان فریقین متعلقہ کے سر اور چہرے کے ارد گرد حمد گاتا ہوا یا رقص کرتا ہوا نظر آئے گا ۔ اس طور پر عدالت کو صحیح فیصلہ صادر کرنے میں سہولت ہوگی ۔ وکلاء نے کچھ کہنا چاہا تو گرگ باراں دیدہ پیشکار نے حلبی شیشہ کی میلی عینک ناک کے پھننگ

پر رکھ کر کہا ، ”صاحبو ! اس معاملے میں آپ لوگ خاموش ہی نہیں بلکہ عدالت کے کٹہرے سے ذرا دور ہٹ جایا کریں تو زیادہ بہتر ہوگا - ورنہ جس وقت عدالت میں انصاف کے فرشتے یا ظلم کے شیطان کا نزول ہوگا ، اس وقت ان واردوں کو اس امر کے سمجھنے میں سخت دشواری ہوگی کہ ظالم یا مظلوم کون ہے - عدالت ، فریقین یا وکلاء ؟ یہ تو کہیے حاکم کے سر پر اللہ کا سایہ ہوتا ہے ورنہ آپ جانتے ہیں کہ غیبی مہمانوں کا عدالت کے کمرہ میں نازل ہونا کوئی معمولی بات ہے ؟ “

غرض حاکم کا حکم بحال رہا - فریقین خود اپنے حقوق ایک دوسرے پر جتاتے اور عدالت بجائے خود کسی نتیجے پر پہنچتی اور اسی کے مطابق فیصلہ صادر کرتی - کچھ دنوں یہی لیل و نہار رہے - حق کے فرشتے اور ناحق کے شیطان آتے رہے - حاکم کے سر پر خدا کا سایہ بھی قائم رہا - البتہ پیشکار پر وکیلوں اور مختاروں کا سایہ ذرا ضرورت سے زائد پڑنے لگا -

ایک دن عدالت نوشیروانی کا اجلاس ہو رہا تھا - فریقین پیش ہوئے ، لب و لہجے میں حرارت پیدا ہوئی - حرارت سے چنگاری برآمد ہوئی - چنگاری نے شعلہ کا رنگ پکڑا یہاں تک کہ دھماکا ہوا اور ناحق کے شیطان نے فرشتہ کو دبوچا ، سر سے بلند کیا اور زمین پر دے مارا -

فلک گفت احسن ملک گفت آہ -

عدالت نے فوراً فیصلہ صادر کیا ، یعنی شیطان حق پر تھا اور فرشتہ ناحق پر -

حاکم نے آرام کمرے کا راستہ لیا - پیشکار اور وکلاء طلب ہوئے - فیصلے کی داد چاہی گئی - حاضرین نے تخلیے میں نہایت ادب سے دریافت کیا کہ یہ از غیبی فیصلہ کیوں کر صادر کیا جاتا تھا

اور اس رمز سے دنیا آگاہ ہو جائے تو حق و ناحق کے جھگڑے بڑی آسانی سے طے ہو جایا کریں ۔ حاکم صاحب پہلے تو سوچ میں پڑ گئے، پھر ڈھیلے پڑے اور پھر پیلے اور پرچہ بادا باد کا سا انداز اختیار کر کے مسکرا پڑے اور پھر بولے "تم کو اتنی سی بات نہیں معلوم کہ حق کی آواز کوئی دبا نہیں سکتا ، میں فریقین کی بحث کو اتنے غور سے نہیں سنتا جتنا ان کے لب و لہجے اور تیور اور بحث کے انجام پر نظر رکھتا ہوں ۔ جس کو دیکھتا کہ چیخ و پکار ، گالی گلوچ مار دھاڑ کے اعتبار سے چرب پڑ رہا ہے اس کے موافق فیصلہ دیتا تھا ، اس لیے کہ حق کی آواز کبھی دبائی نہیں جا سکتی ۔"

اس راز کا انکشاف ہونا تھا کہ حاضرین پہلے تو دم بخود ہوئے، پھر کسی نے حاکم کی طرف دیکھ کر سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے نعرے لگائے اور کسی نے پیشکار سے مخاطب ہو کر دھن ہے مہاراج کی جے کار لگائی ۔ حاکم کے ہاتھ چومے ، پیشکار کے پاؤں چھوئے اور کانوں پر ہاتھ اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے ۔

انصاف کرنے کا یہ طریقہ ایک راز تھا جو صرف حاکم صاحب پر منکشف ہوا تھا ، تھوڑا بہت پیشکار پر بھی ۔ چنانچہ جس حادثے یا فیصلے کا تذکرہ ابھی ابھی کیا گیا تھا ، یہ پیشکار ہی کی مخبری کا نتیجہ تھا ۔ آپ کو معلوم ہے کہ منہ سے نکلی ہوئی پرائی بات ہے ۔ انصاف کا یہ طریقہ کچھ پیٹنٹ تو کرایا نہیں گیا تھا ۔ پھر موجودہ دور کے ذرایع و وسائل آمد و رفت جیسے بے پناہ ہیں وہ بھی ظاہر ہے ۔ انجام یہ ہوا کہ یہ چیز آج ساری دنیا میں پھیل گئی ہے اور اس اصول پر دنیا انصاف کا کاروبار ہو رہا ہے ، جس میں خدا رکھے الیکشن بھی شامل ہے ۔

یہی حالت ہماری زندگی کے تمام نشیب و فراز میں پائی جاتی

ہے ۔ اسی کو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کہتے ہیں ، اس کا نام مسابقت رکھا گیا ہے ۔ اس کو تہذیب کا عَلَم یا تمدّن کی فتح کہتے ہیں اور خدا جانے اور کیا کیا کہتے ہیں ، جن کی تفصیل کا یہ موقع تو تھا مگر بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے خود یاد نہیں آتے ورنہ یقین مانیے کسی نہ کسی طور پر ضرور سنا دیتا ۔

ہاں تو بات میں بات نکل آتی ہے ۔ یعنی آج کی صحبت میں ریڈیو والے اس امر کے درپے ہیں کہ الیکشن کے بارے میں میری آپ کی گلخپ ہو جائے ۔ آپ کو معلوم ہے اس ملک میں برسات کے موسم میں بالعموم لوگ کشتی لڑتے ہیں ، جھولے جھولتے ہیں اور پھلوریاں کھاتے ہیں ۔ سیلاب آیا تو درخت پر چڑھ گئے ، ہیضہ پھوٹا تو اسی درخت کے بھوت یا دئیت بن گئے ۔ لیکن یہ بات تو عوام یا جہلاء سے متعلق ہے ۔ مہذب لوگ ایسا نہیں کرتے ۔ وہ کشتی کے بجائے الیکشن لڑتے ہیں ، کونسلوں میں پینگیں بڑھاتے ہیں اور کمیٹیوں میں پکوان اڑاتے ہیں ۔ سیلاب آئے یا سوکھا پڑے یہ اپنے حلقۂ انتخاب میں مامقیماں پڑھتے رہتے ہیں ۔

مرغِ شاخِ درختِ لا ہوتیم

مرغ اور شاخ پر مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا ۔ یہ واقعہ اکثر بے موقع ہی یاد آتا ہے اور یہاں مجھے غیر متعلق سا بھی معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن آپ معاف فرمائیے اگر میں اسے یہاں بیان کر دوں آپ کو کوئی نقصان نہ ہو گا اور میرا خلجان دور ہو جائے گا ، یعنی یہ واقعہ یاد آنا بھول جائے گا ۔ وہ واقعہ میں سنائے دیتا ہوں ، موقع آپ تلاش کر لیجیے گا ۔

ایک دن یہی الیکشن کی فصل تھی ۔ ووٹ لینے کے لیے لوگ موٹر ، ڈنڈے اور لڈو لیے ہوئے میری تلاش میں نکلے تھے ۔ صرف تین امیدوار تھے اور میں نے تینوں سے ووٹ دینے کا وعدہ کر لیا

تھا - ایک سے تو اس بنا پر کہ مجھ پر اس کے روپیے واجب تھے ، دوسرے سے یوں کہ اس کا کاشت کار تھا ، اور تیسرے سے اس لیے کہ یہ شخص بات کرتے کرتے یا تو کبھی خود رو پڑتا تھا یا مجھے مار ڈالنے پر آمادہ ہو جاتا تھا -

ظاہر ہے ایسی حالت میں میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کہیں بھاگ جاؤں - لیکن آپ نے سنا ہوگا گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے - میں اتفاق سے ایک ایسے مقام پر جا نکلا جہاں ہر طرف عجیب و غریب قسم کے لوگوں کا ہجوم تھا - کہیں گراموفون بج رہا تھا ، کہیں کھانے پکانے اور کھلانے کا انتظام تھا - ایک طرف سپیرا سانپ کے اور دوسری طرف مداری بھالو اور بکری کا کرتب دکھا رہا تھا - ایک طرف سبیل لگی ہوئی تھی ، دوسری طرف ناچ رنگ کا سامان تھا - ایک جگہ کچھ لوگ لیکچر دے رہے تھے لیکچرار اور حاضرین کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ شاید کوئی منچلا کسی سنیاسی یا فقیر کی بنائی ہوئی جڑی بوٹیوں کے خواص بتا رہا ہے - ابھی میں حیص بیص میں تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے کہ ایک صاحب نے نہایت دوستانہ انداز میں پیچھے آ کر میری گردن پکڑی اور آگے پیچھے کھینچ دھکیل کر ، جیسے رائفل میں کارتوس بھرے جاتے ہیں ، بولے 'کیوں آپ کا نام بندو خاں ہے ؟ چلیے ووٹ دیجیے اور یہ بیڑی پیجیے - بڑا انتظار دکھایا ، میں نے دوستی کا اعتراف ابھی اس حد تک کیا تھا کہ بیڑی لینے پر آمادہ ہوا تھا کہ ایک دوسرے صاحب نے مجھے اپنی طرف گھسیٹا اور بولے ، خبردار ! بدھو خلیفہ میرے ووٹر ہیں - لڑکپن میں ہم دونوں کپاس چرایا اور مار کھایا کرتے تھے - کیوں خلیفہ ، بھولے تو نہیں ؟، ابھی میں نے پورے طور پر حافظے کا امتحان نہیں لیا تھا کہ ایک تیسرے بزرگ آگے بڑھے اور گریبان کھینچ کر بولے ، 'واہ میر بنے ! تم نے تو کنوئیں جھنکوا دیے - ایسا بھی کیا غائب

ہونا - چلو کچھ کھا پی لو ، اس کے بعد مجرا سنیں گے'- لیکن اس سارے قضیے کا انجام یہ ہوا کہ مجھے اس کمرے میں لے گئے جہاں ووٹروں کی جانچ پڑتال ہوتی ہے - اصلی شخص جس کا ووٹ پڑنے والا تھا وہ بندہ حسن تھا - کلرک نے پوچھا 'بندہ حسن کون ہے ؟'، میرے ایک دوست نے مجھے آگے بڑھا کر کہا 'صاحب ! ان کا اصلی نام بندہ حسن ہے - لیکن یہ نام ماں باپ نے رکھا تھا ورنہ عام طور پر ان کو بندو خان کہتے ہیں' - دوسرے نے کہا 'ارے بھائی اللہ سے ڈرو ! بدھو خلیفہ ہمیشہ سے بدھو خلیفہ ہیں ، اسی نام سے ووٹ دیں گے' - تیسرے نے لپک کر للکارا ، 'ارے لوگو ! خدا سے ڈرو یا نہ ڈرو ، حوالات سے تو ڈرو - میر بنے کو بدھو خلیفہ کہتے شرم نہیں آتی' - کلرک نے گھبرا کر مجھ سے پوچھا 'آخر تم کیسے چپ ہو ؟ تم ہی بتاؤ تمھارا نام کیا ہے -

میں نے کہا 'حضور ، اپنا اصلی نام مجھے بھی ٹھیک نہیں معلوم ، لیکن کشتی لڑتا تو اکھاڑے میں بندو خان کے نام سے مشہور ہوا - غازی میاں کا علم اٹھانے لگا تو بدھو خلیفہ کہلایا - اب نفیری اور فیرینی بیچتا ہوں تو لوگ میر بنے کہنے لگے ' - کارک بھی زندہ دل تھا ، بولا، تُم نے آنے میں جلدی کی ورنہ یہی لوگ تم کو اس ممبر کی حیثیت سے پیش کر دیتے جس کے تم ووٹر سمجھے جاتے ہو - لیکن اب یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ ورنہ تمھاری خیر نہیں' -

میں بھاگا اور سارا مجمع میرے پیچھے ہو لیا - ایک ہلڑ مچ گیا اور مشہور ہوا کہ میں بچوں کو چرا لے جایا کرتا ہوں - قریب تھا کہ مجمع کے ہاتھوں صبر و شکر قسم کی کوئی چیز بن جاتا کہ میں ایک گلی میں ہو لیا اور شور مچایا کہ پولنگ اسٹیشن پر بلوہ ہو گیا - نتیجہ یہ ہوا کہ مجمع پولنگ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا اور میں بھاگا ، گرتا پڑتا سامنے ایک عالیشان عمارت

تھی ، اس میں داخل ہوا اور بے ہوش ہو گیا ۔ یہ جانوروں کا عجائب خانہ تھا ۔ دوسرے دن آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا ۔ قریب ہی ایک اخبار رکھا تھا جس میں نہایت جلی حرفوں سے یہ خبر درج تھی : 'کونسل ہال میں ایک انارکسٹ کا حملہ اور دربان کی عدیم المثال بہادری ، یہ باتیں تو بقول چہار درویش یا فسانۂ عجائب 'اے حاضرین باتمکین و صاحبان صدر نشین ، اپنی جگہ پر رہیں اور آپ انھیں اپنی جگہ پر رہنے نہ دیں گے تو کیا مجھے جیل خانہ بھجوا دیں گے ؟ بات اصل یہ ہے کہ الیکشن بہت اچھی چیز ہے ۔ خدا کی دین ہے یعنی اللہ دے اور بندہ لے ۔ اس محاورے کے استعمال میں ممکن ہے مجھ سے غلطی ہوئی ہو۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ابھی اس ملک کی فضا اس کے لیے موزوں نہیں ہے ۔ یہاں الیکشن میں بالعموم اسی کی فتح ہوتی ہے جس کے پاس روپیہ ہے یا جس سے لوگ ڈرتے ہوں ۔ ووٹروں کو فکر و عمل کی آزادی نہیں ہے ۔ مستثنٰی حالتوں کے علاوہ یہاں کامیاب ممبر کے بارے میں یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ وہ اپنے حلقۂ انتخاب کا صحیح نمائندہ ہے ۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ الیکشن کی کمزوریوں سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہے ۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ اس بے روزگاری کے دور میں الیکشن نفع بخش چیز ہے ۔ مثلاً آپ کسی کے مقابلے میں کھڑے ہو کر خوب ہنگامہ مچائیے ! دولت مند امیدوار آپ کو روپئے دے دلا کر بیٹھ رہنے پر راضی کر لے گا ۔ اس کے بعد اس کے کارکن بن جائیں گے تو اور روپیے مل جائیں گے ۔ آپ ذرا ایماندار قسم کے آدمی ہوں تو کوئی قومی ادارہ کھول دیجیے ۔ مثلاً مدرسہ ، یتیم خانہ ، پنجرہ پول وغیرہ اور کہیے کہ آپ کے ادارے کو پالسو روپیے دلائے جائیں تو آپ بیٹھ رہیں گے ۔ روپیے مل جائیں گے ۔ ظاہر

ہے کہ آپ اس سلسلے میں اپنی زیر باریوں کی تلافی کے لیے زر عطیہ سے کچھ نہ کچھ وصول ہی کر لیں گے اور اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے کہ آپ اتنے خوش قسمت نہیں ہوں گے کہ اتنی ذرا سی رقم سے آپ کی تمام زیر باریاں دور ہو جائیں۔

اب رہا یہ امر کہ الیکشن نہ ہو تو کیا ہو۔ اس پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ کسی گاؤں میں ایک لال بجھکڑ رہتے تھے۔ ایک دفعہ کوئی سخت معاملہ پیش آ گیا، جس کو سلجھانے کے لیے لوگ لال بجھکڑ کے یہاں ایک وفد لے گئے۔ لال بجھکڑ سے کون نہیں واقف ہے۔ بہت ممکن ہے اس وقت آپ کے آس پاس بیٹھے ہوں اور اپنا نام سن کر کان کھڑے کریں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ جس کے کان نمایاں دیکھیں اس کو لال بجھکڑ قرار دیدیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کانوں سے لال بجھکڑ کا کوئی تعلق نہیں ہے اور کانوں ہی کا کیا، لال بجھکڑ کا کان، ناک، آنکھ، زبان، کسی سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ صرف عقل سے کام لیتے ہیں۔ لال بجھکڑ عقل سے جس قسم کا کام لیتے ہیں اس قسم کا کام عقل سے دوسرے نہیں لیتے۔ لیکن یہاں کچھ خلط مبحث ہو رہا ہے۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ گاؤں والے ایک مشکل میں مبتلا ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ ایک دفعہ لال بجھکڑ کے ہاں گئے۔ لال بجھکڑ نے سارا واقعہ سن کے ایک چنگھاڑ ماری اور زار و قطار رونے لگے۔ ابھی لوگوں کا تعجُّب ختم نہیں ہوا تھا کہ موصوف رکے اور ایک سخت قہقہہ مار کر ہنسے اور ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد لوگوں نے جذبات کے اس نشیب و فراز کی حقیقت دریافت کی تو لال بجھکڑ گویا ہوئے، ”بھائی! رویا تو یہ سوچ کر کہ اب اس گاؤں کے ایسے برے دن آن لگے ہیں کہ لوگ ذرا سی بات پر بھی مجھ سے رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر میں مر جاؤں تو کیا ہو؟ اور ہنسا یوں کہ وہ بات میری بھی سمجھ میں نہ آئی۔“

مرزا اسد اللہ خان غالبؔ

(۱۷۹۷-۱۸۶۹ء)

مرزا اسد اللہ خان غالب کی شخصیت اُن چند عظیم ہستیوں میں سے ہے جنھوں نے ادب کو نئے ذہن اور نئے اندازِ فکر سے روشناس کرایا - ان کی حیثیت اُردو ادب کے ایک مجتہد کی ہے - وہ ۱۷۹۷ء میں آگرے میں پیدا ہوئے تھے - بچپن کا زمانہ بڑے ناز و نعم میں گزارا - مگر ان کا یہ عیش چند روزہ تھا - بقیہ عمر میں انھیں بڑے بڑے انقلابات سے دو چار ہونا پڑا - نئے نئے تجربات ، بدلتے ہوئے اقتدار ، لٹتی ہوئی حکمرانی ، تباہ ہوتی ہوئی راجدھانی ، غرض کہ غالب کی آنکھوں نے حوادث زمانہ کو بہت قریب سے دیکھا اور ہر طرح دیکھا -

زمانہ کے ہر تازیانے پر میر کی طرح کراہ اُٹھنے کی بجائے غالب نے اپنی ذہنی افتاد طبیعت کی وجہ سے ایک نئی دنیا آباد کی اور بساط کو اس طرح بچھایا کہ مایوسی میں بھی ایک شان استغنا قائم رہی - غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا - مگر عجیب بات ہے کہ جو مقبولیت ان کی اُردو غزلوں کو حاصل ہوئی وہ فارسی کلام کو نہ ہوئی - غالب کی شخصیت بڑی دلکش تھی اور باوجود ان کی بعض کمزوریوں کے ، ان کے زمانے کے ثقہ لوگ اور علماء و فضلاء ان کو بہت عزیز رکھتے تھے ان کی انفرادیت نثر اور نظم دونوں میں قائم ہے -

شاعری سے قطع نظر غالب کا فن اُن کی نثر میں بھی اپنے عروج پر ہے - ان کی مشکل پسندی اور ذہنی افتاد نے اُن کی شاعری کو خواص کی شاعری بنا دیا ہے - اس کے برعکس اُردو نثر میں روزمرہ کی گفتگو کو زبان کا چٹخارہ دیدیا ہے -

مُقفّٰی مسجّع عبارت اور بھاری بھرکم الفاظ کی جگہ بالکل سادی اور عام فہم زبان لکھتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دو دوست یا عزیز بیٹھے باتیں کر رہے ہیں ۔ غالب کی جدت طرازی بہت پسندیدہ ہے ، جس کی تقلید لوگوں نے اُن کے بعد بہت کی مگر غالب کی سی بات کسی میں پیدا نہ ہو سکی ۔

غالب کی نثر اُن کے خطوط ہیں جو اُردوئے معلّٰی اور غالب کے خطوط کے نام سے ضخیم جلدوں میں موجود ہیں ۔ غالب سے پہلے جو خطوط لکھے جاتے تھے ، وہ لمبے القاب و آداب ، کٹھن فارسی و عربی زبان میں مشکل ترکیبوں کے ساتھ لکھے جاتے تھے ۔ اس کے علاوہ تمہید میں بڑا تصنّع اور بناوٹ ہوتی تھی ۔ اس کے بعد اصلی مقصد انتہائی پرپیچ الفاظ میں ظاہر کیا جاتا تھا ۔

غالب بھائی صاحب وغیرہ لکھ کر تخاطب کرتے تھے اور انتہائی سلجھی ہوئی زبان میں براہ راست مقصد بیان کر دیتے تھے ، جس میں مخاطب کے مذاق اور اس کے مرتبے کے لحاظ سے بے حد پُر لطف طنز و مزاح کرتے تھے ۔ ان کے خطوط میں ایک ڈرامائی کیفیت ہوتی ہے ۔ وہ خطوط اس طرح لکھتے ہیں جیسے مخاطب اُن کے سامنے بیٹھا ہوا ہو اور مرزا اس سے بالمشافہہ باتیں کر رہے ہوں ۔ اس کی وجہ سے اُن کے خطوط میں ایک دلچسپ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔

مختصر یہ کہ غالب نے اپنی جدت طرازی اور اپج سے اُردو ادب کو ایک نیا زاویۂ نگاہ اور اندازِ فکر عطا کیا ہے ۔

خطوط غالب

(۱) مرزا تفتہ کے نام

بھائی، تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسوّدے اصلاح کے واسطے فراہم ہوتے ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمھیں بھی معلوم ہے، اور یہ تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں۔ بالا خانے کا دالان میرے بیٹھنے اٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل، اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، اگال دان رکھ دیا۔ قلم دان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتیٔ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمھارے قصائد دیکھے جائیں گے۔ میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے۔ تمھاری خیر و عافیت اُن سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے نہیں ملے۔ پرسوں سے نواب مصطفٰی خان صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے۔ ابھی یہیں رہیں گے، بیمار ہیں۔ احسن اللہ خان معالج ہیں۔ فصد ہو چکی ہے، جونکیں لگ چکی ہیں، اب مُسہل کی فکر ہے۔ سوائے اس کے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ میں ناتواں بہت ہو گیا ہوں۔ گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا، تکلّف کی ملاقات کا آ جائے تو اُٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے مسوّدات دیکھتا ہوں۔ اللہ اللہ۔ صبح جمعہ ۱۴ ماہ اکتوبر ۱۸۶۶ء۔

(۲) منشی نبی بخش کے نام

لو صاحب اور تماشا سنو ، آپ مجھ کو سمجھاتے ہیں کہ تفتہ کو آزردہ نہ کرو ۔ میں تو ان کے خط کے نہ آنے سے ڈرا تھا کہ کہیں مجھ سے آزردہ نہ ہوں ، بارے جب تم کو لکھا اور تم نے بہ آئین مناسب ان کو اطلاع دی ، تو انھوں نے مجھ کو خط لکھا۔ چنانچہ پرسوں میں نے اسی خط کا جواب بھیج دیا ۔ تمھاری عنایت سے وہ جو ایک اندیشہ تھا ، رفع ہو گیا ۔ خاطر میری جمع ہوگئی ۔ اب کونسا قصہ باقی رہا کہ جس کے واسطے آپ ان کی سفارش کرتے ہیں ۔ واللہ تفتہ کو میں اپنے فرزندوں کی جگہ سمجھتا ہوں اور مجھ کو ناز ہے کہ خدا نے مجھ کو ایسا فرزند عطا کیا ہے ۔ رہا دیباچہ، تم کو میری خبر ہی نہیں ۔ میں اپنی جان سے مرتا ہوں ۔

کیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

یقین ہے کہ وہ اور آپ میرا عذر قبول کریں ، اور مجھ کو معاف رکھیں ۔ خدا نے مجھ پر روزہ نماز معاف کر دیا ہے ۔ کیا تم اور تفتہ ایک دیباچہ معاف نہ کرو گے ۔

سرسید احمد خاں

(۱۸۱۷ء–۱۸۹۸ء)

انسان کی اس فطرت کو کیا کہیے کہ وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر پند و نصائح سے گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ سر سید چونکہ انسانی فطرت کے بڑے رمز شناس تھے اس لیے وہ ایک بڑے مبلّغ اور ریفارمر ہونے کے باوجود کبھی ناصح نہ بنے۔ وہ انتہائی دوستانہ انداز میں باتیں کرتے اور قوم کی اصلاح کرتے تھے۔ تحریر و تقریر میں کہیں بھی تصنّع کا نام نہیں۔ اس لیے سرسید نہ صرف اردو ادب میں بلکہ پوری مسلم قوم میں ایک کامیاب ہیرو نظر آتے ہیں۔

سر سید احمد خاں ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سب جج کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ وہ مسلمانوں کی گری ہوئی حالت کو سدھارنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ساری زندگی صعوبتیں برداشت کیں۔ رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تا کہ مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہوں اور وقت کی ضرورت کو سمجھیں، کیونکہ اس میں ان کی بھلائی ہے۔ ۱۸۷۵ء میں اس مقصد کے لیے علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی۔ ادیبوں اور شاعروں کو پرانی ڈگر سے ہٹا کر نئی راہ پر چلایا اور اردو ادب اور مسلمانوں کی زندگی میں ایک حرکت پیدا کی۔ سر سید نے رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے سے اردو میں

مذہب ، فلسفہ ، سائنس ، آرٹ اور ادب کے عنوان پر عمدہ مضامین لکھے اور قومی اصلاح کا کام کیا ۔

سر سید نے جو اردو ادب کا سکول قائم کیا تھا وہ دراصل دور جدید کی طرف ایک جرأت مندانہ قدم تھا اور ایک نئی راہ کی تلاش تھی۔ سر سید کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے ۔ سر سید کے یہاں دوسری سب سے بڑی چیز ظرافت کی چاشنی ہے جس کی وجہ سے ان کے مضامین کا مطالعہ گراں نہیں گزرتا۔ تاریخی ، علمی ، اخلاقی ، سوشل ، پولیٹیکل غرض کہ ہر طرح کے مضامین میں حسب ضرورت شگفتہ ظرافت نظر آتی ہے ۔

سر سید بہ یک وقت قانون دان ، مصلح قوم ، مدرِّس اور مصنف تھے ۔ اخباری اردو کو جو آج فروغ ہے وہ سر سید ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے ۔ نواب محسن الملک ، نواب وقارالملک ، مولوی چراغ علی جیسی شخصیتیں سر سید ہی کی وجہ سے میدان میں آئیں اور انھوں نے اتنی شہرت حاصل کی ۔

سر سید کی مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :

آثارالصنادید ، اسباب بغاوت ہند ، خطبات احمدیہ وغیرہ جو اپنی مثال آپ ہیں ۔

ادبی دنیا میں سر سید نے جو اصلاحیں پیش کیں اور ادبی نظریوں کو جو نیا پن بخشا ان کے علاوہ انھوں نے وہ تحریک شروع کی جس کی موجودہ شکل آج ہمیں پاکستان کی صورت میں نظر آتی ہے ۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا تخیّل مسلمانوں کی پہلی بیداری تھی اور آزادی حاصل کرنا اس بیداری کی دوسری اور اہم کڑی تھی ۔ دراصل علی گڑھ کالج کی حیثیت محض ایک مقامی کالج کی نہ تھی بلکہ وہ ایک تحریک تھی جس سے متأثّر ہو کر تمام اطراف ہند میں مسلمانوں کے مختلف ادارے کھل گئے ۔

سر سید کے طرز تحریر کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی ہے ۔ وہ حسین الفاظ اور تراکیب کے غیر ضروری طول سے اپنی عبارت کو پھیلا کر لکھنا پسند نہیں کرتے ۔ اس سادگی کے ساتھ منطقیانہ استدلال کو شامل کر لیا جائے تو گویا سر سید کا اسلوب پورا نکھر آتا ہے ۔ لیکن یہ سادگی عبارت کو سپاٹ نہیں بناتی ، اس میں زور پورا موجود رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عبارت سادہ ہونے کے باوجود دلآویز معلوم ہوتی ہے ۔

اپنی مدد آپ

"خدا اُن کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں ۔"

یہ ایک عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے ۔ اس چھوٹے سے فقرے میں انسانوں کا اور قوموں اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے ۔ ایک شخص میں اپنی آپ مدد کرنے کا جوش اس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جب کہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے ۔ جب کہ کسی شخص کے لیے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اس شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش اپنی آپ مدد کرنے کا کم ہو جاتا ہے اور ضرورت اپنی آپ مدد کرنے کی اس کے دل سے مٹ جاتی ہے اور اسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے اور اسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے اور جب کہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے غیرت اور بے عزت

ہو جاتی ہے ۔ آدمی جس قدر کہ دوسرے پر بھروسا کرتے جاتے ہیں ، خواہ اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کا بھروسا گورنمنٹ ہی پر کیوں نہ کریں (یہ امر بدیہی اور لابُدی ہے) کہ وہ اسی قدر بے عزت ہوتے جاتے ہیں ۔ اے میرے ہم وطن بھائیو ! کیا تمھارا یہی حال نہیں ؟

ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے ۔ یورپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے یہ سمجھتے تھے کہ ایک عمدہ انتظام قوم کی عزت، بھلائی و خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے، خواہ وہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو یا گورنمنٹ کا اور یہی سبب ہے کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی و بہبودی کا خیال کر کر ، اُن کا درجہ سب سے اعلیٰ اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے ، مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں ۔ ایک شخص ، فرض کرو کہ وہ لندن میں آئرلینڈ کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر کیوں نہ ہو جائے ، یا کلکتے میں ویسرائے اور گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستان کا ممبر ہی ہو کر کیوں نہ بیٹھ جائے ، قومی عزت اور قومی بھلائی اور قومی ترقی کیا کر سکتا ہے ؟ برس دو برس میں کسی بات پر ووٹ دینے سے ، گو وہ کیسی ہی ایمانداری اور انصاف سے کیوں نہ دیا ہو ، قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے ؟ بلکہ خود اس کے چال چلن پر ، اس کے برتاؤ پر بھی اس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا ، تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے ۔ ہاں یہ بات بے شبہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی ۔ مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قُویٰ کی تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے ۔ یہ بات روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت مُثبَت اور معمل

ہونے کے زیادہ تر منفی اور ضایع ہے اور وہ فرض جان اور مال اور آزادی کی حفاظت ہے ۔ جب کہ قانون کا عمل درآمد دانشمندی سے ہوتا ہے تو آدمی اپنی حسی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطرہ حظ اٹھا سکتا ہے ۔ جس قدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی ہے اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے ۔ مگر کوئی قانون گو وہ کیسا ہی ابھارنے والا کیوں نہ ہو سست آدمی کو محنتی نہیں بنا سکتا ۔ فضول خرچ کو کفایت شعاری نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ قومی ترقی ، قومی عزت ، قومی اصلاح، عمدہ عادتوں، عمدہ چال چلن، عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے نہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ اعلیٰ درجے حاصل کرنے سے ۔

پرانے لوگوں کا مقولہ ہے کہ "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِمْ" ۔ اگر اس مقولے میں 'الناس' سے چند خاص آدمی مراد لیے جاویں جو بادشاہ کے مقرب ہوتے ہیں تو یہ مقولہ صحیح ہے اور اگر یہ معنی لیے جاویں کہ رعایا اپنی گورنمنٹ کی سی ہو جاتی ہے تو یہ مقولہ صحیح نہیں ہے ۔ رعایا کبھی گورنمنٹ کے رنگ میں نہیں رنگی جاتی ، بلکہ گورنمنٹ رعایا کا سا رنگ بدلتی جاتی ہے ۔ نہایت ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً ان لوگوں کا ، جن پر وہ حکومت کرتی ہے ۔ عکس ہوتی ہے جو رنگ ان کا ہوتا ہے اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و شائستگی میں آگے بڑھی ہوتی ہے رعایا اس کو زبردستی پیچھے کھینچ لاتی ہے اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کمتر اور تہذیب و شائستگی میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کھنچ جاتی ہے ۔ تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان و انگلستان کا یہی حال ہوا ۔ انگلستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں اس زمانہ کی گورنمنٹ سے آگے بڑھی ہوئی تھی ۔ اس نے زبردستی سے گورنمنٹ کو اپنے ساتھ آگے کھینچ لیا ۔ ہندوستان کی رعایا

تہذیب و شائستگی میں موجودہ گورنمنٹ سے کوسوں پیچھے پڑی ہے۔ گورنمنٹ کتنا بھی کھینچنا چاہتی ہے مگر وہ نہیں کھنچتی ، بلکہ زبردستی گورنمنٹ کو پیچھے کھینچ لاتی ہے -

یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کے چال چلن کا ہوتا ہے یقینی اسی کے موافق اس کے قانون اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے ۔ جس طرح کہ پانی خود اپنی پنسال میں آ جاتا ہے ، اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے اور جاہل و خراب و ناتربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکھڑ حکومت کرنی پڑتی ہے -

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن ، اخلاق و عادات، تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے ۔ کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت ان مردوں ، عورتوں و بچوں کی شخصی ترقی ہے جن سے وہ قوم بنی ہے ۔ قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی محنت ، شخصی عزت ، شخصی ایمانداری ، شخصی ہمدردی کا ۔ اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی مستی، شخصی بے عزتی ، شخصی بے ایمانی ، شخصی خود غرضی اور شخصی برائیوں کا ۔ بد تہذیبی و بد چلنی جو اخلاق، تمدنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے ، در حقیقت وہ خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے ۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور و شور سے پیدا ہو جاویں گی ، جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کو ترقی نہ دی جاوے -

اے میرے عزیز ہموطنو ! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اس کا نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو ، کہ تمھاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کسی طرح پر عمدہ ہو تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو ۔ کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا ، بات چیت کا ، وضع و لباس کا ، سیر سپاٹے کا ۔ شغل اشغال کا تمھاری اولاد کے لیے ہے اس سے ان کی شخصی چال چلن ، اخلاق و عادات ، نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے ؟ حاشا و کلاّ !

جب کہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کر سکتی ہے ، تو اس بات کی امید لیے بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے ، کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے ۔ وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے جس کو ایک ناخدا ترس نے جو اس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے ، خرید لیا ہے ، یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے ، بلکہ درحقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے جو بد اخلاق ، خود غرضی ، جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پروا ہے ۔ وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں وہ بیرونی زوروں سے یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو ۔ اصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح و ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر ہے ، اس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا ۔ گو کیسی ہی عمدہ تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں ، وہ تبدیلیاں فانوسِ خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں ، جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں ۔ مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں ۔

مستقل اور مضبوط آزادی ، سچی عزت ، اصلی ترقی ، شخصی چال چلن عمدہ ہونے پر منحصر ہے اور وہی شخص چال چلن ، معاشرت و تمدن کا بڑا محافظ اور وہی شخصی چال چلن اور قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے ۔ جان سٹوارٹ مِل (John Stuart Mill) جو اسی زمانہ میں ایک بہت بڑا دانا حکیم گزرا ہے ، اس کا قول ہے کہ "ظالم اور خود مختار حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے پیدا نہیں کر سکتی اگر اس کی رعایا میں شخصی اصلاح اور شخصی ترقی موجود ہے اور جو چیز کہ شخصی اصلاح و شخصی ترقی کو دبا دیتی ہے در حقیقت وہی شے اس کے لیے ظالم و خود مختار گورنمنٹ ہے ۔ پھر اُس شے کو جس نام سے چاہو پکارو"۔ اس مقولے پر میں اس قدر اور زیادہ کرتا ہوں کہ جہاں شخصی اصلاح و شخصی ترقی مٹ گئی ہے یا دب گئی ہے ، وہاں کیسی ہی آزاد اور عمدہ گورنمنٹ کیوں نہ قائم کی جاوے ، وہ کچھ بھی عمدہ نتیجے پیدا نہیں کر سکتی اور اس اپنے مقولے کی تصدیق کو ہندوستان کی اور خصوصاً یہاں کے مسلمانوں کی حالت کی مثال پیش کرتا ہوں ۔ اے مسلمان بھائیو ! کیا تمھاری یہی حالت نہیں ہے ؟ تم نے اس عمدہ گورنمنٹ سے جو تم پر حکومت کر رہی ہے ، کیا فائدہ اٹھایا ہے ؟ تمھاری آزادی کے محفوظ رکھنے کا تم کو کیا نتیجہ حاصل ہوا ہے ؟ ہیچ ہیچ ہیچ —— ! اس کا سبب یہی ہے کہ تم میں آپ اپنی مدد کرنے کا جذبہ نہیں ہے ۔

نذیر احمد دہلوی

(۱۸۳۱ء - ۱۹۱۲ء)

مولوی نذیر احمد ۱۸۳۱ء میں ضلع بجنور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ نو برس تک اپنے والد سعادت علی سے فیض حاصل کیا۔ پھر دہلی آ کر تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی کالج میں عربی ادب، فلسفہ اور ریاضی میں کمال حاصل کیا اور پنجاب میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ علم سے محبت کا یہ عالم تھا کہ الہ آباد کے قیام کے زمانے میں ازخود انگریزی سیکھی اور تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا۔ مرآۃالعروس لکھنے کے صلے میں انگریزی سرکار نے ایک ہزار روپیہ نقد اور ایک گھڑی بطور انعام دیا۔ ان کی قابلیت کا شہرہ سن کر سر سالار جنگ نے اُن کو اپنے یہاں حیدرآباد بلا لیا۔ یہاں انھوں نے ایک تعلیمی نصاب تیار کیا۔

مولانا کی قابلیت کا اندازہ اُن کی تحریر کو دیکھ کر ہوتا ہے جس میں انھوں نے عربی الفاظ کو اپنے اردو مضامین میں اس طرح سمو کر رکھ دیا ہے کہ ذہن کوئی بھی اونچ نیچ محسوس نہیں کر پاتا۔ عورتوں کے لیے جو کتابیں لکھی ہیں ان کی زبان بڑی دلآویز اور لال قلعے کی ٹکسالی زبان ہے۔ تحریر پاکیزہ ظرافت اور متانت و سنجیدگی کا مرقع ہے۔ اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے منطقیانہ دلائل بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ اس لیے اُن کا لہجہ مؤثر ہے۔ اپنی ان ہی صفات کی وجہ سے پنجاب کے ایک معمولی مدرّس سے

ترقی کر کے حیدرآباد کی ریاست میں ریونیو بورڈ کی ممبری کے عہدے پر پہنچ گئے ۱۸۹۷ء میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب ملا - ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی - او - ایل - اور اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل - ایل - ڈی کی اعزازی ڈگری دی -

آپ نے جن کتابوں کا اردو ادب میں اضافہ کیا ، وہ مندرجۂ ذیل ہیں :

ترجمۂ قرآن شریف ، مرآۃالعروس ، توبۃالنصوح ، ابن الوقت ، رویائے صادقہ ، بنات النعش ، منتخب الحکایات ، الحقوق و الفرائض اور تعزیرات ہند وغیرہ -

مولانا کی ادبی خدمات کے علاوہ اور بھی بہت سی خدمات قابل ذکر ہیں - مثلاً آپ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی اور علی گڑھ تحریک کے سرگرم کارکن اور حامی تھے - آپ اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے ادب کو برائے زندگی پیش کیا ہے اور طوطا مینا کی کہانیوں کے دائرے سے نکل کر اصلاح معاشرت اور اصلاحِ اخلاق کے تانے بانے سے اپنے ناول مکمل کیے - انگریزی قوانین اور قرآن کے اردو میں ترجمے کر کے بڑی خدمت کی - مولانا کی یہ خدمات کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں -

نذیر احمد با محاورہ اردو لکھنے کے بادشاہ ہیں - لیکن کبھی کبھی اس شوق میں حد سے بڑھ جاتے ہیں اور بعض موقعوں پر ان کی تحریروں میں عامیانہ محاورے بھی راہ پا جاتے ہیں - ایک دوسرا عیب بقول مرزا فرحت اللہ بیگ ، یہ ہے کہ وہ اپنی اردو میں عربی فارسی کے روڑے ہی نہیں بچھاتے پہاڑ کھڑے کر دیتے ہیں - ان کی ساری تحریریں مقصدی ہوتی ہیں - لیکن جہاں اس مقصد کے لیے وہ طویل وعظ کہنے لگتے ہیں وہاں اکثر پڑھنے والا اکتا جاتا ہے -

---

سوکن کا راز

سچ ہے غیرت بیگم کے ساتھ مبتلا کے دل نہ ملنے کا بڑا سبب تھا مبتلا کی حسن پرستی اور آوارگی۔ مگر اتنا قصور تو غیرت بیگم کا بھی ضرور تھا کہ اس نے مبتلا کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ وہ سمجھی، جیسا کہ گھر کی بیبیاں اکثر سمجھا کرتی ہیں، کہ جب ماں باپ نے میاں کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دیا تو بس مجھے اپنی طرف سے کچھ کرنا ہی نہیں۔ اب میاں کا کام ہے کما کر لائے اور مجھے کھلائے پہنائے۔ میری خاطر داری و مدارات کرے۔ لیکن اس کو اتنی بات اور سمجھنی چاہیے تھی کہ کھلانا پہنانا خاطر داری سب چیزیں متفرّع نہیں۔ رغبت کرنا میاں کا کام ہے اور دلانا بی بی کا۔ رہی یہ بات کہ بی بی کیوں کر میاں کو رغبت دلائے؟ اس کے لیے کوئی ایسا قاعدہ نہیں کہ ہر جگہ چل سکے۔ کیونکہ ہر ایک کا مزاج مختلف اور ہر شخص کی رغبت جدا۔ لیکن بی بی اگر چاہے تو اس کو اپنے میاں کی رغبت کا معلوم کر لینا کیا مشکل ہے؟ مثلاً غیرت بیگم نے اتنی ہی کر کے دکھائی ہوتی۔ گھر کی صفائی ستھرائی، سازو سامان کی درستی، انتظام کی خوبی، یہ چیزیں بھی داخل حسن ہیں اور طبیعت میں سلیقہ ہو تو ہاتھ پاؤں کے اور غیرت بیگم کی تو زبان کے ہلانے سے سب کچھ ہو سکتا تھا۔ مگر اس نے ان چیزوں کی طرف تو کبھی بھول کر بھی توجّہ نہ کی۔ مردانے مکان میں میاں کی بیٹھک تھی، اسی کو دیکھ کر مُتنَبِّہ ہوئی ہوتی۔ اس کا اپنا کیا حال تھا کہ میاں کو جو شروع شروع میں اپنی طرف سے بےرُخ پایا تو تین تین چار چار دن سر میں کنگھی ندارد۔ لونڈیوں کے تقاضے سے دسویں پندرھویں سر دھویا ہے تو بالوں میں تیل کی خبر نہیں۔ پھولے پھولے روکھے بال، دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کڑک ناتھ کڑک مرغی

بیٹھی ہے ۔ آنکھوں میں سرمہ نہیں ، ہاتھ پاؤں میں مہندی نہیں۔ پھول نہیں ، عطر نہیں ۔ گوٹا نہیں ، کناری نہیں ، غرض عورتوں کے سنگار کی کوئی چیز نہیں ، مبتلا کو پہلے استکراہ تھا ۔ غیرت بیگم کی بے تدبیریوں نے استکراہ کو نفرت اور نفرت کو ضد اور ضد کو چڑ بنا دیا ۔ مبتلا جب ہریالی سے نکاح کر کے اسے ماما ظاہر کر کے گھر میں لایا ، تو غیرت بیگم کے گھر میں ایک منتظم عورت کی سخت ضرورت ہریالی کے پاؤں جم جانے کا سبب ہوئی ۔

ہریالی نے جو صبح اٹھ کر دیکھا تو تمام اسباب مولی گاجر کی طرح سارے گھر میں پھیلا پڑا ہے ۔ اس نے خود کھڑے ہو کر جہاں جہاں فرش تھا اٹھوا کر دالانوں میں ، کوٹھریوں میں ، صحنچیوں میں ، دروں میں ، باورچی خانے میں ، یہاں تک کہ ڈیوڑھی میں جھاڑو دلوائی ۔ ٹو کروں نہیں چھکڑوں کوڑا نکلا ۔ اور بہت سی گری پڑی چیزیں ملیں جن کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر صبر کر کے بیٹھ رہے تھے اور سمجھ لیا تھا کہ کھوئی گئیں ۔ مٹی کی تہیں جمتے، جمتے دالان کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اصلی رنگت پہچان نہ پڑتی تھی۔ جھڑوایا تو منوں گرد ۔ دروازوں میں جو چلمنیں پردے بندھے تھے الٹے سیدھے کا تو کس کو امتیاز تھا ۔ کوئی دھر تک بندھا ہے ، تو کوئی آدھے در میں پڑا لٹک رہا ہے اور کسی کا لپیٹ ایک طرف جھک کر نکل پڑا ہے ، تو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اس کو برابر کر دیں ۔ بلکہ کئی پردوں میں سے تو فاختاؤں ، جنگلی کبوتروں اور گلہریوں کے گھونسلے نکلے ۔ گھر میں تخت بہتیرے تھے ، مگر بیٹھنے کے دالانوں میں زمین پر بورے بچھے ہیں ۔ بوریوں پر دریاں دریوں پر چاندنیاں ۔ لونڈیاں اور مامائیں ہیں کہ بے تکلف مٹی کیچڑ کے ننگے ننگے پاؤں چاندنیوں پر لیے پھرتی ہیں اور چاندنیوں کا مارے دھبوں اور چکتوں کے یہ حال ہو رہا ہے کہ آنکھ اٹھا کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا ۔ اب چاندنیوں اور تکیوں کے غلاف اور پلنگوں کی

چادروں کی ڈھنڈیا پڑی تو جتنی کھڑی تھیں ایک ایک کا منہ دیکھتی تھی ، اور ایک ایک پر ٹالتی تھی ۔ آخر بڑی مشکل سے دو چاندنیاں اناج کی کوٹھڑی میں مچان پر پڑی ملیں ، جن میں چوہوں نے کاٹ کاٹ کر بغارے ڈال دیے تھے ، اور ایک میں کسی ماما نے سوکھے ٹکڑے باندھ کر کھونٹی پر لٹکا رکھے تھے ۔ اس جستجو میں معلوم ہوا کہ کئی چاندنیاں باہر سائیس کے پاس ہیں اور وہ اوڑھ کر سوتا ہے ۔ دو تین چاندنیاں کسی کو مانگے دی تھیں ، وہ واپس نہیں آئیں ۔ میلی چاندنیوں کا ایک ڈھیر غسل خانے میں پڑا ملا ۔ غرض اس وقت تو ہریالی نے کسی طرح گونتھ گونتھ کر فرش پورا کیا ۔ پلنگ سب کے سب جھولا ہو رہے تھے ۔ ان کو کسوا کر اجلی چادریں بچھوا دیں ۔ تکیوں کے غلاف بدلے ، اجلا دسترخوان نکلوا دیا ۔ ہریالی کا انتظام دیکھ کر غیرت بیگم کا پھوہڑ پن مبتلا کے دل میں اور بیٹھتا چلا جاتا تھا ۔ معلوم نہیں مبتلا کو کب تک ہریالی کا اس نمط پر رکھنا منظور تھا کہ ایک دن گھر میں باہر سے یہ اطلاع پہنچی کہ ایک بوڑھی عورت نوکری کی جستجو میں آئی ہے ، اگر حکم ہو اندر بھیج دیں ۔ انتظام خانہ داری تو سب ہریالی کے ہاتھ میں تھا ۔ غیرت بیگم نے ہریالی سے پچھوایا ۔ ہریالی کسی کوٹھڑی میں خدا جانے کس کام میں مصروف تھی ۔ اس نے وہیں سے کہا کیا مضائقہ ۔ غرض وہ عورت اندر آ کر سیدھی غیرت بیگم کے پاس جا کر بیٹھی ، اور لگی کہنے "میں تو ہریالی بیگم کے پاس آئی ہوں جن کو تمھارے میاں نکاح پڑھوا کر نکال لائے ہیں ۔ مدت سے میں ان کے یہاں اوپر کے کام پر نوکر تھی ۔ بیگم کو تو نکلے ہوئے تین مہینے ہونے کو آئے ہیں ۔ میں ان کی خالہ کے پاس رہی ۔ آج آٹھواں دن ہے کہ وہ بھی لکھنٔو سدھاریں ۔ میں نے کہا ۔ چلوں ، اگر بیگم پھر رکھ لیں تو میں ان کے مزاج سے واقف ہوں ۔ وہ مجھ کو جانتی پہچانتی ہیں ۔ انجان کی تابعداری کرنی کیا ضرور ؟ کیا وہ اس

گھر میں نہیں رہتیں؟"

غیرت بیگم نے اشارہ کر کے بتایا کہ تم جن کے پاس آئی ہو وہ سامنے والی کوٹھڑی میں ہیں۔ وہ عورت اٹھ کر کوٹھڑی کی طرف چلی۔ دروازے تک پہنچی تھی کہ اتنے میں غیرت بیگم بے خود ہو کر بگولے کی طرح آئی۔ وہ عورت ابھی ہریالی سے بات بھی نہیں کرنے پائی تھی کہ اس نے پہنچ کر بیچاری بڑھیا کو اوندھے منہ ہریالی پر دھکیل دیا اور کہا: "تم نے دیکھا؟ یہ ہریالی نہیں گھر والی ہے۔ یہ بی بی ہے، یہ میری سوکن ہے، میں رانڈ ہوں، یہ سہاگن ہے۔ میں لونڈی ہوں، یہ بیگم ہے۔ میں چڑیل ہوں، یہ حور ہے۔ یہ میاں کی لاڈو ہے، یہ میاں کی چہیتی ہے، یہ میاں کے کلیجے کی ٹھنڈک ہے۔" یہ کہتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ہزارہا گالیاں اور سیکڑوں کوسنے اور دوہتھڑ تھا کہ باری باری سے اس شامت کی ماری بڑھیا اور ہریالی پر، اور اپنے آپ پر بھی اس زور سے پڑ رہا تھا کہ گویا مزدور سڑک کوٹ رہے ہیں۔ گھر میں بہتیری لونڈیاں اور مامائیں تھیں، مگر سیدانی کا جلال دیکھ کر کسی کی ہمت نہ پڑ سکی کہ کوٹھڑی کی طرف رخ کرے۔ سب کی سب بد حواس ہو کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ہمسائے کی عورتیں کوئی کھڑکیوں میں سے، کوئی دیوار پر سے کھڑی جھانکتی تھیں، پر کسی سے اتنا نہ ہو سکتا تھا کہ گھر کے اندر قدم رکھے۔ مبتلا کو دکھلوایا تو اس وقت کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مردانے میں ٹڑروں ٹوں اکیلا وفادار۔ اس کو اور تو کچھ نہ سوجھی، گھوڑا تو دروازے پر بندھا ہوا تھا ہی، منہ میں لگام دے، ننگی پیٹھ پر سوار ہو، بگٹٹ سیدھا پہنچا کچہری میں سید ناظر کے پاس۔ ناظر اسی گھوڑے پر چڑھ، دھم سے آ موجود ہوئے اور اتفاق سے سید حاضر بھی کسی ضرورت سے دو تین دن کے آئے ہوئے تھے۔ کچہری سے ان کے پاس بھی آدمی دوڑایا کہ آپ

بھی جلدی آپڑے۔ غرض سید حاضر اور مبتلا بھی آگے پیچھے گئے۔ غیرت بیگم سید ناظر کے آنے سے پہلے کھڑی اور پڑی اتنا پیٹی کہ آخر اُسے غش آ گیا۔ ناظر جس وقت پہنچے تو وہ بالکل بے ہوش پڑی تھی۔ ناظر نے آنے کے ساتھ ہی اس کو ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کیں۔ سید حاضر اور مبتلا دونوں آئے۔ اس کے بہت دیر بعد غیرت بیگم کو ہوش آیا۔ سب سے زیادہ چوٹ غیرت بیگم ہی کو لگی تھی کہ اس نے پیٹ پیٹ کر اپنا سارا بدن چوڑی کی طرح نیلا کر لیا تھا۔ ہریالی کی بھی کندی خوب ہوئی مگر اس کو گجی مار لگی تھی۔ بڑھیا اس وقت ہریالی اور کوٹھڑی کی دیوار کے بیچ میں آ کر بچ گئی۔ مگر وہی مثل کہ مرغی کو تکلے ہی کا گھاؤ بہت ہوتا ہے۔ دو تین دوہتھڑ جو اس پر جمتے ہوئے بیٹھ گئے وہ اتنے میں ہی سسکیاں لینے لگی۔ اگر تھانہ ہو تو کوتوالی والے کیا اس مقدمے کو بے چالان کیے رہیں ؟ توبہ ! اور اگر حاضر نہ ہو تو ناظر اور مبتلا آپس میں کٹ مریں۔ پانچ چھ دن تو بیماروں کی دوا دارو ہوتی رہی۔ باندھنے کے موقع پر آمہ ہلدی کا حلوہ پکا پکا کر باندھا۔ سینکنے کی جگہ پرانے روہڑ اور ریہر سے سینکا۔ پھٹکری کو دودھ میں جوش دے کر پلایا۔ اب کیا باقی رہ گیا تھا کہ جس کے لیے مبتلا کو ہریالی سے ملنے میں تأمُّل ہوتا ؟ ہریالی اور مبتلا کی مصلحت گٹھی کہ اب گھر میں برابری سے بلکہ مقابلے سے رہنا چاہیے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

(۱۸۶۹ء - ۱۹۶۱ء)

مولوی عبدالحق ہاپڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ سے بی - اے کیا - کچھ دن صوبۂ پنجاب میں رہنے کے بعد ریاست حیدر آباد میں تعلیمی محکمے میں ملازم ہو کر ترقی کرتے رہے - اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہو گئے ، پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو ہو گئے - انجمن ترقیٔ اردو کے روح و رواں تھے - ۱۹۳۷ء میں مسلم یونیورسٹی سے ان کو ڈی - لٹ کی اعزازی ڈگری عطا ہوئی -

مولوی صاحب کو اردو زبان سے شروع ہی سے ایک خاص اُنسیّت تھی - اس کی خاطر اُنھوں نے بڑی مشقّتیں اٹھائیں اور اردو کی بے پناہ خدمت کی - چونکہ انجمن ترقیِ اردو کے سیکریٹری تھے اس لیے انجمن کی ہر کتاب پر باقاعدہ مقدمات لکھے اور بے لاگ تبصرہ کیا - اس سے مولوی صاحب کی اعلیٰ علمی قابلیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے -

اُن کی تحریروں کے علاوہ ایک اور کارنامہ اُن کے لیے مایۂ ناز ہے ، وہ انگریزی اردو ڈکشنری کا مرتب کرانا اور اردو قواعد کو انگریزی قواعد کے طرز پر لکھنا ہے - اردو ادب میں مولوی عبدالحق صاحب ایک نقاد ، مقدمہ نگار اور وسیع النظر انشاء پرداز تھے - قدیم اردو کے بارے میں صحیح اور وسیع معلومات فراہم کرنا ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے -

مولوی صاحب کی طرز تحریر میں بے ساختگی اور ستھرا پن ہے - ہندی الفاظ بھی جا بجا اردو میں استعمال کرتے ہیں ، مگر بڑی خوب صورتی سے - اُن کی تحریروں میں بول چال کی زبان نظر آتی ہے اور حالی کی طرح ایک پر خلوص انداز ملتا ہے - مگر حالی کی طرح اُن کے یہاں ظرافت کا فقدان نہیں ہے - اس سے اُن کی تحریروں میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے -

---

گدڑی کا لال - نور خان

لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں - نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں - میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں - اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں ، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے اور انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے -

پھول میں گر آن ہے ، کانٹے میں بھی اک شان ہے

نور خان مرحوم کنٹنجنٹ کے اول رسالے میں سپاہی سے بھرتی ہوئے - انگریزی افواج میں حیدر آباد کی کنٹنجنٹ خاص حیثیت اور امتیاز رکھتی تھی - ہر شخص اس میں بھرتی نہیں ہو سکتا تھا - بہت دیکھ بھال ہوتی تھی - بعض اوقات نسب نامے تک دیکھے جاتے تھے ، تب کہیں جا کر ملازمت ملتی تھی - کوشش یہ ہوتی تھی کہ صرف شرفاء اس میں بھرتی کیے جائیں - یہی وجہ تھی کہ

کنٹنجنٹ والے عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے - لیکن بعد میں یہ
قید بھی اٹھ گئی اور اس میں اور انگریزوں کی دوسری فوجوں میں
کوئی فرق نہ رہا - پہلے زمانہ میں سپہ گری بہت معزز پیشہ سمجھا
جاتا تھا - اب اس میں اور دوسرے پیشوں کا کوئی فرق نہیں رہا -
بات یہ ہے کہ اشراف کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے - اس میں ایک
آن بان اور خود داری ہوتی ہے ، جو بہادری اور انسانیت کا اصل
جوہر ہے - ہر کوئی اس کی قدر نہیں کر سکتا - اس لیے شریف
روتا اور ذلیل ہنستا ہے - یہ جتنا پھیلتا ہے وہ اتنا ہی سکڑتا ہے -
کرنل نواب افسرالملک بہادر بھی نور خان مرحوم ہی کے رسالے
کے ہیں - کنٹنجنٹ کے بہت سے لوگ اکثر تو کرنل صاحب موصوف
کے توسط سے اور بعض اور ذرایع سے حیدر آباد ریاست میں آ کر
ملازم ہو گئے - ان میں سے بہت سے تو اب کرنل ، میجر ، کپتان
اور بڑے بڑے عہدے دار ہیں - لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کوئی
نور خان بھی ہے ؟

اول رسالے کے بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ خان صاحب
مرحوم فوج میں بھی بڑی آن بان سے رہے - سچائی اور فرض شناسی
میں مشہور تھے - یہ ڈرل انسٹرکٹر تھے یعنی گوروں کو جو نئے
بھرتی ہو کر آتے تھے ڈرل سکھاتے تھے - اس لیے اکثر گورے
افسروں سے واقف تھے - وہ بڑے شہسوار تھے - گھوڑے کو خوب
پہچانتے تھے - بڑے بڑے سرکش گھوڑے جو پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے
دیتے تھے ، انھوں نے درست کیے - گھوڑے کے سدھانے اور پھیرنے
میں انھیں کمال تھا - چونکہ بدن کے چھریرے اور ہلکے پھلکے
تھے ، گھڑ دوڑوں میں گھوڑے دوڑاتے تھے اور اکثر شرطیں جیتتے
تھے - اُن کے افسر اُن کی مستعدی ، خوش تدبیری اور سلیقے سے بہت
خوش تھے - لیکن کھرے پن سے وہ اکثر اوقات ناراض ہو جاتے
تھے - ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اُن کے کمانڈنگ افسر نے کسی

بات پر خفا ہو کر ، جیسا کہ انگریزوں کا عام قاعدہ ہے ، انھیں ڈیم فول کہ دیا - یہ تو گالی تھی ، خان صاحب کسی کی ترچھی نظر کے بھی روادار نہ تھے - انھوں نے فوراً رپورٹ کر دی - لوگوں نے چاہا کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے اور آگے نہ بڑھے ، مگر خان صاحب نے ایک نہ سُنی - معاملے نے طول کھینچا اور جنرل صاحب کو لکھا گیا - کمانڈنگ افسر کا کورٹ مارشل ہوا اور اس سے کہا گیا کہ خان صاحب سے معافی مانگے - ہر چند اس نے بچنا چاہا مگر پیش نہ گئی اور مجبوراً اسے معافی مانگنی پڑی - ایسی خود داری اور نازک مزاجی پر ترقی کی توقع رکھنا عبث ہے - نتیجہ یہ ہوا کہ دفعداری سے آگے نہ بڑھے -

اچھے برے ہر قوم میں ہوتے ہیں - شریف افسر خان صاحب کی سچائی ، دیانت اور جفا کشی کی بہت قدر کرتے تھے اور ان کو اپنی اردل میں رکھتے تھے مگر بعض ایسے بھی تھے جن کے سر میں خنّاس سمایا ہوا تھا - انھیں خان صاحب کے یہ ڈھنگ پسند نہ تھے اور ہمیشہ اُن کے نقصان کے درپے رہتے تھے - ایسے لوگ اپنی اور اپنی قوم والوں کی خود داری کو تو جو ہو شرافت سمجھتے ہیں ، لیکن اگر یہی جوہر کسی دیسی میں ہوتا ہے تو اسے غرور اور گستاخی پر محمول کرتے ہیں - تاہم ان کے بعض انگریز افسر ان پر بہت مہربان تھے ، خاص کر کرنل فرن ٹین اُن پر بڑی عنایت کرتے تھے اور خان صاحب پر اس قدر اعتبار تھا کہ شاید ہی کسی اور پر ہو - جب کرنل صاحب نے اپنی خدمت سے استعفا دیا تو اپنا تمام مال و اسباب اور سامان جو ہزارہا روپے کا تھا ، خان صاحب کے سپرد کر گئے - یہ اس انگریز افسروں کو بہت ناگوار ہوا - اس وقت کے کمانڈنگ افسر سے نہ رہا گیا - اس نے کرنل موصوف کو خط لکھا کہ "آپ نے ہم پر اعتبار نہ کیا اور ایک دیسی دفعدار کو اپنا قیمتی سامان حوالے کر گئے - اگر آپ یہ سامان

ہمارے سپرد کر جاتے تو اسے اچھے داموں میں فروخت کر کے قیمت آپ کے پاس بھیج دیتے ۔ اب بھی اگر آپ لکھیں تو انتظام ہو سکتا ہے ۔" کرنل نے جواب دیا : "مجھے نور خان پر تمام انگریز افسروں سے زیادہ اعتماد ہے ۔ آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ، اس پر یہ لوگ اور برہم ہوئے ۔ ایک بار کمانڈنگ افسر یہ سامان دیکھنے آیا اور کہنے لگا کہ فلاں فلاں چیز میم صاحب نے ہمارے ہاں سے منگائی تھی ، چلتے وقت واپس کرنی بھول گئے ۔ تم یہ سب چیزیں ہمارے بنگلے پر بھیج دو ۔ خان صاحب نے کہا ، میں ایک چیز بھی نہیں دوں گا ۔ آپ کرنل صاحب کو لکھیے ۔ وہ مجھے لکھیں گے تو مجھے دینے میں کچھ عذر نہ ہوگا ۔ وہ اس جواب پر بہت بگڑا اور کہنے لگا ، "تم ہمیں جھوٹا سمجھتے ہو؟" خان صاحب نے کہا ، "میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا ۔ یہ سامان میرے پاس امانت ہے اور میں کسی کو اِس میں سے ایک تنکا بھی دینے کا مجاز نہیں ۔" غرض وہ بڑبڑاتا ہوا ، کھسیانا ہو کر چلا گیا ۔ خان صاحب نے ایک انگریز محرّر سے اس سامان کی مکمل فہرست تیار کرائی اور کچھ خود خرید کر کچھ نیلام کے ذریعے سے بیچ کر ساری رقم کرنل صاحب کو بھیج دی ۔

نہ معلوم یہی کرنل تھا یا کوئی دوسرا افسر ، جب ملازمت سے قطع تعلق کر کے جانے لگا تو اس نے ایک سونے کی گھڑی ، ایک عمدہ بندوق اور پانچ سو روپے نقد خان صاحب کو بطور انعام یا شکرانے کے دیے ۔ خان صاحب نے لینے سے انکار کر دیا ۔ کرنل اور اس کی بیوی نے بہتیرا اصرار کیا مگر انھوں نے سوائے ایک بندوق کے دوسری چیز نہ لی اور باقی سب چیزیں واپس کر دیں ۔

کرنل سٹوارٹ بھی جو ہنگولی چھاؤنی کے کمانڈنگ افسر تھے ان پر بہت مہربان تھے ۔ رسالے کے شریف انگریز ان سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے بعد انگریز افسر تم کو بہت نقصان پہنچائیں گے ۔

وہ اُن کی روش سے خوش نہ تھے اور خوش کیوں کر ہوتے۔ خوشامد سے انھیں چڑ تھی اور غلامانہ اطاعت آتی نہیں تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اپنے کرنل کے ہاں کھڑے تھے کہ ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار آیا۔ گھوڑے سے اتر کر اس نے خان صاحب سے کہا کہ گھوڑا پکڑو۔ انھوں نے کہا، ''میں سائیس نہیں ہوں۔'' اس نے ایسا جواب کاہے کو سنا تھا۔ بہت چیں بہ جبیں ہوا مگر کیا کرتا۔ آخر باگ ایک درخت سے اٹکا کر اندر چلا گیا۔ اب نہ معلوم یہ خان صاحب کی شرارت تھی یا اتفاق تھا کہ باگ شاخ میں سے نکل گئی اور گھوڑا بھاگ نکلا۔ اب جو صاحب باہر آئے تو گھوڑا ندارد۔ بہت جھنجھلایا۔ بڑی مشکل سے تلاش کر کے پکڑوایا تو جگہ جگہ سے زخمی پایا۔ اس نے کرنل صاحب سے خان صاحب کی بہت شکایت کی۔ معلوم نہیں کرنل نے اس انگریز کو کیا جواب دیا، لیکن وہ خان صاحب سے بہت خوش ہوا اور کہا کہ تم نے خوب کیا۔

خان صاحب نے جب یہ رنگ دیکھا، تو خیر اسی میں دیکھی کہ کسی طرح وظیفہ لے کر الگ ہو جائیں۔ وہ بیمار بن گئے اور اسپتال میں رجوع ہوئے۔ کرنل سٹوارٹ نے ڈاکٹر سے کہہ سن کر ان کو مدد دی اور اس طرح وہ کچھ دنوں بعد ڈاکٹری رپورٹ پر وظیفہ لے کر فوجی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ سچ ہے انسان کی برائیاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں، بعض وقت اس کی خوبیاں بھی اسے لے ڈوبتی ہیں۔

حصۂ نظم

غزلیات

(۱۷۲۳ء - ۱۸۱۰ء)

میر تقی میر ۱۷۲۳ء مطابق ۱۱۳۶ھ میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ عنفوانِ شباب میں دہلی آ گئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ آرزو کے شاگرد ہوئے اور فن شعر میں ان ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ دہلی کے اجڑنے کے بعد آصف الدولہ کے عہد میں ۱۷۸۲ء مطابق ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ چلے گئے۔ آصف الدولہ نے قدردانی کی اور ایک معقول وظیفہ مقرر کیا۔ لکھنؤ میں ۱۸۱۰ء مطابق ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا۔

میر تقی میر اردو کے ایک مسلم الثبوت استاد ہیں۔ ان کا درجہ اردو غزل میں بہت بلند ہے۔ ان کو ہمارے نقادوں نے اردو کا خدائے سخن بھی کہا ہے۔ انسانی جذبات اور درد و غم کا جیسا مکمل اور شاعرانہ اظہار ان کے یہاں ہے اور کسی شاعر کے کلام میں نہیں ملتا۔

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

زبان میں انتہا کی صفائی، بیان میں حد درجے کی دلکشی اور زور، کلام میں ترنم، خیالات میں سادگی، جذبات میں بلندی اور طبیعت میں دردمندی میر کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ چھوٹی بحروں کی غزلیں خاص طور پر شُستہ اور لاجواب ہیں۔

میر کے بہتّر نشتر مشہور ہیں، ہر چند کہ ان کے دل پسند اشعار کی تعداد کثیر ہے۔ چھ دیوان، متعدد مثنویاں اُن کی یادگار ہیں۔ ہم عصر شعراء میں سودا اور درد بڑے صاحب کمال گزرے ہیں۔ انھوں نے ایک تذکرہ اردو شعراء کا اور ایک اپنی سوانح عمری اور ایک دیوان فارسی بھی یادگار چھوڑا ہے۔

(۱)

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا؟
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل! ہم چلے، سوتا ہے کیا؟

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا؟

یہ نشانِ عشق ہیں، جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا؟

غیرتِ یوسف ہے یہ وقت عزیز
میر اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا؟

---

(۲)

جو اس زور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں
جہاں کو تو کب تک ڈبوتا رہے گا
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا
بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

---

(۴)

ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو
اپنی بلا سے، بیٹھ رہے جب فقیر ہو
کس طرح آہ خاک مَذلّت سے میں اٹھوں
افتادہ تر جو مجھ سے مرا دستگیر ہو
حد سے زیادہ جور و ستم خوشنما نہیں
ایسا سلوک کر جو تدارُک پذیر ہو
ایسا ہی اس کے گھر کو بھی آباد دیکھیو
جس خانماں خراب کا یہ دل مُشیر ہو
دم بھر نہ ٹھہرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک پل
اتنے سے قد پہ تم بھی قیامت شریر ہو
اک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو
تم بھی تو میر صاحب قبلہ فقیر ہو

خواجہ میر درد

(۱۷۱۹ء - ۱۷۸۵ء)

خواجہ میر درد دہلی میں پیدا ہوئے اور ساری عمر وہیں رہے - والد کا نام خواجہ ناصر عندلیب تھا جو اپنے زہد و تقویٰ اور پیری و مریدی کے باعث بہت مشہور تھے - خواجہ صاحب کے بزرگ بخارا سے ہندوستان آئے اور یہیں سکونت اختیار کی - خواجہ صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے صوفی منش والد سے حاصل کی - انتیس سال کی عمر میں والد کی جگہ خود سجادہ نشین ہوئے اور ذاتی تقدس کے سبب بہت مشہور ہوئے - احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی لوٹ مار نے سب شعراء کو دہلی سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا لیکن خواجہ صاحب اللہ پر توکل کیے بزرگوں کے سجادے پر بیٹھے رہے ، یہاں تک کہ ۱۷۸۵ء مطابق ۱۱۹۹ھ میں ۶۶ برس کی عمر پا کر انتقال کیا -

خواجہ صاحب اردو کے ایک بڑے صوفی شاعر گزرے ہیں - ان کا درجہ اردو شاعری میں بہت بلند ہے - میر تقی میر اور رفیع سودا کے معاصر تھے - زبان کی سادگی میں میر صاحب کے حریف ہیں - دیوان نہایت مختصر ہے - لیکن جو کچھ کہا ہے ، تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے - اس میں اخلاق ، تصوّف ، کیفیاتِ قلبی اور وارداتِ حسن و عشق سبھی کچھ موجود ہیں -

درد کی شاعری اور ان کی زندگی میں بڑی مطابقت ہے - وہ خود بھی اِستِغنا کی مکمل تصویر تھے - زندگی کا یہ رخ ان کے کلام کے آئینے میں جھلکتا ہے - کلام میں تصوف اور درد کی چاشنی ہے - خواجہ صاحب کی غزلیں چھوٹی بحروں میں بہت عمدہ ہیں ، جن کا ہر شعر انتخاب ہے -

غزلوں کے علاوہ میر درد کی رباعیاں بھی اردو شاعری میں خاص مرتبہ رکھتی ہیں - ان میں انھوں نے صوفیانہ ، عاشقانہ اور اخلاقی مضامین نہایت مؤثر انداز میں بیان کیے ہیں -

(۱)

اب کے ترے در سے گر گئے ہم
پھر یہ ہی سمجھ کہ مر گئے ہم
جوں نور بصر ترا تصوّر
تھا پیش نظر جدھر گئے ہم
کس نے یہ ہمیں بھلا دیا ہے
معلوم نہیں کدھر گئے ہم
تھا عالم جبر، کیا بتاویں
کس طور سے زیست کر گئے ہم
جس طرح ہوا اسی طرح سے
پیمانۂ عمر بھر گئے ہم
افسوس کہ درد اس کو جب تک
ہووے ہی خبر، گزر گئے ہم

(۲)

تہمتِ چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے ادھر، اودھر چلے

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

آہ بس جی مت جلا تب جانیے
جب کوئی افسوں ترا اُس پر چلے

ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست
زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے، دامن تر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا، ولے
ساتھ اپنے اب اسے لے کر چلے

جوں شرار ہستیِ بے بود، یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

———

مرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء)

مرزا اسد اللہ خاں نام ، غالب تخلص تھا - ۱۷۹۷ء مطابق ۱۲۱۲ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے - ان کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں ترکستان سے ہندوستان آئے اور ان ہی کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو گئے - والد کے انتقال کے بعد چچا کی نگرانی میں پرورش پائی - تیرہ چودہ برس کی عمر میں دہلی آئے، اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے - کچھ خاندانی جائداد تھی جس سے بسر اوقات بدقت ہوتی تھی - اپنے ہم عصر شاعر ذوق کے انتقال کے بعد آخری تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہو گئے تھے - ۱۸۵۷ء میں بساط شاہی درہم برہم ہو گئی اور ۱۸۶۹ء میں مرزا کا انتقال ہو گیا -

غالب کو ہمارے مبصرین نے مسلم الثبوت استاد مانا ہے - میر کی طرح وہ عام طور پر اردو ادب کے ایک بہت بڑے غزل گو شاعر سمجھے جاتے ہیں - ان کا طرز بیان نرالا ہے - ان کا تخیل انوکھا اور اچھوتا ہے - جذبات کے اظہار میں انھیں غیر معمولی قدرت حاصل ہے - ادب اور خاص طور سے غزل میں مرزا غالب نے اپنی جدتِ طبع سے نئی راہیں پیدا کی ہیں - قدما کے انداز سے ہٹ کر ایک مختلف انداز ایجاد کیا ہے - غزل میں گہرائی اور وسعت پیدا کی ہے - زندگی کا کوئی نغمہ ایسا نہیں جو ان کے کلام میں خوابیدہ یا بیدار نہیں - شوخی اور ظرافت ، انسان کی فطرت کی داستانیں ، قلب غالب کے مشاہدات سبھی کچھ موجود ہیں - غالب کے کلام کی مقبولیت یہی حیرت انگیز تنوّع ہے -

(۱)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہگذر یاد آیا

آہ وہ جرأت فریاد کہاں
دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

(۲)

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہائے اُس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۳)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

———

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷—۱۹۱۴ء)

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی ، محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی کے ہم عصر تھے - ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے - ۱۸۵۴ء میں سترہ سال کی عمر میں دہلی پہنچے اور تحصیلِ علم اور مشقِ سخن میں مشغول ہو گئے - یہاں غالب سے فنِ شعر میں اصلاح لی اور بہت جلد مشہور ہو گئے - ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد تک قدیم رنگ کی شاعری کی طرف متوجّہ رہے - پھر پنجاب پہنچ کر مولانا آزاد کے ساتھ نظمیں لکھنی شروع کیں - جدید شاعری کی بنیاد انھیں بزرگوں کے ہاتھوں پڑی اور پروان چڑھی - اس زمانے میں حالی نے بے شمار چھوٹی بڑی ، مذہبی ، نیچرل اور اخلاق نظمیں لکھیں ، جن میں برکھا رت ، نشاطِ امید ، حبِ وطن ، مناظرۂ رحم و انصاف بہت مشہور ہیں - ان نظموں میں سے چند آپ کے نصاب میں شامل ہیں - ان نظموں کی بڑی خوبی بیان اور زبان کی سادگی اور اختصار ہے -

سر سید کے ساتھ حالی قومی تحریک میں شریک ہوئے تو اس سے قومی شاعری کا سلسلہ جاری ہوا اور مشہور و معروف مسدس "مدّ و جزرِ اسلام" لکھا - حالی کی قومی و اخلاق رباعیات بھی بہت مشہور ہیں - کلام میں روانی و سلاست ، زورِ بیان ، منظر کشی حالی کی خصوصیات ہیں - اندازِ بیان پُر لطف اور لطیف ہے -

غزلیں قدیم اور جدید دونوں رنگ میں موجود ہیں اور اپنی جگہ خوب ہیں۔ جذباتِ حقیقی سے لبریز اور شاعر کی دلی کیفیّات کی سچی تصویر ہیں۔ ان میں جذبات و اثر زیادہ ہے اور صنائع و بدائع کم۔ دائرۂ غزل کو مختلف مضامین جیسے اخلاق، قومی اور نیچر کی شاعری سے وسیع کیا ہے۔ غزل کی زبان بھی تبدیل کر کے زبان کا احاطہ وسیع کیا ہے۔ سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف و قافیے کی پابندی، جو سلاست و روانی میں حائل تھیں، ترک کیا ہے۔ غرض کہ زبان اور تخیّل کے اعتبار سے غزل میں ایک نیا رنگ پیدا کیا ہے۔

دَورِ جدید کا یہ جلیل القدر شاعر و ادیب، جس نے شعر سے حقیقت نگارانہ، اخلاق اور اصلاحی کام لیا، ۱۹۱۴ء میں راہی ملکِ بقا ہوا۔ حالی شاعر کے علاوہ بلند پایہ نقّاد، مصنّف اور انشاء پرداز تھے۔ سوانح نگاری کے وہ اردو میں موجد ہیں۔ ان کی نثری تصانیف میں مقدمۂ شعر و شاعری، حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی کے علاوہ مضامین اور مقالات کے مجموعے ہیں، جن میں اعلیٰ درجے کے علمی، ادبی، اخلاق اور مذہبی مضامین موجود ہیں۔

(۱)

کبھی الہام منوانا پڑے گا
کبھی کشف اپنا جتلانا پڑے گا

نہ ہو صوفی صفا گو تجھ میں لیکن
کرشمہ کوئی دکھلانا پڑے گا

نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد
یہ گُر ناصح کو بتلانا پڑے گا

جنہیں ہو جھوٹ کو سچ کر دکھانا
انہیں سچوں کو جھٹلانا پڑے گا

سخن میں پیروی کی گر سلف کی
اِنھیں باتوں کو دہرانا پڑے گا

بہت یاں ٹھوکریں کھائی ہیں ہم نے
بس اب دنیا کو ٹھکرانا پڑے گا

زمانہ کر رہا ہے قطعِ پیوند
وفا سے ہم کو پچھتانا پڑے گا

جو منصوبے ہیں یہ حالی تو شاید
ارادہ فسخ فرمانا پڑے گا

بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک
اُسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا

(۲)

بری اور بھلی سب گزر جائے گی
یہ کشتی یونہی پار اُتر جائے گی

ملے گا نہ گلچیں کو گُل کا پتا
ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی

رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا
کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی

ادھر ایک ہم اور زمانہ اُدھر
یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی

نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں
یونہی عمر ساری گزر جائے گی

سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

جگر مرادآبادی

(۱۸۹۰—۱۹۶۰ء)

علی سکندر نام، جگر تخلص - ۱۸۹۰ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئے - ان کا خاندان شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں امتیاز رکھتا تھا - جگر کے والد مولوی علی نظر بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے اور خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد - جگر کو اعلیٰ تعلیم کا موقع نہ ملا، مگر شاعری کا ذوق سلیم ترکے میں ملا تھا - ابتدا میں اپنے والد سے اصلاح لی بعد میں داغ دہلوی اور نسیم لکھنوی کو کلام دکھانے لگے -

جگر کا ابتدائی رنگ رسا اور داغ کی طرح شوخ اور بے باک ہے - اندازِ بیان میں بانکپن اور سرمستی ہے - خیالات عام اور الفاظ معمولی ہیں - مگر دوسرے دور میں ان کی غزلوں میں ان کا انفرادی رنگ جھلکتا ہے - اس دور کے کلام کی نمایاں خصوصیت سادگی و روانی، کیف و بیخودی، محویت و وارفتگی ہے اور یہی ان کا خاص رنگ ہے - حسن و عشق کے معاملے، تصوّف کے اسرار و معارف سبھی کچھ بیان کر گئے ہیں - مگر سب میں قریب قریب ہر جگہ ایک کیف، وارفتگی اور بے خودی کی لہر محسوس ہوتی ہے -

سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری جو فارسی میں امیر خسرو کے کلام کی خصوصیت ہے وہ اردو میں جگر کے حصے میں آئی - آخری دَور کے کلام میں سیاسی اور قومی شعور بھی خاصا جھلکنے لگا تھا اور کلام میں پاکیزگی اور لطافت کے جوہر بڑھنے لگے تھے - ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا -

(۱)

غم سے چھوٹوں تو ادھر دیکھوں میں
دل کو رولوں تو جگر دیکھوں میں

آشیاں کے جو اٹھالوں تنکے
اپنے ٹوٹے ہوئے پر دیکھوں میں

داغ ہی داغ نظر آتے ہیں
کس طرح قلب و جگر دیکھوں میں

دم گھٹا جاتا ہے اے دشتِ جنوں!
چاک دامانِ سحر! دیکھوں میں

نہ وہ محفل ہے نہ وہ پروانے
خاک اے شمعِ سحر! دیکھوں میں

دلِ دیوانہ یہ قسمت میری
کہ تجھے خاک بسر دیکھوں میں

چھوٹ جاؤں جو غمِ ہستی سے
بھول کر بھی نہ ادھر دیکھوں میں

(۲)

قدرت کی آن والے، رحمت کی شان والے
تجھ پر جہاں تصدق او پاک جان والے

دونوں جہاں کی نعمت ہے مٹھیوں میں تیری
بوسیدہ کپڑوں والے ٹوٹے مکان والے

ایسے تھے آپ امیؐ کھولی زباں جس دم
دم بھر میں بے زباں تھے سارے زبان والے

اک جنبشِ لگہ کے سب منتظر کھڑے ہیں
پُر درد قلب والے پُر سوز جان والے

منظومات

نظیر اکبر آبادی

(۱۷۳۵ — ۱۸۳۰ء)

ولی محمد نظیر ۱۷۳۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت نظیر اپنی والدہ اور نانی کے ساتھ آگرے چلے گئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ نظیر فارسی اور عربی بھی جانتے تھے۔ عمر چونکہ بہت لمبی پائی تھی، اس لیے انشاء، جرأت اور ناسخ کی مجلسیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ ۱۸۳۰ء انتقال ہوا۔

نظیر اکبر آبادی اُردو کے پہلے عوامی شاعر ہیں۔ ان کا کلام اپنے زمانے کے عوام کی روزمرہ کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ نظیر نے چونکہ زندگی کو ہر رنگ میں دیکھا تھا اس لیے زندگی کا ہر پہلو ان کی نظموں میں ملتا ہے۔ صدہا نظمیں ایسی لکھیں جن میں قدرتی مناظر، اخلاق، نصائح، قومی و ملکی مشاغلِ حیات شامل ہیں۔ آدمی نامہ، فقیر نامہ، برسات کی بہاریں، ہولی، دیوالی، عید، عرس وغیرہ صدہا عنوانات پر نظمیں لکھیں۔ نظیر کو انسان اور اس کے ارد گرد کے ماحول سے بڑی محبت تھی۔ وہ اس کے ماحول کی عکاسی اور اس کی دلی کیفیات کی ترجمانی بڑے خلوص سے کرتے ہیں۔ نظیر کے آدمی نامہ کا انتخاب اس کتاب میں شامل ہے۔ اسے پڑھیے۔ اس بات پر غور کیجیے کہ نظیر نے اپنے خالص بیانیہ انداز میں کیا کہا ہے۔

"اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر" - ہر شخص آدمی ہے - اس احساس کی تفسیر نظیر کے بہت سے خیالات ہیں۔ اسی خیال سے اس نے عوام کے دماغ کو بسانا چاہا تھا تاکہ ان میں خود شناسی پیدا ہو - وہ کہتے ہیں کہ آدمی ہونے کی حیثیت سے ہر آدمی مساوی حیثیت رکھتا ہے اور انسانی عظمت کے سامنے طبقات کے تفوّق اور پستی کا سر جھکتا ہے -

ان نظموں میں نظیر نے بول چال کی زبان استعمال کی ہے - اسلوب بھی عام فہم اختیار کیا ہے - نظیر کی زبان اس طرح اپنے تمام ہم عصروں اور بعد کے شاعروں سے بالکل مختلف ہے - نظیر کی نظمیں ، مضامین ، عنوانات اور طرزِ بیان کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہیں - یوں سمجھیے کہ عوامی شاعری کی روایت کی ابتدا نظیر ہی کی نظموں سے ہوتی ہے - اس لحاظ سے اردو شاعری میں نظیر ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں -

---

آدمی نامہ

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اَبدال و قُطب ، غوث و ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات نے کیے
حتّٰی کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے

خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعوٰی خدائی کا
شدّاد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا
یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا

یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور
یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زُور

اور ہادی ، رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز یاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں

جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

"اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر" - ہر شخص آدمی ہے - اس احساس کی تفسیر نظیر کے بہت سے خیالات ہیں۔ اسی خیال سے اس نے عوام کے دماغ کو بسانا چاہا تھا تاکہ ان میں خود شناسی پیدا ہو - وہ کہتے ہیں کہ آدمی ہونے کی حیثیت سے ہر آدمی مساوی حیثیت رکھتا ہے اور انسانی عظمت کے سامنے طبقات کے تفوّق اور پستی کا سر جھکتا ہے -

ان نظموں میں نظیر نے بول چال کی زبان استعمال کی ہے - اسلوب بھی عام فہم اختیار کیا ہے - نظیر کی زبان اس طرح اپنے تمام ہم عصروں اور بعد کے شاعروں سے بالکل مختلف ہے - نظیر کی نظمیں، مضامین، عنوانات اور طرزِ بیان کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہیں - یوں سمجھیے کہ عوامی شاعری کی روایت کی ابتدا نظیر ہی کی نظموں سے ہوتی ہے - اس لحاظ سے اردو شاعری میں نظیر ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں -

---

آدمی نامہ

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اَبدال و قُطب ، غوث و ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات نے کیے
حتّٰی کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے

خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعوٰی خدائی کا
شدّاد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا
یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا

یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور
یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زُور

اور ہادی ، رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز یاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں

جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی کو تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی

اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو، لے کے مال
اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال
سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال

اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار
اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ، صراحی، جوتیاں دوڑیں بغل میں مار
کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں آدمی کہار

اور اس پہ جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کہتا ہے کوئی 'لو' کوئی کہتا ہے 'لا رے لا'
کس کس طرح سے بیچے ہیں چیزیں بنا بنا

اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل و جواہر ہیں بے بہا
اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ اُلٹا ہے جوں توا
گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا

بد شکل و بد نما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں
روپے کے ان کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں
کم خواب، تاش، شال دوشالوں میں غرق ہیں

اور چیتھڑے لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار
نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار
سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کا کاروبار

اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اَشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحب عزّت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے 'نظیر'

اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

———

خواجہ الطاف حسین حالی

حبِ وطن

اے سپہرِ بریں کے سیّارو!
اے فضائے زمیں کے گلزارو!

اے پہاڑوں کی دلفریب فضا
اے لبِ جُو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا

اے عنادل کی نغمۂ سحری
اے شبِ ماہتاب تاروں بھری

اے نسیمِ بہار کے جھوکو
دہرِ ناپائدار کے دھوکو

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز
تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

جب وطن میں ہمارا تھا رہنا
تم سے دل باغ باغ تھا اپنا

تم مری دل لگی کے ساماں تھے
تم مرے دردِ دل کے درماں تھے

تم سے کٹتا تھا رنج تنہائی
تم سے پاتا تھا دل شکیبائی

آن اک اک تمھاری بھاتی تھی
جو ادا تھی وہ جی لُبھاتی تھی
کرتے تھے جب تم اپنی غم خواری
دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری
جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے
ہو کے خوشحال گھر میں آتے تھے
بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لبِ آب
دھو کے اٹھتے تھے دل کے داغ شتاب
کوہ و صحرا و آسمان و زمیں
سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
پر چُھٹا جب سے اپنا ملک و دیار
جی ہُوا تم سے خود بخود بیزار
نہ گلُوں کی ادا خوش آتی ہے
نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
سیرِ گلشن ہے جی کا اک جنجال
شبِ ماہتاب جان کو ہے وبال
کوہ و صحرا سے تا لبِ دریا
جس طرف جائیں جی نہیں لگتا
کیا ہوئے دن وہ اور وہ راتیں
تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں
ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور
یا تمھارے ہی کچھ بدل گئے طور
گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا
پر نہیں لطف ہم کو دنیا کا

علامہ شبلی نعمانی

(۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)

علامہ شبلی کے حالات زندگی آپ اسی کتاب میں پڑھ چکے ہیں وہ عظیم نثر نگار ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے - ان کی شاعری بالکل خود رَو پودا ہے - نہ اس میں انھوں نے کسی سے اصلاح لی نہ کبھی جم کر اردو شاعری کی اور نہ کبھی اس کو شہرت کا ذریعہ سمجھا - پہلے دور کی یادگار چند غزلیں، ایک قصیدہ سلطان عبدالحمید خاں کی تعریف میں اور ایک طویل نظم ہے - دوسرے دور میں ان کی چند غزلیں ہیں جو زمانے کے دستبرد سے محفوظ رہ گئی تھیں اور جو ان کے خطوط کے مجموعے کے ساتھ "مکاتیب شبلی" میں چھپیں - مولانا کی اردو شاعری کا تیسرا دور حیدر آباد کے قیام کا ہے جو صرف چار برس (۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۴ء) رہا - اس زمانے میں کئی غزلیں لکھیں جو ضایع ہو گئیں - چوتھا دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۴ء تک یعنی ان کی وفات تک قائم رہتا ہے - ان کی شاعریؐ کا یہی دور امتیازی دور ہے - یہ وہ دور تھا جب اسلامی دنیا میں انقلاب برپا تھا - اس پُر آشوب زمانے کے شاعر مولانا شبلی ہی تھے - جوشِ بیان ، قوتِ زبان اور تأثر کا ایک ایسا تیز نشتر اس زمانے کی نظموں میں چھپا ہوا تھا کہ جو پڑھتا تھا ، تلملا جاتا تھا -

سیاسی نظموں میں پہلی نظم "شہر آشوب اسلام" کے نام سے جنگ بلقان کے زمانے میں لکھی اور بہت مقبول ہوئی - اس

کے بعد بہت سی مؤثّر نظمیں اور لکھیں ۔ سیاسی نظموں کے علاوہ اس زمانے میں شبلی نے تاریخی ، اخلاقی نظموں کے دو الگ الگ سلسلے شروع کیے ۔ اردو ادب میں ان کی کوئی مثال نہیں تھی ۔ ان نظموں میں ایک طرف اسلامی تاریخ کو اکٹھا کر کے نظموں میں اس طرح پرو دیا ہے کہ قومی اخلاق کا اعلیٰ تصور اُجاگر ہو گیا ہے اور دوسری طرف اس نمونے نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اردو شاعری میں بغیر مبالغہ آمیزی اور خیال آرائی کے صحیح واقعات بھی نظم کیے جا سکتے ہیں ۔

شبلی کی ایک نظم ”شہدائے اسلام“ آپ کے انتخاب میں شامل ہے ۔ واقعات کی سطح پر شاعری کا کمال ، خوبیِ ادا اور تعبیر میں شاعری کا زور دیکھیے ۔ شبلی ایک فطری شاعرانہ صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے اور فطری طور پر ایک بلند پایہ شاعر مانے گئے ۔

شہدائے قوم

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چُور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے ، منتظرِ نفخِ صور ہیں

کچھ نوجوان ہیں بے خبرِ نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں

اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں

سینے پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار
از بسکہ مستِ بادۂ ناز و غرور ہیں

ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناسِ ذوقِ دلِ ناصبور ہیں

کچھ پیرِ کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک و خون میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
"ہم کُشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں"

اکبر الہ آبادی

(۱۸۴۶ء - ۱۹۲۱ء)

سید اکبر حسین نام اور اکبر تخلّص تھا، والد کا نام میر تفضّل حسین تھا - اکبر ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے جہاں ان کے چچا تحصیلدار تھے - اکبر اپنی ابتدائی تعلیم میں بھی اپنی ذہانت کی وجہ سے ہمیشہ اپنے درجوں میں ممتاز رہے - ۱۸۸۶ء میں مختاری کا امتحان اول درجے میں پاس کیا، کچھ دنوں بعد نائب تحصیلدار ہو گئے - آخر میں جج کے عہدے پر مقرر ہوئے -

اکبر کو شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے تھا - وحید کو اپنا کلام دکھاتے تھے جو خواجہ آتش کے شاگرد تھے - ابتدا میں اکبر نے بھی اسی رنگ میں شعر کہے جو اس زمانے کا خاصّہ تھا - لیکن اکبر کی شہرت اس وقت ہوئی جب انہوں نے قدیم رنگ کو ترک کیا اور جدید طرز کے موجد بنے -

اکبر کی شاعری کا ابتدائی دَور دورِ نومشقی تھا - اس میں وہی فرسودہ مضامین اور تصنُّع ہے جو اس زمانے کا خاصّہ تھا - مگر اس نو مشقی کے دور میں بھی زبان میں سادگی اور روانی آنے والے خوش آیند مستقبل کا پتا دیتی ہے -

اس کے بعد کے دَور میں تصنُّع کی جگہ بے تکلُّفی نے لے لی - فرسودہ مضامین میں مُعتَدبِہ کمی بھی ہو گئی - کلام میں درد و اثر بڑھ گیا رفتہ رفتہ کلام میں استادانہ رنگ پیدا ہوا - بیان پر قدرت حاصل کی اور غزلوں میں اخلاق رنگ جھلکنے

لگا - غزلوں اور نظموں میں ظریفانہ رنگ اسی دورِ کی یادگار ہیں - مذاق اور ظرافت کا عُنصر کلام میں بڑھ گیا - واقعاتِ حاضرہ اور مغربی تقلید پر چبھتے ہوئے انداز میں نکتہ چینی اندازِ بیان کا خاصّہ ہو گیا - یہ ان کا اپنا خاص رنگ ہے جو ان کی شہرت کا باعث بنا - اس طرز میں کوئی شاعر ان سے بہتر تو کیا ان کے برابر نہ لکھ سکا - اس دور کا ظریفانہ کلام کسی نہ کسی تبلیغی مقصد کی طرف اشارہ کرتا ہے -

بندش کی چستی و روانی ، زبان کی صفائی و سلاست ، بیان میں بے تکلّفی اور اپنے مخصوص ظریفانہ انداز کی وجہ سے قوم سے ''لسان العصر'' کا خطاب پایا اور شاعرانہ استادی نے اکبر کو حالی اور آزاد کی صف میں لا کھڑا کیا -

---

مشرق و مغرب

تخت کے قابض وہی دیہیم ان کے ہاتھ میں
ملک ان کا رزق کی تقسیم ان کے ہاتھ میں

برق کی صورت پہنچتا ہے طبائع پر اثر
آ گیا تارِ امید و بیم ان کے ہاتھ میں

ہم کو سایے پر جنوں وہ دھوپ میں مصروف کار
مس پہ ہے اپنی نظر اور سیم ان کے ہاتھ میں

صبر باقی ہے نہ ہم میں باہمی اعزاز ہے
سب کی ہے تذلیل اور تعظیم ان کے ہاتھ میں

شیخ کی جانب کوئی جاتا نہیں کہتے ہیں سب
ہے فقط اب کوثر و تسنیم ان کے ہاتھ میں

مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قُلوب
قوم ان کے ہاتھ میں ، تعلیم ان کے ہاتھ میں

جج بنا کر اچھے اچھوں کا لُبھا لیتے ہیں دل
ہیں نہایت خوشنما دو جیم ان کے ہاتھ میں

———

مولانا ظفر علیخاں

(۱۸۷۳ء - ۱۹۵۶ء)

مولانا ظفر علی خان ایک گاؤں مہرتھ (سیالکوٹ پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ سن پیدائش نام سے نکلتا ہے جو ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۳ء ہے۔ مولانا ظفر علی کے والد کرم آباد تحصیل وزیرآباد پنجاب میں زمیندار تھے، جس کا بڑا حصہ سیاسی سرگرمیوں کی نذر ہو گیا۔ ظفر علی نے ابتدائی تعلیم وزیر آباد اور پٹیالے میں حاصل کی، پھر علی گڑھ سے بی۔ اے پاس کر کے بمبئی چلے گئے۔ بمبئی میں مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی۔ ان سے ریاست حیدرآباد کی علمی سرگرمیوں کے حالات سنے اور وہیں چلے گئے۔ ریاست حیدرآباد میں ان دنوں داغ مرحوم کی شاعری کا بڑا شہرہ تھا۔ ظفر علی خان بھی داغ کے شاگردوں میں شمار ہوئے اور اصلاح لیتے رہے۔ والد کے انتقال کے بعد ظفر علی نے ''زمیندار'' کو سنبھالا جو نکلتا پہلے سے تھا لیکن اس کی حیثیت اور شہرت ظفر علی خان کے زورِ قلم سے قائم ہوئی۔

مولانا ظفر علی اردو نظم اور نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ شعر گوئی ابتدائی سنِ تمیز سے شروع کی اور برابر لکھتے رہے۔ مولانا کی نظموں میں مذہبی اور سیاسی عُنصر غالب ہے۔ مذہبی نظموں میں مولانا نے رسول اکرمؐ کی شان میں بے شمار نعتیہ نظمیں لکھی ہیں جن میں سے بیشتر بہارستان میں موجود ہیں۔ ان سب نظموں میں خلوص و عقیدتمندی کے ساتھ ساتھ جودتِ طبع اور ندرت قابلِ ستائش ہیں۔

مولانا کی سیاسی اور اخلاقی نظموں سے ان کے متنوّع خیالات ، سیاسی نکتہ سنجی اور نُدرتِ کلام کا پورا پورا احساس ہوتا ہے - ہنگامی نظمیں بھی مولانا خوب لکھتے تھے - ایسی نظمیں روزمرہ کے واقعات سے متاثّر ہو کر لکھی گئی ہیں اور ان کی حیثیت عارضی ہے ، تاہم ان میں بہت کچھ ہے اور ان کو اردو شاعری کے ذخیرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا -

طویل نظموں میں طنز و ظرافت کے عناصر نسبتاً زیادہ ہیں اور وہی مقبولِ عام ہوئے - ظفر علی خان میں بڑی شاعرانہ صلاحیتیں تھیں مگر انھوں نے ان صلاحیتوں سے خاطر خواہ کام نہیں لیا ورنہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں ، ان کے مزاج کی شگفتگی و طبعی ظرافت اور ان کے انداز بیان کے مقابلے میں ان کا جواب دورِ حاضر میں کوئی نہ ملتا اور طنز و ظرافت میں اکبر الٰہ آبادی کے پایے کے تو ضرور ہوتے - مولانا کی بعض اسلامی ، سیاسی ، تاریخی ، اخلاقی اور جہادی نظمیں جو جدید شاعری کی نمائندگی کرتی ہیں بہت مقبول ہوئیں - ان کی بعض نظمیں بدیہ گوئی اور برجستہ کلامی ، زورِ بیان اور قدرتِ کلام کا بیّن ثبوت ہیں -

مولانا کی شاعری کے خاص موضوعات یہ ہیں - سرورِ کائناتؐ کی ذاتِ اقدس ، اسلام سے بے پناہ محبت ، وطن دوستی ، تاریخِ اسلام ، احرار ، کانگریس وغیرہ -

ان کی کل نظموں میں زبان پاکیزہ ، شوخی ، رنگینی ، جرأت و بے باکی ہے - غرضیکہ مولانا نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا اور بہت کچھ دے سکتے تھے ، مگر مولانا کی صلاحیتیں ہنگامی نظموں پر زیادہ صرف ہو گئیں -

———

مستقبل کی جھلک

کوئی دن جاتا ہے پیدا ہو گی اک دنیا نئی
خونِ مسلم صرفِ تعمیرِ جہاں ہو جائے گا

بجلیاں غیرت کی تڑپیں گی فضائے قدس میں
حق عیاں ہو جائے گا باطل نہاں ہو جائے گا

ان کواکب کے عوض ہوں گے نئے انجم طلوع
ان دنوں رخشندہ تر یہ آسماں ہو جائے گا

پھر نئے محمود ہوں گے حامی دینِ متیں
بچہ بچہ غیرت الپ ارسلاں ہو جائے گا

میرے جیسے ہوں گے پیدا سینکڑوں اہلِ سخن
نکتہ نکتہ جن کا آزادی کی جاں ہو جائے گا

شان مزدوری کی دنیا میں بڑھا دی جائے گی
بے نشاں سرمایہ داری کا نشاں ہو جائے گا

ڈھائی جائے گی بِنا یورپ کے اِستعمار کی
ایشیا آپ اپنے حق کا پاسباں ہو جائے گا

نغمہ آزادی کا گونجے گا حرم اور دیر میں
وہ جو دارالحرب ہے دارالاماں ہو جائے گا

ہم کو سودا ہے غلامی کا کہ آزادی کی دُھن
چند ہی دن میں ہمارا امتحاں ہو جائے گا

اس بشارت کو نہ سمجھو ایک دل خوش کُن قیاس
جس کو سن کر ہر مسلماں شادماں ہو جائے گا

سچ ہے میرا حرف حرف اور جس کو اس میں شک ہے آج
دیکھ لینا کل مرا ہم داستاں ہو جائے گا

(۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸ء)

ڈاکٹر محمد اقبال ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے فارسی اور عربی کی مکمل تعلیم پائی۔ علم اور ادب سے طبیعت میں مناسبت قدرتی طور پر موجود تھی۔ آپ نے اپنے استاد سید میر حسن کی تعلیم سے خوب فیض اٹھایا۔ شعر و سخن کا فطری مذاق بچپن سے موجود تھا، اس لیے اقبال نے طالب علمی کے زمانے میں سیالکوٹ کے مشاعروں مین شرکت شروع کی اور داغ سے اصلاح لی۔ سیالکوٹ کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اسی کالج میں مشہور پروفیسر ڈاکٹر آرنلڈ کے شاگرد رہے۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد تین سال یورپ رہے اور ۱۹۰۸ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر واپس وطن آئے۔

۱۹۰۱ء میں اقبال کی ایک نظم 'مخزن' میں شایع ہوئی، جس سے آپ کی اردو شاعری کا باقاعدہ تعارف ہوا۔ اس کے بعد اقبال نے بہت سی نظمیں قدرتی مناظر پر لکھیں جو اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ چاند، جگنو، صبح کا ستارہ اور ابر قدرتی مناظر پر ان کی بہترین نظمیں ہیں۔ اس کے بعد کی لکھی ہوئی طویل نظمیں جیسے خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، شمع و شاعر، شکوہ اور جواب شکوہ بہت مشہور ہیں۔ یہ اقبال کے شاہکار ہیں۔ یہ اور بہت سی طویل و مختصر نظم بانگ درا میں شامل ہیں۔

اقبال اور حالی سے پہلے شمالی ہند میں سوائے نظیر اکبرآبادی کے کوئی نظم گو شاعر نہیں ملتا - شعراء قدرتی مناظر ضمناً بیان کر دیا کرتے تھے - اقبال نے قدرتی مناظر کے حسین اور دلکش مرقعے منظوم کیے ہیں - اپنے عظیم خیالات اور انوکھے دلآویز اندازِ بیان سے نظم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے ، اس میں جدت اور ندرت پیدا کی ہے - مختصر یہ کہ نظم گوئی کو معراج کمال تک پہنچایا ہے - بالِ جبریل اور ضربِ کلیم اقبال کے معراجِ کمال کی شاہد ہیں -

اقبال کے کلام میں حزن و یاس کے مضامین کی گنجائش نہیں بلکہ امید و مسرت اور خوش آیند مستقبل کی جھلکیاں ہیں - ان کی شاعری اس زندگی کی ترجمان ہے جو ہر دم رواں دواں ہے - کلام میں اثر و روانی ہے ، خیال میں بلندی ہے - ان سب کو انھوں نے نظم کے پیمانے میں پیش کیا اور مقبول ہوئے - اقبال کے علاوہ بے شمار لوگوں نے نظمیں لکھیں ، لیکن ان میں اقبال کی شخصیت سب سے نمایاں ہے - ۱۹۳۸ء میں انتقال فرمایا -

---

خطاب بہ جوانانِ اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِدارا

تمدّن آفریں ، خلّاق آئین جہانداری
وہ صحرائے عرب یعنی شتر بانوں کا گہوارا

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ مُنعِم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہانگیر و جہاندار و جہاں بان و جہاں آرا

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار ، وہ کردار تو ثابت وہ سیارا

گنوا دی ہم نے جو اَسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

طارق کی دعا

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

دو عالَم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں نظر میں اذانِ سحر میں

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انھی کے جگر میں

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتَذَر میں

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

طلوعِ اسلام

(اقتباسات)

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تُنک تابی
اُفُق سے آفتاب ابھرا، گیا دَورِ گراں خوابی

عُروقِ مردہ' مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطُم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ تُرکمانی ، ذہنِ ہندی ، نُطقِ اعرابی

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنُّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہدے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہدے

خدائے لم یزل کا دست قدرت تُو زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ آسماں تُو ہے

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تُو جاوداں تُو ہے

یہ نکتہ سرگذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تُو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شَجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اُخُوَّت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

مٹایا قیصر و کِسرٰی کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بُوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمُّل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیںؑ پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ولایت ، پادشاہی علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں ؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشرب نابے
دل گرمے نگاہ پاک بینے، جانِ بیتابے

تو رازِ کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہوجا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اُخُوّت کا بیاں ہوجا، محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی، وہ خراسانی ، یہ افغانی ، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تُند رَو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

اختر شیرانی

(۱۹۰۳ — ۱۹۴۸ء)

محمد داؤد نام ، اختر تخلص ، ۱۹۰۳ء میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے ۔ اختر کے دادا مولوی محمد اسماعیل ٹونک کے نواب محمد علی خان کے مختار تھے ۔ اختر کے والد پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی علمی اور ادبی دنیا میں مشہور ہیں ۔

اختر نے ابتدائی تعلیم ٹونک میں حاصل کی ۔ اس کے بعد اختر اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہوئے اور ۱۹۲۱ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا ۔ یہیں سے اختر کی شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہوا ۔ علامہ تاجور نجیب آبادی سے اصلاح لیتے تھے ۔ کچھ مدت بعد انھوں نے رسائل کی ادارت کا کام سنبھالا ۔ ہمایوں اور انتخاب کی ادارت کے بعد ۱۹۲۸ء میں اپنا خیالستان نکالا اور دوسرا پرچہ رومان جاری کیا ۔ دونوں پرچے کچھ مدت بعد بند ہوگئے ۔ لیکن اس مشغلے سے اختر ادبی حلقوں میں صرف روشناس ہی نہیں ہوئے بلکہ اپنے کلام کی پختگی کی بدولت انھوں نے کم عمری میں شہرت بھی پائی ۔

”پھولوں کے گیت ، نغمۂ حرم ، صبحِ بہار، اخترستان، لالۂ طور ، طیورِ آوارہ ، شہناز اور شہرود“ اختر کے کلام کے مجموعے ہیں جو شایع ہو چکے ہیں ۔

اختر شیرانی ، رومانی شاعری کے علمبردار کی حیثیت سے مشہور ہیں ۔ ان کی شاعری کی روح تغزل ہے ۔ اسی روح کو

اپنی غزلوں ، نظموں اور گیتوں میں پھیلاتے ہیں اور اپنا ایک انفرادی رنگ قائم کرتے ہیں ۔ ولولہ انگیزی ، ترنم ، رنگینی اور نزاکتِ ادا نے ان کے کلام میں جان ڈال دی ہے ۔ اختر کے کلام میں ایک عجیب سرمستی ، ایک شدید احساس پایا جاتا ہے ۔ رومانی مناظر کی تصویریں ، پیہم حرکت و رقص کرتی نظر آتی ہیں ۔ کوئی چیز جامد و ساکن نہیں بلکہ ہر جگہ ایک سیلابی کیفیت ہے جو پڑھنے والے کو اپنی رو میں دور تک بہا لے جاتی ہے ۔ اس بہاؤ میں الفاظ اور تراکیب کے حسن کو بھی بڑا دخل ہے ۔ ان میں جدت اور خوش آہنگی ہے ۔ ان تمام عناصر نے اختر شیرانی کے کلام کو اردو شاعری میں ایک منفرد حیثیت بخشی ہے ۔

برسات

گھٹاؤں کی نیل فام پریاں ، افق پہ دھومیں مچا رہی ہیں
ہواؤں میں تھر تھرا رہی ہیں، فضاؤں کو گدگدا رہی ہیں
چمن شگفتہ ، دمن شگفتہ ، گلاب خنداں ، سمن شگفتہ
بنفشہ و نسترن شگفتہ ہیں ، پتیاں مسکرا رہی ہیں
یہ مینہ کے قطرے مچل رہے ہیں، کہ ننھے سیارے ڈھل رہے ہیں
افق سے موتی ابل رہے ہیں ، گھٹائیں موتی لٹا رہی ہیں
نہیں ہے کچھ فرق بحر و بر میں، کھنچا ہے نقشہ یہی نظر میں
کہ ساری دنیا ہے اک سمندر ، بہاریں جس میں نہا رہی ہیں
چمن ہے رنگیں ، بہار رنگیں ، مناظرِ سبزہ زار رنگیں
ہیں وادی و کوہسار رنگیں ، کہ بجلیاں رنگ لا رہی ہیں
چمن میں اختر بہار آئی ، لہک کے صوتِ ہزار آئی
صبا گلوں میں پکار آئی ، اٹھو گھٹائیں پھر آ رہی ہیں

محمد حفیظ نام ، حفیظ تخلص ، ابو الاثر کنیت ۔ ۱۹۰۰ء میں پنجاب کے قدیم شہر جالندھر میں پیدا ہوئے ۔ حفیظ کی ابتدائی تعلیم جالندھر میں ہوئی ۔ بچپن سے اردو زبان اور شاعری سے فطری مناسبت تھی ۔ گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا اس وقت وہ غزل کہتے تھے ۔ حفیظ کے استاد فارسی کے مشہور شاعر مولانا غلام قادر گرامی مرحوم تھے ۔

۱۹۲۵ء میں فرماں روائے خیرپور سندھ نے تین سو روپے ماہوار مشاہرے پر درباری شاعر کے طور پر حفیظ کو یاد فرمایا ، مگر حفیظ کو یہ زندگی پسند نہ آئی ۔ نظم "رقاصہ" اسی زمانہ کی یادگار ہے ۔ خیرپور سے واپسی پر حفیظ نے اپنا پہلا مجموعۂ کلام "نغمہ زار" شایع کیا جو حفیظ کی شہرت کا باعث ہوا ۔ اسی کے بعد حفیظ نے شعر و سخن کے ذریعہ اسلام کی خدمت کرنے کا تہیہ کر لیا اور شاہنامۂ اسلام کو نظم کرنا شروع کیا ۔ اب تک اس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں ۔ سوز و ساز ، تلخابۂ شیریں اور نغمہ زار حفیظ کے دوسرے شعری مجموعے ہیں ۔ حفیظ نے اردو میں گیت کی روایت کو بھی مستحکم کیا ۔ ان کے گیتوں میں جو فضا اور موسیقی ہے وہ اس دَور کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں ۔

حفیظ میں اس دَور کے اور شعراء کی طرح پرانی روایت کا احترام بھی ہے ، بغاوت کا جذبہ بھی اور نئے تجربے بھی ۔ انھیں باتوں نے آگے چل کر ان کی شاعری میں ایک نرالی

دُھن ، ایک تازہ منصوبے اور ایک نئی منزل کا ذوق پیدا کر دیا اور ابتدائی دَور کی غزلوں والی بات ختم ہو گئی۔

حفیظ کا شاہکار ان کی طویل نظم 'شاہنامۂ اسلام' ہے، جو واقعہ نگاری اور بیانیہ شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

حفیظ نے اپنے کلام میں الفاظ کی نشست، ترکیبوں کی برجستگی، واقعات کی ترتیب و تناسُب، بیان کی سادگی و سلاست، خیال کی رعنائی اور مترنم بحروں اور نئے اسالیب کا خاص خیال رکھا ہے۔ نئی پود کو انھوں نے خاص طور پر متأثر کیا۔ حفیظ اپنے گیتوں اور نظموں کی وجہ سے خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں اور مجموعی حیثیت سے حفیظ کی شاعری کا فن ان کے گیتوں میں زیادہ نمایاں ہے۔ پربت کا گیت اور جاگ سوز عشق جاگ، اُردو گیتوں کی تاریخ میں لازوال ہیں اور حفیظ کے لازوال شاہکار ہیں۔

شہسوار کربلا

لباس ہے پھٹا ہوا غبار میں اٹا ہوا
تمام جسم نازنیں چِھدا ہوا کٹا ہوا

یہ کون ذی وقار ہے، بلا کا شہسوار ہے
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا

یہ بالیقین حسینؑ ہے
نبیؐ کا نور عین ہے

یہ جس کی ایک ضرب سے کمالِ فنِ حرب ہے
کئی شقی گرے ہوئے تڑپ رہے ہیں کرب ہے

غضب ہے تیغۂ دوسر، کہ ایک ایک وار پر
اٹھی صدائے الاماں، زبان شرق و غرب سے

یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نور عین ہے

یہ مرد حق پرست ہے مئے رضا سے مست ہے
کہ جس کے سامنے کوئی بلند ہے نہ پست ہے

ادھر ہزار گھات ہے، مگر عجیب بات ہے
کہ ایک سے ہزارہا کا حوصلہ شکست ہے

یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نور عین ہے

عبا بھی تار تار ہے تو جسم بھی فگار ہے
زمیں بھی ہے تپی ہوئی فلک بھی شعلہ بار ہے

مگر یہ مرد تیغ زن، یہ صف شکن، فلک فگن
کمال صبر و تن دہی سے محوِ کار زار ہے

یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نور عین ہے

دلاوری میں فرد ہے بڑا ہی شیر مرد ہے
کہ جس کے دبدبے سے دشمنوں کا رنگ زرد ہے

حبیب مصطفیٰ ہے یہ، مجاہد خدا ہے یہ
جبھی تو اس کے سامنے یہ فوج گرد گرد ہے

یہ بالیقین حسینؑ ہے
نبیؐ کا نور عین ہے

اُدھر سپاہ شام ہے ہزار انتظام ہے
اُدھر ہیں دشمنانِ دیں اِدھر فقط امام ہے
مگر عجیب شان ہے، غضب کی آن بان ہے
کہ جس طرف اٹھی ہے تیغ بس خدا کا نام ہے

یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نور عین ہے

احسان دانش

احسان الحق نام ، احسان تخلّص ۔ دنیائے شاعری میں احسان دانش کے نام سے مشہور ہیں ۔ احسان کا خاندانی وطن میرٹھ ہے ۔ ان کے والد قاضی دانش علی نے مظفر نگر میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔ یہیں ۱۹۱۴ء میں احسان پیدا ہوئے ۔ احسان دانش کے والد خوش مذاق اور علم دوست آدمی تھے ۔ احسان نے ابتدائی تعلیم حافظ محمد مصطفٰی سے حاصل کی ۔ ابھی تعلیم ادھوری تھی کہ فکرِ معاش میں لاہور آنا پڑا اور یہیں کے ہو رہے ۔ تلاش معاش میں بڑی بڑی دشواریاں اٹھانی پڑیں ۔ مگر گوناگوں گردشوں اور پریشانیوں کے باوجود احسان نے اپنا مطالعہ جاری رکھا اور کتب بینی کے شغل نے احسان کی ابتدائی تعلیمی کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ۔ انھوں نے اِفلاس کی آغوش میں آنکھ کھولی ، مگر اِفلاس کے پیدا کردہ مصائب و مشکلات کا مقابلہ بڑی ہمت اور جوانمردی ، عزم اور استِقلال سے کیا اور اُردو شاعری میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہوئے ۔

احسان شروع شروع میں قاضی محمد ذکی سے اصلاح لیتے رہے ۔ فن شعر سے فطری مناسبت تھی ، فطری ذہانت اور جودت نے راہنمائی کی اور نظم نگاری میں بہت جلد مَلِکہ حاصل کر لیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاعری کی دنیا میں انقلابی رجحانات اور ترقی پسند نظریات مقبول ہو رہے تھے اور سماجی دکھوں کا بھرپور اظہار اس دَور کی شاعری میں

طرۂ امتیاز بن رہا تھا ۔ احسان بھی اس مقبول رنگ سے متاثر ہوئے۔ اپنے پچھلے تلخ تجربات و مشاہدات کو انھوں نے اپنی نظم کا موضوع بنایا اور مزدور اور اس کی پامال زندگی کی اصلاح کی بھرپور ترجمانی کی ۔ وہ نادار مزدور کی پامال زندگی کی اصلاح چاہتے ہیں اور سرمایہ‌داری کی سخت مذمت کرتے ہیں ۔ فنکاری کے ساتھ ساتھ چونکہ خلوص بھی شامل تھا اس لیے احسان کے کلام کو مقبولیت و امتیاز بھی اسی خلوص سے ملا اور آسمانِ شاعری پر آفتاب بن کر چمکے ۔

واقعات اور منظر کی تصویر کشی میں احسان کو بڑی قدرت حاصل ہے ۔ انیس کی طرح واقعات اور مناظر کے بیان میں جزئیات سے کام لے کر نقوش کو ہلکا اور گہرا کرنا خوب آتا ہے ۔ "دیہات کی شام" جو اس کتاب میں شامل ہے ، اس میں منظر کشی کا کمال موجود ہے ، شہر کے ہنگاموں سے دور دیہات کی سکون پرور زندگی کی عکاسی کی ہے ۔

تاثر میں شدتِ جذبات نے احسان سے "باغی کا خواب" یا "سادھو کی چتا" جیسی نظمیں کہلوائیں ۔ پھر مفلسی اور ناداری کی غمناک تصویریں احسان نے پس منظر کے طور پر پیش کیں ۔ احسان کی رومانی نظموں میں بھی بڑا والہانہ پن ہے ۔ ایسے اشعار کیف و اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔ ان میں جذبات کی شدت لطیف اور نرم صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ زبان میں گھلاوٹ ، مٹھاس اور بیان میں بڑی جاذبیت ہے ۔

غرض کہ احسان ایک ماہر فنکار کی طرح اپنی تصویروں کے خد و خال پیش کرتے ہیں ۔ ترنم ان کے کلام کی جان ہے ۔ ان کی تشبیہات اور استعارات نادر ہیں ۔ زبان بڑی شگفتہ اور پاکیزہ ، صاف اور سلیس ہے ۔

دردِ زندگی ، تفسیرِ فطرت ، چراغاں ، نوائے کارگر ، آتشِ خاموش ، جادۂ نو ، مقامات ، زخم و مرہم اور شیرازہ ان کے مجموعے ہیں۔

احسان صاحب نے ۱۹۸۲ء میں انتقال فرمایا

دیہات کی شام

سرخ مے برسا رہا تھا شام کا رنگیں شباب
جھک رہا تھا دور کھیتوں کے کنارے آفتاب

سرنگوں تھیں ٹہنیاں شرما رہے تھے سبزہ زار
آ رہی تھیں نیند کی پریاں ہواؤں پر سوار

دامنِ شب میں چھپی جاتی تھی فطرت کی امنگ
چھڑ رہی تھی آبشاروں میں سہانی جل ترنگ

آ چکی تھیں گاگریں بھر کر حسیں پنہاریاں
اٹھ رہا تھا گاؤں کے کچے مکانوں سے دھواں

بند کیں ذروں نے آنکھیں اور لہریں رک گئیں
رفتہ رفتہ شام کی دیوی کی آنکھیں جھک گئیں

راستوں میں ظلمتوں کے سانپ بل کھانے لگے
مست چرواہے چراگاہوں سے گھر آنے لگے

آسماں کے سرخ جلووں پر سیاہی آ گئی
جھٹپٹا سا ہو کے عالم پر اداسی چھا گئی

اوڑھ کر اک قیر گوں چادر بیاباں سو گیا
سبز کھیتوں پر خنک سایہ مسلط ہو گیا

خامشی پر رنگ آیا، شورشِ عالم گئی
آسماں پر انجمِ تاباں کی محفل جم گئی

شام کے اندھیر میں دن کا اجالا کھو گیا
آگ کے چوگرد دہقانوں کا جمگھٹ ہو گیا

ہالیوں کو مل گیا دن بھر کی محنت سے فراغ
ٹمٹمایا گاؤں کی چوپال میں دھندلا چراغ

مشورے ہونے لگے نشو و نما کے باب میں
سادہ خاطر بہہ چلے تقریر کے سیلاب میں

یہ ہیں وہ جن پر تغافُل کارگر ہوتا نہیں
جن کے دل میں کبر و نخوت کا گزر ہوتا نہیں

جن کی گردِ رہ گزر ہے غازۂ روئے بہار
جن کا شانہ روز سلجھاتا ہے زلفِ روزگار

جن کی فطرت سے ہوس ناکی ہے فرسنگوں پرے
شہرتوں سے جن کے کھوٹے بھی نکلتے ہیں کھرے

بازوؤں پر جن کے نازاں فطرتِ گلشن طراز
کاوشوں سے جن کی حسنِ انجمن مائل بہ ناز

واہ رے دیہات کے سادہ تمدُّن کی بہار
سادگی میں بھی ہے کیا کیا تیرا دامن زرنگار

دل یہ کہتا ہے فراقِ انجمن سہنے لگوں
شہر کی رنگینیاں چھوڑوں یہیں رہنے لگوں

———

(۱۷۳۶-۱۷۸۶ء)

میر غلام حسن نام اور حسن تخلّص ۔ میر حسن کے نام سے مشہور ہوئے ۔ دہلی میں ۱۷۳۶ء میں پیدا ہوئے ۔ ان کے جدِامجد میر امامی شہر ہرات کے ایک معزز خاندان سے تھے جو شاہجہاں کے عہدِحکومت کے آخری ایام میں دہلی آ گئے تھے۔ ان کے والد ضاحک اپنے زمانے کے ذی مرتبہ شاعر تھے ۔ میر حسن کے بیٹے خلیق اور پوتے میر انیس تھے جنھوں نے مرثیہ گوئی کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا ۔

میر حسن نے ابتدائی تعلیم اپنے والد میر ضاحک سے حاصل کی ۔ والد ہی کی صحبت میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا ۔ خواجہ میر درد دہلوی سے بھی اصلاح لیتے تھے ۔ کچھ مدت تک مرزا سودا سے بھی اصلاح لی ۔ درد ، سودا اور میر کا طرز سخن انھیں بے حد پسند تھا ۔

دہلی پر جب زوال آیا تو میر ضاحک مع اہل و عیال دہلی سے فیض آباد پہنچے ۔ یہاں میر حسن نواب سالار جنگ کی سرکار میں ملازم ہو گئے ۔ ۱۷۷۵ء میں جب دارالسلطنت فیض آباد سے لکھنئو منتقل ہوا تو پھر میر حسن بھی لکھنئو میں نواب آصف الدولہ کے پاس چلے آئے اور یہیں ۱۷۸۶ء میں وفات پائی ۔

میر حسن کی تصانیف میں ایک دیوان ، تذکرۂ شعرائے اُردو اور گیارہ مثنویات ہیں جن میں مثنوی سحرالبیان ،

گلزارِ ارم ، رموزالغافلین ، خوانِ نعمت بہت مشہور ہیں اور ان کی یادگار ہیں ۔

اُردو کے قدیم دور کی شاعری میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں ۔ میر اور سودا کی بھی کئی مثنویاں ان کے کلیات میں موجود ہیں ۔ مگر جو شہرت اور مقبولیت میر حسن کی سحرالبیان کو حاصل ہوئی ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی ۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" بھی اپنی نوعیت میں اُردو شاعری کا ایک شاہکار ہے مگر سحرالبیان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔

سحرالبیان کی تصنیف کو کم و بیش پونے دو سو برس ہو چکے ہیں ، اس کے باوجود زبان و محاورات میں آج کل کی سی صفائی ، شستگی اور برجستگی ہے ۔ کہیں بیانیہ طرز ہے ، کہیں سوال و جواب کا پیرایہ ۔ مگر دونوں صورتوں میں دلکشی اور دلآویزی ہے ۔ شوخی مضمون ، نوک جھونک کی برجستگی اور بیگمات کے مخصوص انداز گفتگو و محاورات نے قصے کو بہت دلآویز اور پُرلطف بنا دیا ہے ۔ میر حسن نے مثنوی میں جا بجا تشبیہات اور استعارات کے ذریعے رنگینی پیدا کی ہے ۔

سب سے بڑی خصوصیت مثنوی کے طرزِ ادا میں ہے ۔ جہاں جس قسم کے لوگوں کا ذکر آیا ہے ، انھیں کے مناسب الفاظ و اصطلاحات لائے گئے ہیں ۔ نجومیوں ، رمّالوں اور برہمنوں کا ذکر جہاں آیا ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے ان کی صحبت میں عمر گزاری ہے ۔ بزم عیش و نشاط کا سماں جہاں دکھایا ہے وہاں فن موسیقی کی اصطلاحات اور ساز و نغمے کے تنوّعات کی تفصیل ایک ماہرِ فن کی حیثیت سے دی ہے ۔ ان کے علاوہ تمام انسانی جذبات ، واقعات ، مناظر اور شادی بیاہ

کے رسوم کی دلکش تصویریں اس طرح کھینچی ہیں کہ ان کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

داستان باغ کی تیاری میں

مئے ارغوانی پلا ساقیا!
کہ تعمیر کو باغ کی دل چلا

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ
ہوا رشک سے جس کے لالے کو داغ

عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان
لگے جس میں زربفت کے سائبان

چقیں اور پردے بندھے زرنگار
دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہوا
کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا

وہ مقّیش کی ڈوریاں سر بسر
کہ مہ کا بندھا جس میں تارِ نظر

چقوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال
نگہ کو وہاں سے گزرنا محال

سنہری مغرّق چھتیں ساریاں
وہ دیوار اور در کی گل کاریاں

دیے ہر طرف آئینے جو لگا
گیا چوگنا لطف اس میں سما

وہ مخمل کا فرش اس کا ستھرا کہ بس
بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس

رہیں لخلخے اس میں روشن مُدام
معطر شب و روز جس سے مشام

چھپر کھٹ مرصّع کا دالان میں
چمکتا تھا اس طرح ہر آن میں

زمیں پر تھی اس طور اس کی جھمک
ستاروں کی جیسے فلک پر چمک

زمیں کا کروں واں کی کیا میں بیاں
کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں

بنی سنگِ مرمر سے چوپڑ کی نہر
گئی چار سو اس کے پانی کی لہر

قرینے سے گرد اس کے سروِ سہی
کچھ اک دور دور اس سے سیب و بہی

کہوں کیا میں کیفیتِ دار و بست
لگائے رہیں تاک واں مے پرست

ہوائے بہاری سے گل لہلہے
چمن سارے شاداب اور ڈہڈہے

زمرد کے مانند سبزے کا رنگ
روش پر جواہر لگا جیسے سنگ

روش کی صفائی پہ بے اختیار
گلِ اشرفی نے کیا زر نثار

چمن سے بھرا باغ گل سے چمن
کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن

چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا
کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا

کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشان
مدن بان کی اور ہی آن بان

کہیں ارغواں اور کہیں لالہ‌زار
جُدی اپنے موسم میں سب کی بہار

کہیں جعفری اور گیندا کہیں
سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں

عجب چاندنی میں گلوں کی بہار
ہر اک گُل سفیدی سے مہتاب زار

کھڑے سرو کی طرح چمپے کے جھاڑ
کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ

کہیں زرد نسریں کہیں نسترن
عجب رنگ پر زعفرانی چمن

پڑی آبِ جُو ہر طرف کو بہے
کریں قمریاں سرو پر چہچہے

گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا
اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر
نشے کا سا عالم گلستان پر

لیے ہاتھ میں بیلچے مالنیں
چمن کو لگیں دیکھنے بھالنیں

کہیں تخم پاشی کریں گود کر
پنیری جماویں کہیں کھود کر

کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال
رہیں ہاتھ جوں مست گردن میں ڈال

لبِ جُو پہ آئینے میں دیکھ قد
اکڑنا کھڑے سرو کا جد نہ تد

خراماں صبا صحن میں چار سو
دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بو

کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے
لیے ساتھ مرغابیوں کے پرے

صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور
درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور

چمن آتش گل سے دہکا ہوا
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے بھول
پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول

دَدا، دائیاں اور مغلانیاں
پھریں ہر طرف اس میں جلوہ کُناں

خواصوں کا اور لونڈیوں کا ہجوم
محل کی وہ چہلیں وہ آپس کی دھوم

تکلُّف کے پہنے پھریں سب لباس
رہیں رات دن شاہزادی کے پاس

کنیزانِ مہرو کی ہر طرف ریل
چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل

رنگیلی کوئی اور کوئی شام روپ
کوئی چت لگن اور کوئی کام روپ

کوئی کیتکی اور کوئی گلاب
کوئی مہ رتن اور کوئی ماہتاب

کوئی سیوتی اور ہنس مکھ کوئی
کوئی دل لگن اور تن سکھ کوئی

کہیں اپنے پٹے سنوارے کوئی
اری او رسیلی! پکارے کوئی

کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں
کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں

ادا سے کوئی بیٹھی حقہ پیئے
دمِ دوستی کوئی بھر بھر جیے

کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگائے
کوئی نہر پر پاؤں بیٹھی ہلائے

کوئی اپنے طوطے کی لیوے خبر
کوئی اپنی مینا پہ رکھے نظر

کسی کو کوئی ڈھول مارے کہیں
کوئی جان کو اپنی وارے کہیں

کوئی آرسی اپنے آگے دھرے
ادا سے کہیں بیٹھ کنگھی کرے

مقابہ کوئی کھول مسی لگائے
لبوں پر دھڑی کوئی اپنی جمائے

ہُوا ان گلوں سے دو بالا سماں
اسی باغ میں تھا وہ سرو رواں

جزو دوُم

حصۂ نثر

مختصر کہانیاں

میر امن دہلوی

اصل نام میر امان تھا اور تخلّص لطف۔ آپ کے آباء و اجداد، شہنشاہ ہمایوں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ آپ کا خاندان آخری مغل تاجدار تک حکومت کا وفادار اور جاں نثار رہا۔ میر امن کو اپنے دہلوی ہونے پر ناز تھا اور دہلی کی تباہی کا بڑا قلق تھا۔ آخر تنگ دستی کی بدولت یہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے۔ عظیم آباد میں ۳۵ برس گزارنے کے بعد کلکتے کا رخ کیا۔ نواب دلاور جنگ نے اپنے چھوٹے بھائی کاظم خاں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ لیکن یہ نوکری دو سال سے زیادہ نہ نبھی۔ اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج کلکتے کی بنیاد پڑی، تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو اردو سکھائی جائے۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ منتظم دارالترجمہ و صدر شعبۂ ہندوستانی فورٹ ولیم کالج کی فرمائش پر میر امن نے تحسین کے قصۂ "نو طرزِ مرصع" کو سلیس اردو میں لکھا۔ تحسین نے فارسی قصۂ چہار درویش کا آزاد ترجمہ کیا تھا۔ مگر اس کی زبان بہت مقفّٰی اور مسجّع تھی۔ میر امن نے قصے کا تاریخی نام "باغ و بہار" رکھا۔ میر امن نے یہ قصہ سنہ ۱۸۰۱ء میں لکھنا شروع کیا اور سنہ ۱۸۰۲ء میں تمام کیا۔ میر امن کی دوسری کتاب گنجِ خوبی ہے جو اخلاق محسنی کا ترجمہ ہے۔ افسوس کہ میر امن کی زندگی کے حالات اس سے زیادہ منظرِ عام پر نہیں آئے۔ اس لیے نہ ان کے سالِ ولادت کا علم ہے اور نہ سالِ وفات کا۔ نئی تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ میر امن سنہ ۱۸۰۶ء تک زندہ رہے۔

خواجۂ سگ پرست کی کہانی

خواجہ نے کہا : ''اے بادشاہ ! یہ مرد جو داہنی طرف ہے ، غلام کا بڑا بھائی ہے اور جو بائیں کو کھڑا ہے منجھلا برادر ہے - میں ان دونوں سے چھوٹا ہوں - میرا باپ ملک فارس میں سوداگر تھا- جب میں چودہ برس کا ہوا قبلہ گاہ نے رحلت کی - جب تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی اور پھول اٹھ چکے ، ایک روز ان دونوں بھائیوں نے مجھے کہا کہ ''اب باپ کا مال جو کچھ ہے تقسیم کر لیں - جس کا دل جو چاہے سو کرے - '' میں نے سن کر کہا ، ''اے بھائیو ! یہ کیا بات ہے ! میں تمھارا غلام ہوں - بھائی چارے کا دعوٰی نہیں رکھتا - ایک باپ مر گیا ، تم دونوں میرے پدر کی جگہ میرے سر پر قائم ہو - ایک نان خشک چاہتا ہوں ، جس سے زندگی بسر کروں اور تمھاری خدمت میں حاضر رہوں - مجھے حصے بخرے سے کیا کام ! تمھارے آگے کے جوٹھے سے اپنا پیٹ بھر لوں گا اور تمھارے پاس رہوں گا - میں لڑکا ہوں ، کچھ پڑھا لکھا بھی نہیں - مجھ سے کیا ہو سکے گا ابھی تو تم مجھے تربیت کرو - ''

یہ سن کر انھوں نے جواب دیا کہ ''تو چاہتا ہے اپنے ساتھ ہمیں بھی خراب اور محتاج کرے - '' میں چپکا ایک گوشے میں جا کر رونے لگا - پھر دل کو سمجھایا کہ بھائی آخر بزرگ ہیں - میری تعلیم کی خاطر چشم نمائی[1] کرتے ہیں کہ کچھ سیکھے - اسی فکر

---

۱ - مراد تنبیہ سے ہے -

میں سو گیا - صبح کو ایک پیادہ قاضی کا آیا اور مجھے دارالشرع میں
لے گیا - وہاں دیکھا تو یہی دونوں بھائی حاضر ہیں - قاضی نے کہا
"کیوں اپنے باپ کا ورثہ بانٹ چونٹ نہیں لیتا ؟" میں نے گھر میں
جو کہا تھا وہاں بھی وہی جواب دیا - بھائیوں نے کہا "اگر یہ
بات اپنے دل سے کہتا ہے تو ہمیں لا دعوٰی لکھ دے کہ باپ کے
مال سے مجھے کچھ علاقہ نہیں -" تب بھی میں نے یہی سمجھا کہ
یہ دونوں میرے بزرگ ہیں ، میری نصیحت کے واسطے کہتے ہیں
کہ باپ کا مال لے کر بے جا تصرّف نہ کرے - بموجب ان کی مرضی
کے فارغ خطی[۱] بہ مہر قاضی میں نے لکھ دی - یہ راضی ہوئے ،
میں گھر آیا - دوسرے دن مجھ سے کہنے لگے "اے بھائی ! یہ مکان
جس میں تو رہتا ہے ہمیں درکار ہے - تو اپنی بود و باش کی خاطر
اور جگہ لے کر جا رہ - "تب میں نے دریافت کیا کہ یہ باپ کی
حویلی میں بھی میرے رہنے سے خوش نہیں - لاچار ارادہ اٹھ جانے کا
کیا - جہاں پناہ ! جب میرا باپ جیتا تھا تو جس وقت سفر سے آتا
ہر ایک ملک کا تحفہ بطریق سوغات کے لاتا اور مجھے دیتا - اس
واسطے کہ چھوٹے بیٹے کو ہر کوئی زیادہ پیار کرتا ہے - میں نے
ان کو بیچ بیچ کر تھوڑی سی اپنی نج کی پونجی بہم پہنچائی تھی -
اسی سے کچھ خرید و فروخت کرتا - ایک بار ایک لونڈی میری
خاطر ترکستان سے میرا باپ لایا اور ایک دفعہ گھوڑے لے کر آیا -
ان میں سے ایک بچھڑا نا کند[۲] ، کہ ہونہار تھا وہ بھی مجھے دیا -
میں اپنے پاس سے دانہ گھاس اس کا کرتا تھا -

---

۱ - بے دخلی -
۲ - دودھ کے دانتوں کا بچھڑا ، دو برس کی عمر تک کا گھوڑا -

آخر ان کی بے مروتی دیکھ کر ، بیچ کر ایک حویلی خرید کی۔ وہاں جا رہا۔ یہ کتا بھی میرے ساتھ چلا آیا۔ واسطے ضروریات کے اسباب خانہ داری کا جمع کیا اور دو غلام خدمت کی خاطر مول لیے اور باقی پونجی سے ایک دکان بزازی کی کر کے خدا کے توکّل پر بیٹھا۔ اپنی قسمت پر راضی تھا۔ اگرچہ بھائیوں نے بد خلقی کی، پر خدا جو مہربان ہوا ، تین برس کے عرصے میں ایسی دکان جمی کہ میں صاحبِ اعتبار ہوا۔ سب سرکاروں میں جو تحفہ جاتا میری ہی دوکان سے جاتا۔ اس میں بہت سے روپے کمائے اور نہایت فراغت سے گذرنے لگی۔

اتفاقاً جمعہ کے روز میں گھر جا بیٹھا کہ ایک غلام میرا سودے سلف کو بازار گیا تھا ، بعد ایک دم کے روتا ہوا آیا۔ میں نے سبب پوچھا کہ تجھے کیا ہوا ؟ خفا ہو کر بولا کہ تمھیں کیا کام ہے ! تم خوشی مناؤ۔ لیکن قیامت میں کیا جواب دو گے ؟ میں نے کہا ، ”اے حبشی ایسی کیا بلا تجھ پر نازل ہوئی؟“ اس نے کہا ”یہ غضب ہے کہ تمھارے بڑے بھائیوں کی چوک کے چورا ہے میں ایک یہودی نے مشکیں باندھی ہیں اور قمچیاں مارتا ہے اور ہنستا ہے کہ اگر میرے روپے نہ دو گے تو مارتے مارتے مار ہی ڈالوں گا۔ بھلا مجھے ثواب تو ہو گا۔ پس تمھارے بھائیوں کی یہ نوبت اور تم بے فکر ہو ، یہ بات اچھی ہے ؟ لوگ کیا کہیں گے ؟ “ یہ بات غلام سے سنتے ہی لہو نے جوش مارا۔ ننگے پاؤں بازار کی طرف دوڑا اور غلاموں سے کہا۔ ”جلد روپیہ لے کر آؤ“۔ جونہی وہاں گیا دیکھا تو جو کچھ غلام نے کہا تھا سچ ہے۔ ان پر مار پڑ رہی ہے۔ حاکم کے پیادوں سے کہا ”واسطے خدا کے ذرا رہ جاؤ۔ میں یہودی سے پوچھوں کہ ایسی کیا تقصیر کی ہے ، جس کے بدلے میں یہ تعزیر کی ہے ؟“ یہ کہہ کر میں یہودی کے نزدیک گیا اور کہا

"آج روز آدینہ[1] ہے ان کو کیوں ضرب و شلاق[2] کر رہا ہے ؟"
اس نے جواب دیا "اگر حمایت کرتے ہو تو پوری کرو ۔ ان کے عوض روپے حوالہ کرو ، نہیں تو اپنے گھر کی راہ لو" ۔ میں نے کہا "کیسے روپے؟ دستاویز نکال ، میں روپے گن دیتا ہوں" ۔ اس نے کہا ۔ "تمسُّک حاکم کے پاس دے آیا ہوں ۔" اتنے میں میرے دونوں غلام دو بدرے[3] لے کر آئے ۔ ہزار روپے میں نے یہودی کو دیے اور بھائیوں کو چھڑایا ان کی یہ صورت ہو رہی تھی کہ بدن سے ننگے اور بھوکے پیاسے ۔ اپنے ہمراہ گھر میں لایا اور انھیں حمام میں نہلوایا ۔ نئی پوشاک پہنائی ، کھانا کھلایا ۔ ہرگز ان سے یہ نہ کہا کہ اتنا مال باپ کا تم نے کیا کیا ؟ شاید شرمندہ ہوں ۔

اے بادشاہ ! یہ دونوں موجود ہیں ، پوچھیے ! سچ کہتا ہوں یا کوئی بات جھوٹ بھی ہے ؟ خیر جب کئی دن میں مار کی کوفت سے بحال ہوئے ایک روز میں نے کہا ۔ "اے بھائیو ! اب اس شہر میں تم بے اعتبار ہو گئے ہو ۔ بہتر یہ ہے کہ چند روز سفر کرو ۔" یہ سن کر چپ ہو رہے ۔ میں نے معلوم کیا کہ راضی ہیں ۔ سفر کی تیاری کرنے لگا ۔ پال پرتل بار برداری اور سواری کی فکر کر کے بیس ہزار روپے کی جنس تجارت خرید کی ۔ ایک قافلہ سوداگروں کا بخارا جاتا تھا ان کے ساتھ کر دیا ۔ بعد ایک سال کے وہ کارواں پھر آیا ۔ ان کی خیر خبر کچھ نہ پائی ۔ آخر ایک آشنا سے قسمیں دے کر پوچھا ۔ اس نے کہا "جب بخارا میں گئے ایک نے جوئے خانہ

---

۱ ۔ روز آدینہ : جمعہ کا دن

۲ ۔ شلاق : بید یا چھڑی سے مارنا

۳ ۔ بدرا : ایک ہزار کی تھیلی ۔ بدرا کی جمع بدرے

میں اپنا تمام مال ہار دیا ۔ اب وہاں کی جاروب کشی کرتا ہے اور پھڑ[1] کو لیپتا پوتتا ہے ۔ جواری جو جمع ہوتے ہیں ان کی خدمت کرتا ہے ۔ وے بطریق خیرات کے کچھ دے دیتے ہیں ۔ وہاں گرگا[2] بنا پڑا رہتا ہے اور دوسرا بوزہ[3] فروش کی لڑکی پر عاشق ہوا ۔ اپنا سارا مال صرف کیا ۔ اب وہ بوزہ خانہ کی ٹہل کیا کرتا ہے ۔ قافلے کے آدمی اس لیے اب نہیں کہتے کہ تو شرمندہ ہوگا ۔"

یہ احوال اس شخص سے سن کر میری عجب حالت ہوئی ۔ مارے فکر کے نیند بھوک جاتی رہی ۔ زادِ راہ لے کر قصد بخارا کا کیا ۔ جب وہاں پہنچا ، دونوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے مکان میں لایا ۔ غسل کروا کر نئی پوشاک پہنائی اور ان کی خجالت کے ڈر سے ایک بات منہ پر نہ رکھی ۔ پھر مال سوداگری کا ان کے واسطے خریدا اور ارادہ گھر کا کیا ۔ جب نزدیک نیشاپور کے آیا ، ایک گاؤں میں مع مال اسباب ان کو چھوڑ کر گھر میں آیا ۔ اس لیے کہ میرے آنے کی کسی کو خبر نہ ہو ۔ بعد دو دن کے مشہور کیا کہ میرے بھائی سفر سے آئے ہیں ۔ کل ان کے استقبال کی خاطر جاؤں گا ۔ صبح کو چاہا کہ چلو ۔ ایک گرہست اسی موضع کا میرے پاس آیا اور فریاد کرنے لگا ۔ میں اس کی آواز سن کر باہر نکلا ۔ اسے روتا دیکھ کر پوچھا کہ کیوں زاری کرتا ہے ؟ وہ بولا "تمھارے بھائیوں کے سبب سے ہمارے گھر لوٹے گئے ۔ کاش کہ ان کو تم وہاں نہ چھوڑ آتے ۔"

میں نے پوچھا کہ " کیا مصیبت گزری ؟" بولا کہ رات کو

---

۱ ۔ پھڑ : جوا کھیلنے کا اڈا

۲ ۔ گرگا : چیلا مراد کمینہ ۔ خدمت گذار

۳ ۔ بوزہ : ایک قسم کی شراب ۔ بوزہ فروش ۔ شراب بیچنے والا

ڈاکا آیا۔ ان کا مال و اسباب لوٹا اور ہمارے گھر بھی لوٹ لیے گئے۔ میں نے افسوس کیا اور پوچھا کہ اب وے دونوں کہاں ہیں؟ کہا "شہر کے باہر ننگے مننگے خراب خستہ بیٹھے ہیں۔" وہیں دو جوڑے کپڑوں کے ساتھ لے کر گیا، پہنا کر گھر میں لایا۔ لوگ سن کر ان کو دیکھنے کو آتے تھے اور یہ مارے شرمندگی کے باہر نہ نکلتے تھے۔ تین مہینے اسی طرح گذارے۔ تب میں نے اپنے دل میں غور کی کہ کب تلک یہ کونے میں دبکے بیٹھے رہیں گے؟ بنے تو ان کو اپنے ساتھ سفر میں لے جاؤں۔

بھائیوں سے کہا۔ اگر فرمائیے تو یہ فدوی آپ کے ساتھ چلے؟" یہ سن کر خاموش ہو رہے۔ پھر لوازمہ سفر کا اور جنس سوداگری کی تیار کر کے چلا اور ان کو ساتھ لیا۔ جس وقت مال کی زکوٰۃ دے کر اسباب کشتی پر چڑھایا اور لنگر اٹھایا، ناؤ چلی، یہ کتا کنارے پر سو رہا تھا۔ جب چونکا اور جہاز کو منجدھار میں دیکھا، حیران ہو کر بھونکا اور دریا میں کود پڑا اور پیرنے لگا۔ میں نے ایک پنسوئی[1] دوڑا دی۔ بارے سگ کو لے کر کشتی میں پہنچایا۔ ایک مہینہ خیر و عافیت سے دریا میں گذرا۔ کہیں منجھلا بھائی ایک دن بڑے بھائی سے کہنے لگا چھوٹے بھائی کی منت اٹھانے سے بڑی شرمندگی حاصل ہوئی اس کا تدارک کیا کریں؟ بڑے نے جواب دیا کہ ایک صلاح دل میں ٹھہرائی ہے، اگر بن آوے تو بڑی بات ہے۔ آخر دونوں نے مصلحت کر کے تجویز کی کہ اسے مار ڈالیں اور سارے مال و اسباب پر قابض و مُتَصَرِّف ہوں۔

ایک دن، میں جہاز کی کوٹھڑی میں سوتا تھا کہ منجھلا بھائی آیا اور جلدی سے مجھے جگایا۔ میں ہڑ بڑا کر چونکا اور باہر

۱۔ پنسوئی: چھوٹی ڈونگی۔

نکلا - یہ کتا بھی میرے ساتھ ہو لیا - دیکھوں تو بڑا بھائی جہاز کی بار پر ہاتھ ٹیکے نہوڑا[1] ہوا تماشا دریا کا دیکھ رہا ہے اور مجھے پکارتا ہے - میں نے پاس جا کر کہا - "خیر .تو ہے؟" بولا: "عجب طرح کا تماشا ہو رہا ہے کہ دریائی آدمی موتی کی سیپیاں اور مونگے کے درخت ہاتھ میں لیے ہوئے ناچتے ہیں -" اگر اور کوئی ایسی بات خلافِ قیاس کہتا تو میں نہ مانتا - بڑے بھائی کے کہنے کو راست جانا - دیکھنے کو سر جھکایا - ہر چند نگاہ کی ، کچھ نظر نہ آیا اور وہ یہی کہتا رہا - اب دیکھا ؟ لیکن کچھ ہو تو دیکھوں - اس میں مجھے غافل پاکر منجھلے نے اچانک پیچھے آ کر ایسا دھکیلا کہ بے اختیار پانی میں گر پڑا اور وے رونے دھونے لگے کہ دوڑیو! ہمارا بھائی دریا میں ڈوبا - اتنے میں ناؤ بڑھ گئی اور دریا کی لہر مجھے کہیں سے کہیں لے گئی - غوطے پر غوطے کھاتا تھا اور موجوں میں چلا جاتا تھا - آخر تھک گیا - خدا کو یاد کرتا تھا ، کچھ بس نہ چلتا تھا - ایک بارگی کسو چیز پر ہاتھ پڑا ، آنکھ کھول کر دیکھا تو یہی کتا تھا - شاید جس دم مجھے دریا میں ڈالا میرے ساتھ یہ بھی کودا اور پیرتا ہوا میرے ساتھ لپٹا چلا جاتا تھا - میں نے اس کی دم پکڑ لی اللہ نے اس کو میری زندگی کا سبب کیا - سات دن اور رات یہی صورت گذری - آٹھویں دن کنارے جا لگے - طاقت مطلق نہ تھی - لیٹے لیٹے کروٹیں کھا کر جوں توں اپنے تئیں خشکی میں ڈالا - ایک دن بے ہوش پڑا رہا ، دوسرے دن کتے کی آواز کان میں گئی ، ہوش میں آیا - خدا کا شکر بجا لایا - ادھر اُدھر دیکھنے لگا - دور سے سواد[2] شہر کا نظر آیا ، لیکن قوت کہاں ارادہ کروں لاچار دو قدم چلتا ، پھر بیٹھتا ، اسی حالت سے شام تک کوس بھر راہ کاٹی -

---

۱ - نہوڑا : جھکا ہوا   ۲ - سواد : اطراف شہر

بیچ میں ایک پہاڑ ملا - رات کو وہاں پڑ رہا - صبح کو شہر میں داخل ہوا - جب بازار میں گیا ، نان بائی اور حلوائیوں کی دکانیں نظر آئیں - دل ترسنے لگا - نہ پاس پیسہ جو خرید کروں ، نہ جی چاہے کہ مفت مانگوں - اسی طرح اپنے دل کو تسلی دیتا ہوا کہ اگلی دکان سے لوں گا ، چلا جاتا تھا - آخر طاقت نہ رہی اور پیٹ میں آگ لگی - نزدیک تھا کہ روح بدن سے نکلے ، ناگاہ دو جوانوں کو دیکھا کہ لباس ، عجم کا پہنے اور ہاتھ پکڑے چلے آتے ہیں - ان کو دیکھ کر خوش ہوا کہ یہ اپنے ملک کے انسان ہیں ، شاید آشنا صورت ہوں - ان سے اپنا احوال کہوں گا - جب نزدیک آئے تو میرے دونوں برادر حقیقی تھے - دیکھ کر نپٹ شاد ہوا - شکر خدا کا کیا کہ خدا نے آبرو رکھ لی - غیر کے آگے ہاتھ نہ پسارا - نزدیک جا کر سلام کیا اور بڑے بھائی کا ہاتھ چوما - انھوں نے مجھے دیکھتے ہی غل و شور کیا - منجھلے بھائی نے طمانچہ مارا کہ میں لڑکھڑا کر گر پڑا - بڑے بھائی کا دامن پکڑا کہ شاید یہ حمایت کرے گا - اس نے بھی لات ماری -

غرض دونوں نے مجھے خوب خورد و خام[1] کیا اور حضرت یوسف کے بھائیوں کا سا کام کیا - ہر چند میں نے خدا کے واسطے دیے اور گھگھیایا ، ہرگز رحم نہ کھایا - ایک خلقت اکٹھی ہوئی ، سب نے پوچھا "اس کا کیا گناہ ہے؟" تب بھائیوں نے کہا کہ یہ کمبخت ہمارے بھائی کا نوکر تھا - سو اس کو دریا میں ڈال دیا اور مال و اسباب سب لے لیا - ہم مدت سے تلاش میں تھے -

---

۱ - خورد و خام کرنا : ذلیل کرنا

آج اس صورت سے نظر آیا اور مجھ سے پوچھتے تھے کہ "اے ظالم! یہ کیا تیرے دل میں آیا کہ ہمارے بھائی کو مار کھپایا؟ کیا ان نے تیری تقصیر کی تھی؟ ان نے تجھ سے کیا برا سلوک کیا کہ اپنا مختار بنایا تھا؟" پھر اُن دونوں نے اپنے گریبان چاک کر ڈالے اور بے اختیار جھوٹ موٹ اپنے بھائی کی خاطر روتے تھے اور لات مکی مجھ پر کرتے تھے۔

اس اثنا میں حاکم کے پیادے آئے اور ان کو ڈانٹا کہ کیوں مارتے ہو؟ اور میرا ہاتھ پکڑ کر کوتوال کے پاس لے گئے۔ یہ دونوں بھی ساتھ چلے اور حاکم سے بھی یہی کہا اور بطور رشوت کے کچھ دے کر اپنا انصاف چاہا اور خونِ ناحق کا دعوٰی کیا۔ حاکم نے مجھ سے پوچھا۔ میری یہ حالت تھی کہ مارے بھوک اور مار پیٹ کے طاقت گویائی کی نہ تھی، سر نیچے کیے کھڑا تھا۔ کچھ منہ سے جواب نہ نکلا۔ حاکم کو بھی یقین ہوا کہ یہ مقرر خونی ہے۔ فرمایا کہ اسے میدان میں لے جا کر سولی دو۔ جہاں پناہ! میں نے روپیے دے کر ان کو یہودی کی قید سے چھڑایا تھا، اس کے عوض انھوں نے روپیہ خرچ کر کے میری جان کا قصد کیا۔ یہ دونوں حاضر ہیں۔ ان سے پوچھیے کہ میں اس میں سرمو تفاوُت کہتا ہوں۔ خیر مجھے لے گئے۔ جب دار کو دیکھا، ہاتھ زندگی سے دھوئے۔ سوائے اس کتے کے کوئی میرا رونے والا نہ تھا۔ اس کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک آدمی کے پاؤں میں لوٹتا اور چلاتا تھا۔ کوئی لکڑی کوئی پتھر سے مارتا لیکن یہ اس جگہ سے نہ سرکتا اور میں روبقبلہ ہو کر خدا سے کہتا تھا کہ اس وقت میں تیری ذات کے سوا میرا کوئی نہیں جو آڑے آوے اور بے گناہ کو بچاوے۔ اب تو ہی بچاوے تو بچتا ہوں۔ یہ کہہ کر کلمہ شہادت کا پڑھ کر تیورا[1] کر گر پڑا۔ خدا کی حکمت سے اس

تیورا کر: چکر کھا کر

شہر کے بادشاہ کو قولنج کی بیماری ہوئی ۔ اُمراء اور حکیم جمع ہوئے۔ جو علاج کرتے تھے فائدہ نہ ہوتا تھا ۔ ایک بزرگ نے کہا کہ سب سے بہتر یہ دوا ہے کہ محتاجوں کو کچھ خیرات کرو اور بندی وانوں کو آزاد کرو ۔ دوا سے دعا میں بڑا اثر ہے ۔ یہ سنتے ہی بادشاہی چیلے بندی خانوں[1] کی طرف دوڑے ۔ اتفاقاً ایک اس میدان میں آنکلا ۔ ازدحام دیکھ کر معلوم کیا کہ کسو کو سولی چڑھاتے ہیں ۔ یہ سنتے ہی گھوڑے کو دار کے نزدیک لا کر تلوار سے طنابیں کاٹ دیں ۔ حاکم کے پیادوں کو ڈانٹا اور تنبیہ کی کہ ایسے وقت میں کہ بادشاہ کی یہ حالت ہے ، تم خدا کے بندے کو قتل کرتے ہو اور مجھے چھڑوا دیا ۔

---

۱ ۔ بندی خانہ : قید خانہ ۔

حیدر بخش حیدری

سید حیدر بخش حیدری کے آباء واجداد دہلی کے رہنے والے تھے مگر فکر معاش اور دہلی کی عام مجلسی ابتری نے ان کو اس قدر تنگ کیا کہ یہ اپنے والد سید ابوالحسن کے ساتھ دہلی سے نکل کر بنارس آ گئے ۔ حیدری کو بنارس میں سکون حاصل ہوا اور موقع سے انھوں نے فائدہ اٹھایا ۔ یہاں نواب علی ابراہیم خاں خلیل اور قاضی عبدالرشید جیسے عالم اور قابل اشخاص نے ان کو دینی اور دلیاوی تعلیم سے سرفراز فرمایا ۔ حیدری نے "توتا کہانی" میں اپنے آپ کو مولوی غلام حسین غازی پوری کا شاگرد لکھا ہے ۔

جان گِل کرِسٹ نے جب ہندوستان کے مختلف حصوں سے لائق اہلِ قلم فورٹ ولیم کالج کے لیے جمع کیے تو حیدری بھی وہاں پہنچے اور اُردو ادب کی خدمت کرنے والوں میں شامل ہو گئے ۔ "حاتم طائی" (آرائش محفل) ان کی مشہور کتاب ہے ۔ ان کی دوسری کتابیں توتا کہانی ، گلدستۂ حیدری ، جامع القوانین اور قصۂ مہروماہ ہیں ۔ حیدری کا طرزِ نگارش رواں اور سلیس ہے ۔ وہ نظم و نثر دونوں میں خاصی مہارت رکھتے تھے ۔ سادگی اور شیرینی ان کی تحریر کی جان ہیں ۔ اُردو ادب میں ان کا ایک مقام ہے ۔ انھوں نے ۱۸۲۳ء میں انتقال کیا ۔

حمام بادگرد

حاتم[1] شہر سے نکلا، جنگل کی راہ لی۔ ایک مدت کے بعد ایک بستی نظر آئی۔ شہر پناہ[2] کے باہر ایک پیر مرد کھڑا تھا۔ وہ حاتم کو اپنے گھر لے گیا۔ ضیافت کے بعد پیر مرد نے پوچھا "اے جوان! تیرا کیا نام ہے؟" اس نے کہا "حاتم نام ہے اور یمن کا رہنے والا ہوں، حمام بادگرد کی خبر کو جاتا ہوں۔" اس نے سر نیچا کر لیا اور کہا "اے عزیز! وہ کون ہے، جو تیرا دشمن ہے جس نے تجھے اس جگہ بھیجا ہے۔ وہاں جو گیا پھر نہ پھرا جو کوئی وہاں جانے کا قصد کرے اپنی جان سے ہاتھ دھوئے۔ راستے میں حارث شہر قطان کا بادشاہ ہے۔ اس کی سرحد پر چوکی بیٹھی ہے کہ جو کوئی اس جگہ کی خواہش کرے پہلے اس کو میرے پاس لے آؤ۔ معلوم نہیں اس کو رو برو بلانے کی کیا وجہ ہے۔ مار ڈالتا ہے یا اس کو چھوڑ دیتا ہے۔" یہ سن کر حاتم نے کہا کہ "حسن بانو سوداگر بچی سے منیر شامی شادی کرنا چاہتا ہے۔ اپنا خانماں برباد کر کے اس شہر کے کارواں سرا میں بیٹھ رہا ہے۔ اس کے واسطے یہ رنج اپنے اوپر گوارا کرکے کئی برس سے اس کے کام میں عنداللہ پھرتا ہوں۔ اس سوداگر بچی کے چھ سوال خدا کے فضل و کرم سے پورے کر چکا ہوں۔ اب ساتواں سوال حمام بادگرد کی خبر ہے، سو لینے جاتا ہوں۔ دیکھو قسمت کیا

۱۔ حاتم: طے کا رہنے والا ایک مشہور سخی اور خادم خلق جس کے بارے میں ایک کتاب "قصہ حاتم طائی" لکھی گئی ہے۔

۲۔ شہر پناہ: شہر کے چاروں طرف کی فصیل۔

دکھائے۔" پیر مرد بولا : "آفریں تجھ پر اور رحمت تیرے باپ اور ماں پر جو یگانے کے واسطے عیش و عشرت کو چھوڑ کر محنت اختیار کی ، مصیبت سہی۔"

حاتم (اس پیر مرد سے رخصت ہو حارث شاہ کے پاس پہنچا اور پھر) حارث شاہ کا شقہ لے کر حمام بادگرد کے دربان سے ملا۔ وہ اس کو حمام کے دروازے پر لے گیا۔ حاتم نے ایسا دروازہ عمر بھر نہ دیکھا تھا۔ جو آنکھ اٹھا کر غور کیا تو عبرانی[1] میں اس پر لکھا ہوا پایا کہ "یہ طلسم کیومرث[2] کے وقت کا بنا ہے۔ اس کا نشان مدتوں رہے گا اور جو کوئی اس طلسم میں جائے گا ، جیتا نہ نکلے گا ، وہیں بھوکا پیاسا سرگرداں رہے گا۔ اگر اس کی زندگی ہے تو ایک باغ میں رہے گا۔ وہاں جا کر اپنی حیات کے دن پورے کرے گا۔ پھر باہر نہ نکل سکے گا۔" حاتم نے لوگوں کو جو اس کے ساتھ گئے تھے ، رخصت کیا۔ آپ اندر گیا ، دس بارہ قدم چل کر پیچھے دیکھا تو آدمیوں کو نہ پایا اور نہ دروازہ ہی نظر آیا۔ مگر ایک جنگل لق و دق موجود تھا۔ مُتفکِر ہوا۔ دائیں بائیں نکل کر اضطراب سے ادھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ چند روز کے بعد ایک سمت کا راستہ لیا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ ایک آدمی پر نظر پڑی۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ اسی کی طرف آ رہا ہے۔ جب نزدیک پہنچا تو حاتم کو سلام کیا اور آئینہ بغل سے نکال کر حاتم کو دیا۔ حاتم نے لے کر اپنا منہ دیکھا اور پوچھا کہ "تو تو حجام ہے جو آئینہ دکھاتا ہے۔" اس نے کہا۔ "البتہ! جس شخص کو دیکھتا ہوں اسے لے جا کر حمام میں نہلاتا ہوں۔

۱۔ خط عبرانی : عبرانی رسم الخط جسے انگریزی میں Hebrew کہتے ہیں۔

۲۔ کیومرث : گودرز کا بیٹا۔ ایک ایرانی پہلوان۔

اگر آپ بھی چل کر حمام کریں تو آپ کی بدولت کچھ مل رہے گا۔" حاتم حجام کے ساتھ چلا۔ دو تین کوس چلے تھے کہ ایک گنبد نظر آیا۔ حجام حمام کے اندر گیا اور حاتم کو بلایا۔ وہ جونہی داخل ہوا، دروازہ بند ہو گیا۔ آخر کار حجام اسے ایک حوض پر لے گیا اور کہا کہ آپ اس میں اتریں تو میں بدن پر پانی ڈالوں اور لنگی پاکیزہ، بہت تحفہ، حاتم کو باندھنے کو دی۔ جب وہ حوض میں اترا تو حجام نے ایک بڑا طاس گرم پانی سے بھر کر اس کے ہاتھ میں دے دیا، جو اس نے سر پر ڈال لیا۔ جب تیسری مرتبہ حاتم نے طاس سر پر ڈالا، وہیں ایک تڑاقا ہوا کہ حمام میں اندھیرا ہو گیا۔ ایک ساعت کے بعد تاریکی جاتی رہی تو کیا دیکھتا ہے کہ نہ حجام ہے نہ حمام ہے نہ حوض۔ ایک تراشا ہوا گنبد ہے۔ اس کا تمام صحن پانی سے بھرا ہوا ہے۔ ایک دم نہ گزرا تھا کہ پانی پنڈلیوں تک آ گیا، حاتم عاجز ہو گیا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پانی بڑھ کر گھٹنوں سے بھی اونچا ہو گیا۔ تب وہ گھبرایا۔ یکایک مضطرب ہو کر دروازے کی طرف بڑھا۔ چاروں طرف سر ٹکرایا، راستہ نہ پایا۔ اتنے میں پانی ڈوباؤ ہو گیا۔ یہ تیراک تھا، تیرنے لگا۔ الغرض اس قدر بلند ہوا کہ اس کا سر گنبد میں جا لگا۔ یہ نہایت ماندہ ہوا۔ ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ قریب تھا کہ ایک ہی دفعہ بیٹھ جائے کہ ایک زنجیر لٹکی ہوئی دکھائی دی۔ حاتم نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے زنجیر پکڑ لی کہ پھر ویسی ہی آواز آئی اور اپنے آپ کو گنبد کے باہر جنگل میں کھڑا دیکھا۔ یکایک ایک عمارت عالی شان چمکتی ہوئی نظر آئی۔ اس طرف روانہ ہوا۔ جب نزدیک پہنچا ایک خوش قطع پُر فضا باغ دیکھا جس کا دروازہ کھلا تھا۔ حاتم اندر چلا گیا۔ وہاں طرح طرح کے درخت میوہ دار دیکھے۔ بھوکا تو تھا ہی، میوے توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ سو من کے قریب کھایا مگر پیٹ نہ

بھرا ۔ جب کھاتے کھاتے تھک گیا تو پھرتا پھراتا ایک بارہ
دری کے قریب جا پہنچا ۔ اس کے متصل بہت سے آدمی پتھر کے
بنے ہوئے برہنہ کھڑے صرف ایک لنگ باندھے ہوئے تھے ، مگر
وہ بھی پتھر کے۔ اتنے میں ایک طوطی پنجرے میں دیکھی ۔ پنجرے
پر لکھا تھا ''اے بندۂ خدا ! تو یہاں سے جان سلامت نہ لے
جائے گا ، یہ طلسم کیومرث شاہ کا ہے ۔ ایک دن بادشاہ شکار
کھیلتا ہوا اس جگہ آ نکلا تھا ۔ یہاں اس نے ایک الماس پڑا
دیکھا ۔ اٹھا کر تلوایا تو تین مثقال تھا ۔ سب نے کہا کہ حضرت
آدمؑ کے وقت سے ایسا الماس کسی نے دیکھا نہ سنا ۔ اس پر بادشاہ
نے وہ الماس اس طوطی کو نگلوایا اور طلسم حمام بادگرد بنوایا ۔
جواہر نگار کرسی پر کمان اور تیر اس لیے رکھ دیے ہیں کہ جو
کوئی اس طلسم میں وارد ہو اور یہاں سے نکلنے کا قصد کرے تو
اس طوطی کے سر پر تیر مارے ، اگر نشانہ ٹھیک بیٹھا تو رہا ہو
جائے گا ۔" حاتم نے بسم اللہ کرکے کمان اٹھا لی اور ایک تیر
مارا ۔ طوطی پھڑک کر پنجرے کی چھت سے لگ گئی ۔ تیر نے
خطا کی ۔ حاتم گھٹنوں تک پتھر کا ہو گیا ۔ طوطی نے کہا "یہاں
سے جا ، یہ مکان تیرے لائق نہیں ۔" حاتم وہاں سے مع تیر و
کمان سو قدم پیچھے جا پڑا اور اس کے پاؤں اس قدر بھاری ہو گئے
کہ اٹھ نہ سکا ۔ وھاں سے حاتم نے دوسرا تیر مارا لیکن وہ بھی
خطا ہو گیا ۔ حاتم ناف تک پتھر کا ہو گیا ۔ اس وقت طوطی نے
کہا "اے جوان پیچھے سرک ۔ یہ جگہ تیرے لائق نہیں ۔"
حاتم نے جست کی اور دو سو قدم ہٹ کر بتوں کے پاس جا پڑا
اب اس نے حالتِ یاس میں آنکھوں پر پٹی باندھی اور اللہ اکبر
کہہ کر تیسرا تیر چھوڑا جس سے طوطی کی روح پرواز کر گئی ۔
اندھیرا ہو گیا ۔ سوجھنے سے رہ گیا اور اس قدر شور و غوغا بلند
ہوا کہ حاتم بے ہوش ہو کر گر پڑا ۔ ایک ساعت کے بعد ۔ آندھی

رفع ہو گئی ، ابر جاتا رہا ، شور و غوغا موقوف ہو گیا ۔ حاتم کے حواس بجا ہوئے تو اس نے دیکھا کہ نہ وہ حمام ہے ، نہ وہ باغ ۔ نہ وہ کرسی ، نہ وہ پنجرہ ، نہ وہ طوطی ، مگر ایک الماس زمین پر پڑا ہوا تارہ سا چمک رہا ہے ۔ حاتم نے دوڑ کر اٹھا لیا اور سجدہ شکر ادا کیا ۔ سب پتھر کے بت زندہ ہو کر پھر اصل حالت میں آ گئے اور جب ان آدمیوں نے حاتم سے حقیقت معلوم کی تو اس کے قدموں پر گر پڑے اور کہا کہ ہم سب تیرے غلام ہیں ۔ اس میں کئی شہزادے بھی تھے ۔ حاتم ان کو لے کر شہر قطان میں آیا ۔ حارث کو سب کچھ دکھایا اور کہا یہ آپ کی نذر ہے ، صرف یہ چاہتا ہوں کہ حسن بانو کو دکھا کر آپ کی خدمت میں پہنچا دوں ۔ اس طرح پھر حاتم کئی مہینے کے عرصے میں بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ شاہ آباد میں داخل ہوا اور منیر شامی سے ملا ۔

(آرائشِ محفل سے اقتباس)

رجب علی بیگ سرور

(۱۷۸۶ء - ۱۸۶۷ء)

سُرُور کی پیدائش سنہ ۱۲۰۱ھ مطابق سنہ ۱۷۸۶ء لکھنئو میں ہوئی - ان کی تعلیم و تربیت بھی لکھنئو میں ہوئی - عربی فارسی میں اچھی قابلیت بہم پہنچائی - اس زمانے کے لکھنئو کے اساتذہ میں آغا نوازش حسین مشہور شاعر تھے - شاعری میں سرور ان کے شاگرد ہو گئے - نواب غازی الدین حیدر کی نوابی کا زمانہ تھا ، انھوں نے کسی بات پر ناراض ہو کر ان کو جلاوطن کر دیا - سرور کانپور چلے گئے - وہاں وہ سخت پریشان رہے - کسی طرح جی نہ لگتا تھا اور برابر لکھنئو آنے کے لیے کوشاں رہے - آخر کار نواب واجد علی شاہ کے عہد میں واپسی کا موقع ملا اور شعرائے دربار میں شامل ہوئے۔ انھوں نے حکمِ شاہی سے کتاب شمشیر خانی کا ترجمہ کیا جس کا نام سرور سلطانی رکھا گیا - سنۂ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے ایسے لوگوں کو خاص طور پر بالکل بے سہارا چھوڑ دیا - آخر کو مہاراجا بنارس کی طلبی پر بنارس پہنچے ، وہاں کے قیام میں انھوں نے دو عمدہ کتابیں "گلزار سرور" اور "شبستانِ سرور لکھیں جو ان کی انشاء پردازی کے اچھے نمونے ہیں - بالآخر سنہ ۱۲۸۴ھ مطابق سنہ ۱۸۶۷ء میں وفات پائی - سرور کی ایک اہم لیکن غیر مشہور کتاب " فسانۂ عبرت" ہے جس میں لکھنئو کی بادشاہت کے آخری ایام اور انتزاع سلطنت کا حال لکھا ہے - سرور کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ

"فسانۂ عجائب" ہے - یہ واقعہ ہے کہ فسانۂ عجائب ادب اردو میں ایک شاہکار ہے -

لکھنئو کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ دہلی سے فوقیت لے جائے - چنانچہ اسی جذبے کے نتیجے میں "فسانۂ عجائب" معرضِ وجود میں آئی - میر امن کی "باغ و بہار" عمدہ ، صاف اور سلاست میں لاجواب ہے - سرور کے "فسانۂ عجائب" میں عبارت نہایت رنگین ، مقفیٰ اور مسجّع ہے - جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء تک عام طور پر تحریری عبارت مرصّع ، مقفیٰ اور مسجّع زبان میں ہوتی تھی ، کیونکہ فارسی کا مرغوب رنگ یہی تھا - اردو کا یہ رنگ اسی کی تقلید میں تھا اور یہی پُر تکلف طرزِ نگارش قابلیت کا معیار سمجھا جاتا تھا - اس لحاظ سے سرور کی "فسانۂ عجائب" اس طرز کا بہت اچھا نمونہ ہے - اس میں شک نہیں کہ یہ طرز جس میں نظم کی طرح نثر میں بھی قافیے کی پابندی ہوتی تھی ادائے مطلب کے لیے ایک بڑی رکاوٹ تھی اور اسی وجہ سے اکثر تحریر عمدہ الفاظ کا ایک جال اور پوری عبارت گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی تھی -

سرور شاعر تھے لیکن ان کی نثر کی رنگینی اور دلچسپی کے آگے ان کی شاعری پھیکی ہے - اس زمانے میں صاحبِ دیوان ہونا شاعر کے لیے ضروری سا تھا - مگر سرور کا دیوان اب کہیں نہیں ملتا - ان کی بعض غزلیں ادھر ادھر ضرور ملتی ہیں۔ ان کے شاعرانہ جوہر کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے - شاعر ہونے کے علاوہ سرور ایک اعلیٰ درجے کے خطّاط بھی تھے -

---

شہزادہ جانِ عالم کی سواری

بلبلِ نواسنجِ ہزار داستان گلشنِ تقریر میں یوں چہکا ہے کہ بعد رسم شادی سیر و شکار کی اجازت ، سواری کا حکم شاہ ذوالاقتدار[۱] سے حاصل ہوا ۔ گاہ گاہ شام و پگاہ[۲] جان عالم سوار ہونے لگا ۔ ایک روز گذر اس کا گذری[۳] میں ہوا ۔ انبوہِ کثیر ، جم غفیر نظر آیا اور غلغلۂ تحسین و آفرین بلند پایا ۔ شہزادہ ادھر متوجّہ ہوا ۔ دیکھا ایک مرد پیر ، نحیف ، ستّر اسّی برس کا سن ، نہایت ضعیف ، پنجرا ہاتھ میں لیے کھڑا ہے ۔ اس میں ایک جانور مانند ساکنان جناں ، سبز پوش ، لطیفے ، لطیف رنگین بیان کرتا ہے۔

شہزادے کے دیکھتے ہی طوطا مالک سے بولا ، "اے شخص ! کوکب بخت تیرا افلاس کے برج تیرہ سے نکلا ۔ نصیب چمکا ۔ دیکھ ! ایسا شہزادۂ حاتم شعار ، ابر گوہر بار متوجہ اس مشت پر ذرۂ بے مقدار پر ہوا ہے ۔ وہ بیکار شے کارگاہ بے ثبات میں ہوں ، جس کا طالب نہیں کہیں ۔ بحدیکہ جانور ہوں اور بلی کا کھاجا[۴] ، مگر یہ جو نظر عنایت کرے ، ابھی تیرا ہاتھ پر زر ہو ، دامن گوہر سے بھرے ۔"

جانِ عالم نے یہ سخن ہوشربا ، کلمۂ حیرت افزا سن ، طوطے

---

۱ ۔ ذوالاقتدار : دبدبے والا ، صاحبِ اقتدار
۲ ۔ شام و پگاہ : صبح شام
۳ ۔ گذری : وہ بازار جہاں عموماً نیلامی کی چیزیں بکتی ہیں ۔
۴ ۔ کھاجا : خوراک

عقل کے اڑا، پنجرا اس جانور سحر بیان کا ہاتھ میں لے کے مالک سے قیمت پوچھی ۔ طوطے نے کہا!

کب لگاتا ہے کوئی اس دلِ بے حال کا مول
سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول

(مؤلف)

مگر جو حضور کی مرضی ۔ جان عالم نے لاکھ روپے خلعت کے سوا عنایت کیے اور پنجرہ ہاتھ میں لیے دولت سرا کو روانہ ہوا ۔ گھر میں جا، ماہ طلعت کو طوطا دکھا، یہ مصرع انشاء کا پڑھا:

بازار ہم گئے تھے اک چوٹ مول لائے

طوطے نے شہزادے کو سخنانِ دلچسپ، قصصِ عجیب، حکایاتِ غریب، شعرِ خوب، خمسہائے مرغوب سنا، اپنے دام محبت میں اسیر کیا ۔ یہ نوبت پہنچی کہ سوتے جاگتے دربار کے سوا جدا نہ ہوتا ۔ جب دربار جاتا، پنجرا بتاکید حفاظت ماہ طلعت کو سونپ جاتا، اور دربار سے دیوانہ وار بشوق گفتار بیقرار جلد پھر آتا ۔ ایک دن شہزادہ دربار گیا ۔ طوطا محل میں رہا ۔ اس روز ماہ طلعت نے غسل کیا اور لباسِ مکلف سے جسم آراستہ، زیور پُر تکلّف سے پیراستہ ہو، جواہر نگار کرسی پر بیٹھی ۔ ہوا جو لگی، آئینہ میں صورت دیکھ، خود محوِ تماشا ہوئی ۔ بحرِ عُجب و نخوت میں آشنا ہوئی ۔ خواصوں سے، جلیسوں سے جو دم ساز محرمِ راز تھیں اپنے حسن کی داد چاہی ۔ ہر ایک نے موافق عقل و شعور کے تعریف کی ۔ کسی نے کہا، ہلال عید ہو، کوئی بولی، خدا جانتا ہے دید ہو نہ شنید ہو ۔ اللہ تعالٰی نے بایں کثرت مخلوقات، تمھارا ہم سر از قسم جن و بشر بنایا نہیں ۔ پری نے یہ قد بالا، حور نے حسن کا جھمکڑا[1] پایا نہیں ۔ جب وہ کہہ چکیں، ماہ طلعت نے کہا طوطا بہت عقل مند،

---

۱ - جھمکڑا: مجموعہ ۔

ذی شعور ، سیاح نزدیک و دور ہے ، اس سے بھی پوچھنا ضرور ہے۔ مخاطب ہوئی - "اے مرغِ خوش خو و طائرِ سرخ رو ، بذلہ سنج ، بے رنج ! سچ کہنا ، اس سج دھج کی صورت کبھی تیرے طائرِ وہم و خیال کی نظر سے گذری ہے" نیرنگیٔ چرخِ کج رفتار ، فتنہ پردازیٔ گردوں واژوں عیاں ہے ، آگاہ سب جہان ہے - اس وقت طوطا رنجیدہ دل ، کبیدہ خاطر ، مضمحل بیٹھا تھا ، چپ ہو رہا - شہزادی نے پھر پوچھا ، طوطے نے بے اعتنائی سے کہا "ایسا ہی ہو -" یہ عورت معشوق مزاج ، طرّہ یہ کہ شہزادے کی جورو ، شوہر مالکِ تخت و تاج برہم ہو کے بولی "میاں مٹھو ! جینے سے خفا ہو جو ہمارے رو برو چبا چبا کر گفتگو کرتے ہو ؟" طوطے نے کہا "سوال و جواب اور دھمکانا اور حکومت سے ڈرانا ، غصے کی آنکھ دکھانا اور ہے - کیوں اُلجھتی ہو - شاید تم ہی سچی ہو -" پھر تو شعلہ غضب کا کانون[1] سینۂ شہزادی میں مشتعل ہوا - کہا "کیوں جانور بد تمیز ! ناچیز تیری موت آئی ہے ؟ کیا بیہودہ ٹیں ٹیں مچائی ہے ؟ واہی بک رہا ہے - ہمارا مرتبہ نہیں سمجھتا ہے؟" طوطے کے منہ سے نکلا "کیوں اتنی خفا ہوتی ہو ؟ اپنا منہ ملاحظہ کرو - صاحب تم بڑی خوب صورت ہو "؟ یہاں تو یہ حیص بیص تھی کہ جانِ عالم تشریف فرما ہوا - عجب صحبت دیکھی کہ شہزادی بچشم پُر آب و با دلِ کباب ، غیظ میں آ تھر تھرا ، طوطے سے بحث کر رہی ہے - شہزادے نے فرمایا ، "خیر باشد -" طوطا بولا ، "آج نرا شر ہے - خیر بخیر - مگر چندے حیات مستعار اس وحشی کی اور آب و دانہ قفس میں پینا کھانا باقی تھا - اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے ، تشریف نہ لاتے تو میرا طائرِ روح گربۂ غضب شہزادی سے مجروح پرواز کر جاتا ، ہرگز جیتا نہ پاتے مگر پنجرا خالی دیکھ مزاج عالی پریشان

---

۱ - کانون : بھٹی ، انگیٹھی

ہوتا۔ بہ حسرت و افسوس یہ فرماتے۔ انشاء:

طوطا ہمارا مر گیا کیا بولتا ہوا"

ماہ طلعت ان باتوں سے زیادہ مکدّر ہوئی شہزادے سے کہا: کہ اگر میری بات کا طوطا صاف جواب نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلووں سے اس کی آنکھیں ملوں گی، جب دال پانی کھاؤں پیوں گی۔ جان عالم نے کہا "کچھ حال تو کہو۔" طوطے نے گذارش کیا، حضور یہ مقدمہ غلام سے سنیے۔ آج شہزادی صاحبہ اپنی دانست میں بہت نکھر، (مصرع):

دیکھ آئینہ کہتی تھی کہ اللہ رے میں

پھر فرمایا مجھ سے، تو نے ایسی صورت کبھی دیکھی تھی؟ مجھ اجل رسیدہ کے منہ سے نکلا 'ایسا ہی ہو'۔ اس جرمِ قبیح پر شہزادی کے نزدیک کُشتنی، سوختنی، گردن زدنی ہوں، بقول میر تقی:

بے جرم تہِ تیغ ہی رکھا تھا گلے کو

کچھ بات بری منہ سے نہ نکلی تھی بھلے کو

جانِ عالم نے کہا۔ "تم بھی کتنی عقل سے خالی، حُمق سے بھری ہو، تم تو پری ہو۔ جانور کی بات پر آزردہ ہو؟ طائر پھر طائر ہے۔" میاں مٹھو کو ان باتوں کی تاب نہ آئی، آنکھ بدل کر روکھی صورت بنائی اور ٹیں سے بولے "خداوند نعمت! جھوٹ جھوٹ ہے، سچ سچ ہے، ہمسر جس کا کوئی نہیں ہے وہ ذاتِ وَحْدَہٗ لَاشَرِیکَ لَہٗ کی ہے۔ اس سوا ایک سے ایک بہتر و برتر ہے! وہ خود فرماتا ہے:

"فَضَّلْنَا بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ"۱ - میں نے تو جھوٹ اور سچ دونوں سے بچ کر ایک کلمہ کہا تھا - اگر راستی پر ہوتا گردن کج کیے سیدھا گور میں سوتا -" یہ سن کے وہ اور رنجور ہوئی۔ مثل مشہور ہے راج ہٹ ، تریاہٹ ، بانک ہٹ - جان عالم نے مجبور ہو کے کہا "جو ہو سو ہو - مٹھو پیارے سچ کہہ دو -" طوطے نے بہ منت عرض کی " دروغ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز"۔ مجھ سے سچ نہ بلوائیے - میرا منہ نہ کھلوائیے - انجام راستی حضور کے دشمنوں کو دشت نوردی ، بادیہ پیمائی ، غریب الوطنی ، کوچہ گردی نصیب ہوگی -" شہزادہ نے کہا "یہ جملہ تم نے اور نیا سنایا - اب جو کچھ کہنا ہے کہا چاہیے - باتیں بہت نہ بنائیے - اس نے کہا - "میں نے ہر چند چاہا ، آپ رنجِ سفر ، مصائب شہر بہ شہر ، ایذائے غربت سے باز رہیں کہ سفر اور سقر کی صورت ایک ہے، اس سے بچنا نیک ہے مگر معلوم ہوا کہ حضور کے مقدّر میں یہ امر لکھا ہے - میرا قصور اس میں کیا ہے - رفیع سودا - شعر

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو
سوزنِ تدبیر ساری عمر گو سیتی رہے

سنیے قبلہ عالم ! یہاں سے برس دن کی راہ شمال میں ایک ملک ہے ، عجائب زر نگار ، ایسا خطہ ہے کہ مرقع خیالِ مانی و بہزاد میں نہ کھنچا ہوگا اور پیر دہقان فلک نے مزرعۂ عالم میں نہ دیکھا ہوگا - شہر خوب ، آبادی مرغوب ، عورت مرد حسین طرح دار ، مکان بلّور کے بلکہ نور کے ، جواہر نگار ، عقلِ باریک بیناں مشاہدے سے دنگ ہو - خلقت اس کثرت سے بستی ہے کہ اس بستی میں وہم و فکر کو عرصہ تنگ ہو - خورشید ہر سحر اس

---

۱ - ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے -

کے دروازے سے ضیا پاتا ہے ، بدرِ کامل اس شہر میں غیرت سے کاہیدہ ہو ، ہلال نظر آتا ہے ، وہاں کی شہزادی انجمن آرا ، اس کا تو کیا کہنا ، کہاں میری زبان میں طاقت اور دہان میں طلاقت جو شمہ مذکور شکل و شمائل اس زہرہ جبیں ، فخر لعبتان لندن و چیں کا سناؤں ۔ شعر

ایک میں کیا خود اگر دیکھے اُسے حسن آفریں
اپنی صنّاعی پہ حیراں خود وہ صورت گر رہے

لیکن سات سو خواصیں زریں کمر ، تاج دلبری بر سر ، ماہرو ، عنبریں مو ، سرگروہ خوبان جناں ، جان جاناں ، آرام دل مشتاقاں اس کی خدمت میں شب و روز سرگرم خدمت گزاری بڑی تیاری سے رہتی ہیں ۔ اگر ان کی لونڈیوں کو شہزادی صاحبہ بنظر انصاف دیکھیں اور کچھ غیرت کو بھی کام فرمائیں ، یقین تو ہے چُلّو بھر پانی میں محجوب ہو کے ڈوب جائیں ۔'' ماہ طلعت یہ سُن کے سُن ہوئی ، سر جھکا لیا ۔ جان عالم نے پنجرہ اٹھا لیا ۔ دیوان خانے میں لے جا ، مفصّل حال دریافت کرنے لگا ۔ ہر دم دم سرد ، دل پر درد سے بھرنے لگا ۔

(فسانۂ عجائب اقتباس)

———

نصوح اور چھوٹے بیٹے سلیم کی گفتگو

اگلے دن چھوٹا بیٹا سلیم ابھی سو کر بھی نہیں اٹھا تھا کہ بیدارا نے آ جگایا کہ صاحبزادے اٹھیے بالا خانے پر میاں بلاتے ہیں۔ سلیم کی عمر اس وقت کچھ کم دس برس کی تھی۔ سلیم نے جو طلب کی خبر سنی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے ہاتھ منہ دھو، ماں سے آ کر پوچھنے لگا۔ اماں جان تم کو معلوم ہے، ابا جان نے کیوں بلایا ہے؟

ماں : بھائی مجھ کو کچھ خبر نہیں۔

سلیم : کچھ خفا تو نہیں ہیں۔

ماں : ابھی تو کوٹھے پر سے بھی نہیں اترے۔

سلیم : بیدارا! تجھ کو کچھ معلوم ہے؟

بیدارا : میاں میں اوپر لوٹا لینے گئی تھی۔ میاں اکیلے بیٹھے ہوئے کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں آنے لگی تو میاں نے آپ کا نام لیا اور کہا کہ ان کو بھیج دیجیو۔

سلیم : صورت سے کچھ غصہ تو نہیں معلوم ہوتا تھا؟

بیدارا : نہیں تو۔

سلمم : تو اماں جان! ذرا تم بھی میرے ساتھ چلو۔

ماں : میری گود میں لڑکی سوتی ہے۔ تم اتنا ڈرتے کیوں ہو؟ جاتے کیوں نہیں؟

سلیم : کچھ پوچھیں گے ؟

ماں : جو کچھ پوچھیں گے تم اس کا معقول طور پر جواب دینا ۔

" غرض سلیم ڈرتا ڈرتا اوپر گیا اور سلام کر کے الگ جا کھڑا ہوا ۔ باپ نے پیار سے بلا کر پاس بٹھا لیا اور پوچھا ۔ "کیوں صاحب ، ابھی مدرسے نہیں گئے ؟"

بیٹا : جی بس جاتا ہوں ، ابھی کوئی گھنٹے بھر کی دیر اور ہے ۔

باپ : تم اپنے بھائی کے ساتھ مدرسے جاتے ہو یا الگ ؟

بیٹا : کبھی کبھار بھائی جان کے ساتھ چلا جاتا ہوں ورنہ اکثر اکیلا جاتا ہوں ۔

باپ : کیوں ؟

بیٹا : اگلے مہینے امتحان ہونے والا ہے ۔ چھوٹے بھائی جان اسی کے واسطے تیاری کر رہے ہیں ۔ صبح سویرے اٹھ کر کسی ہم جماعت کے یہاں چلے جاتے ہیں ۔ وہاں ان کو دیر ہو جاتی ہے ، تو پھر گھر بھی نہیں آتے ۔ میں جاتا ہوں تو ان کو مدرسے میں پاتا ہوں ۔

باپ : کیا اپنے گھر میں جگہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے یہاں جاتے ہیں ؟

بیٹا : جگہ تو ہے مگر وہ کہتے تھے کہ یہاں بڑے بھائی جان کے پاس ہر وقت گنجفہ اور شطرنج ہوا کرتا ہے ۔ اطمینان کے ساتھ پڑھنا نہیں ہو سکتا ۔

باپ : تم بھی شطرنج کھیلنی جانتے ہو ؟

بیٹا : مہرے پہچانتا ہوں ، چالیں جانتا ہوں ، مگر کبھی خود کھیلنے کا اتفاق نہیں ہوا ۔

باپ : مگر زیادہ دنوں تک دیکھتے دیکھتے یقین ہے کہ تم بھی کھیلنے لگو گے ۔

بیٹا : شاید مجھ کو عمر بھر شطرنج کھیلنی نہ آئے گی ۔

باپ : کیوں ، کیا ایسی مشکل ہے ؟

بیٹا : مشکل ہو یا نہ ہو ۔ میرا جی ہی نہیں لگتا ۔

باپ : سبب ؟

بیٹا : میں پسند نہیں کرتا ۔

باپ : چونکہ مشکل ہے ، اکثر مبتدی گھبرایا کرتے ہیں مجھ کو یقین ہے کہ گنجفہ میں تمھاری طبیعت خوب لگتی ہوگی ۔ وہ بہ نسبت شطرنج کے بہت آسان ہے ۔

بیٹا : میں شطرنج کی نسبت گنجفہ کو زیادہ ناپسند کرتا ہوں ۔

باپ : ہاں شطرنج میں طبیعت پر زور پڑتا ہے اور گنجفہ میں حافظہ پر ۔

بیٹا : میری ناپسندیدگی کا خاص کر کچھ یہی سبب نہیں ہے بلکہ مجھ کو سارے کھیل برے معلوم ہوتے ہیں ۔

باپ : تمھاری اس بات سے مجھ کو تعجُّب ہوتا ہے اور میں تم سے تمھاری ناپسندیدگی کا اصلی سبب سننا چاہتا ہوں کیونکہ شاید اب سے پانچ یا چھ مہینے پہلے جن دنوں میں باہر کے مکان میں بیٹھا کرتا تھا ، میں نے خود تم کو ہر طرح کے کھیلوں میں نہایت شوق کے ساتھ شریک ہوتے دیکھا تھا ۔

بیٹا : آپ درست فرماتے ہیں ۔ میں ہمیشہ کھیل کے پیچھے دیوانہ بنا رہتا تھا ۔ مگر اب تو مجھ کو ایک دلی نفرت ہوگئی ہے ۔

باپ : آخر اس کا کوئی سبب خاص ہوگا۔

بیٹا : آپ نے اکثر چار لڑکوں کو کتابیں بغل میں دابے اندر گلی میں آتے جاتے دیکھا ہوگا۔

باپ : وہی جو گورے گورے چار لڑکے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ بھدی جوتیاں پہنے، منڈے ہوئے سر، اونچے پاجامے، نیچی چولیاں۔

بیٹا : ہاں جناب وہی چار لڑکے۔

باپ : پھر!

بیٹا : بھلا آپ نے کبھی ان کو کسی قسم کی شرارت بھی کرتے دیکھا ہے؟

باپ : کبھی نہیں۔

بیٹا : جناب کچھ عجب عادت ان لڑکوں کی ہے، راہ چلتے ہیں تو گردن نیچی کیے ہوئے، اپنے سے بڑا مل جائے، جان پہچان ہو یا نہ ہو ان کو سلام کر لینا ضرور۔ کئی برس سے اس محلے میں رہتے ہیں مگر کانوں کان خبر نہیں۔ محلے میں کوڑیوں لڑکے بھرے پڑے ہیں لیکن ان کو کسی سے کچھ واسطہ نہیں۔ آپس میں اوپر تلے کے چاروں بھائی ہیں۔ نہ کبھی جھگڑتے، نہ گالیاں بکتے، نہ قسم کھاتے، نہ جھوٹ بولتے، نہ کسی کو چھیڑتے، نہ کسی پر آوازے کستے۔ ہمارے ہی مدرسے میں پڑھتے ہیں۔ وہاں بھی ان کا یہی حال ہے۔ کبھی کسی نے ان کی جھوٹی شکایت بھی تو نہیں کی۔ ڈیڑھ بجے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوا کرتی ہے۔ لڑکے کھیل کود میں لگ جاتے ہیں یہ چاروں بھائی ایک پاس کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں۔

باپ : بھلا پھر ؟

بیٹا : منجھلا لڑکا میرا ہم جماعت ہے ۔ ایک دن میرا آموختہ یاد نہ تھا ، مولوی صاحب نہایت ناخوش ہوئے اور اس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے فرمایا کہ کمبخت گھر سے گھر ملا ہے ۔ اسی کے پاس جا کر یاد کر لیا کر ۔ میں نے جو پوچھا کیوں صاحب یاد کروا دیا کرو گے ، تو کہا ، بسر و چشم[۱] ۔ غرض میں اگلے دن اُن کے گھر گیا ، آواز دی ۔ انھوں نے مجھ کو اندر بلا لیا ۔ دیکھا کہ ایک بہت بوڑھی سی عورت تخت پر جائے نماز بچھائے ، قبلہ رو بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی ہیں ۔ وہ ان لڑکوں کی نانی ہیں ۔ لوگ ان کو حضرت بی کہتے ہیں ۔ میں سیدھا سامنے دالان میں اپنے ہم جماعت کے ساتھ جا بیٹھا ۔ حضرت بی اپنے پڑھنے سے فارغ ہوئیں تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا ! گو تم نے مجھ کو سلام نہیں کیا لیکن ضرور ہے کہ میں تم کو دعا دوں ۔ جیتے رہو ۔ عمر دراز ہو ۔ خدا نیک ہدایت دے ۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ میں غیرت کے مارے زمین میں گڑ گیا اور فوراً میں نے اُٹھ کر نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا ۔ تب حضرت بی نے فرمایا کہ بیٹا ! برا مت ماننا یہ بھلے مانسوں کا دستور ہے کہ اپنے سے جو بڑا ہوتا ہے اس کو سلام کر لیا کرتے ہیں ۔ میں تم کو نہ ٹوکتی لیکن تم میرے بچوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہو اس سبب سے مجھ کو جتا دینا ضرور تھا ۔ اس کے بعد حضرت بی نے مجھ کو مٹھائی دی اور بڑا اصرار کر کے کھلائی ۔ مدتوں میں ان کے گھر جاتا رہا ۔ حضرت بی مجھ کو بھی اپنے نواسوں کی طرح چاہنے اور پیار

---

۱ ۔ مراد بڑی خوشی سے ۔

کرنے لگیں اور مجھ کو ہمیشہ نصیحت کیا کرتی تھیں - تب ہی سے میرا دل تمام کھیل کی باتوں سے کھٹا ہو گیا۔

باپ : یہ تو تم نے اچھا اختصار کیا۔ ابھی سب باتیں مجھ کو سناؤ ، کیا تم سے حضرت بی نے کہا ؟

بیٹا : ہر روز آنے جانے سے میں ان لوگوں کے ساتھ خوب بے تکلف ہو گیا۔ مگر حضرت بی نے بس پہلے دن سلام نہ کرنے پر ٹوکا تھا ، پھر کوئی گرفت نہیں کی - باوجودیکہ میں شوخی بھی کیا کرتا تھا لیکن وہ خفا نہ ہوتی تھیں - ایک دن مجھ سے اور ایک ہمسائے کے لڑکے سے باہر گلی میں کھیلتے کھیلتے عین انھی کے دروازے پر لڑائی ہو پڑی - سخت کلامی کے بعد گالی گلوچ کی نوبت پہنچی - پھر مار کٹائی ہونے لگی - لڑکا تھا مجھ سے کمزور - ذرا اڑنگے پر چڑھا جو ایک پٹخنی دیتا ہوں ، چاروں شانے چت - پھر تو میں اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور بچا کو ایسے گھسے دیے کہ یاد ہی کیے ہوں گے - اگر لوگ چھڑوا نہ دیتے تو میں اس کو ادھ موا کر ہی چکا تھا۔ بارے دو چار آدمیوں نے مجھ کو اس پر سے اتارا اور دو ایک نے میری پیٹھ بھی ٹھوکی کہ شاباش ! پٹھے شاباش ! لیکن وہ لڑکا ایسا چیند باز[1] تھا کہ پھر خم ٹھونک کر سامنے آکھڑا ہوا - میں چاہتا تھا کہ پھر گتھ[2] جاؤں - اتنے میں اندر سے اسی میرے ہم جماعت نے آواز دی - ادھر لوگوں نے کہا کہ میاں جانے بھی دو - یہ تمھارے جوڑ کا نہیں ہے - غرض میں اندر چلا گیا - میرے ہم جماعت

---

۱ - دھوکہ باز ، بے ایمان -

۲ - بھڑ جاؤں -

نے پوچھا کیوں جی کس سے لڑ رہے تھے ؟ میں نے کہا ، یہی کنجڑے والا رمضانی ، کمزور مار کھانے کی نشانی ۔ لیکن خدا کی قسم میں نے بھی آج اس کو ایسا رگڑا ہے کہ یاد ہی کرے گا ۔ اس وقت تک غصہ اور طیش تو فرو ہوا ہی تو نہ تھا ۔ نہیں معلوم کیا کیا میں نے بکا کہ سب گھر والوں نے سن کر آنکھیں نیچی کر لیں اور بڑی دیر تک سرنگوں بیٹھے رہے ۔ آخر حضرت بی بولیں کہ سلیم بڑے افسوس کی بات ہے کہ تو ایسا پیارا لڑکا اور گن تیرے ایسے خراب ، اس منہ سے ایسی باتیں ۔ آج کئی دن سے میں تجھ کو سمجھانے والی تھی مگر اس وقت جو میں نے تیری گفتگو سنی مجھ کو یقین ہو گیا کہ تجھ کو سمجھانا بے سود ہے ۔ بڑا رنج تو مجھ کو اس بات کا ہے کہ تو ہاتھ گیا گزرا ہوا ، دوسرا کھٹکا یہ ہے کہ تو میرے لڑکوں کے پاس آتا جاتا ہے ۔ اگر خدا نخواستہ تیری خو بو[1] کا ایک شمہ انھوں نے اختیار کیا تو میری طرف سے یہ جیتے جی مر لیے ۔ ملنا جلنا تو بڑی بات ہے ، اب یہ محلہ مجھ کو چھوڑنا پڑا ۔ اتنی بے حیائی ، ایسی بد زبانی ۔ اول تو لڑنا اور پھر گلی کوچے میں اور اس پر ایسی موٹی موٹی گالیاں ۔

میں : خدا کی قسم میں نے ہرگز پہل نہیں کی وہ سر پر چڑھ کر مجھ سے لڑا ۔

حضرت بی : بس اپنی قسموں کو بند کرو ۔ میں قسم اور گالی دونوں کو برا سمجھتی ہوں ۔ جس کو بے موقع بے محل خدا کا

---

۱ - عادت

نام لینے میں باک نہیں اس کو کسی بات کے بک دینے میں تأمل نہیں۔

میں : گالی بھی پہلے اس نے مجھ کو دی۔

حضرت بی : تم نے کیوں گالی کھانے کی بات کی،

میں : یہی تو میں عرض کرتا ہوں کہ میرا مطلق قصور نہ تھا۔

حضرت بی : کیا ایسے بیہودہ لڑکے سے ملاقات رکھنا تمھارا قصور نہیں ہے؟

میں : جناب آپ کو معلوم نہیں وہ لڑکا راہ چلتوں کے سر ہوتا ہے۔

حضرت بی : یک نہ شد دو شد[1] دروغ گویم بر روئے تو[2]، میرے لڑکوں کے تو کوئی بھی سر نہیں ہوتا۔

میں : ان سے تو سرے سے جان پہچان ہی نہیں۔

حضرت بی : اور تم سے ہے۔

میں : کیوں کر کہوں کہ نہیں ہے۔

حضرت بی : ہے، تو وہی تمھارا قصور ہے اور اس کی یہ سزا ہے کہ تم نے بازار میں گالیاں کھائیں۔

میں : لیکن میں نے بھی خوب بدلا لیا۔

حضرت بی : بس یہی تو تمھاری خرابی کے لچھن ہیں کہ تم اسی کو بدلا سمجھتے ہو۔ اگر ایک شخص تمھارے ساتھ کچھ برائی کرے تو لوگ اس کو برا کیوں کہیں گے!

میں : ضرور کہیں گے۔

حضرت بی : اور جب تم اس کے ساتھ زیادہ برائی کرو تو زیادہ

۱۔ ایک نہ ہوئی دو ہوئی یعنی اب تو جرم اور بڑھ گیا۔

۲۔ تمھارے منہ پر جھوٹ بولتا ہوں۔

کو نماز سکھائی ، اس کے معنی سمجھائے اور اسی طرح انھوں نے مجھ کو ہزار ہا نصیحتیں کیں کہ ہر زبان یاد نہیں رہیں ، مگر افسوس ہے کہ کئی مہینے سے ان کے گھر میرا جانا چھوٹ گیا ۔ یہ کہہ کر سلیم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔

باپ : تم نے ان کے یہاں جانا کیوں ترک کیا ، کیا ان کے نواسوں سے لڑائی ہو گئی ؟

بیٹا : جناب ان کے نواسے مجھ کو بھائیوں سے کہیں زیادہ عزیز ہیں ۔ اگر میں ان سے لڑتا تو دنیا میں مجھ سے زیادہ نالائق کوئی نہ تھا ۔

باپ : تو کیا پھر حضرت بی تم سے ناخوش ہو گئیں ؟

بیٹا : استغفراللہ ! وہ تو خود اس درجے کی نیک ہیں کہ غصہ ان کو چھو ہی نہیں گیا ۔

باپ : تو کیا تم آپ سے آپ بیٹھ رہے ؟

بیٹا : میں تو ہر روز وہاں جانے کے واسطے تڑپتا ہوں ۔

باپ : تو کیا تم کو کسی نے منع کر دیا ہے ؟

بیٹا : نہیں کسی نے منع بھی نہیں کیا ۔

باب : پھر کیا سبب ہوا ؟

بیٹا : اگر آپ مجھ کو اس کا سبب بیان کرنے سے معاف رکھئے تو بہتر تھا ۔

باپ : نہیں ضرور ہے کہ میں تمھارے نہ جانے کا سبب معلوم کروں ۔

بیٹا : اس میں ایک شخص کی شکایت ہوگی اور حضرت بی نے مجھ کو غِیبت اور چغلی کی ممانعت کی ہے ۔

باپ : لیکن کیا وہاں کے نہ جانے سے تمھارا نقصان نہیں ہے ؟

بیٹا : اے جناب ! نقصان سا نقصان ہے ، مگر میرے اختیار کی بات نہیں ۔

باپ : تو میں تم کو اپنے منصب پدری کی رو سے حکم دیتا ہوں کہ تم سارا حال پوست کندہ[۱] کرو ۔

بیٹا : جناب حضرت بی نے ایک مرتبہ مجھ کو بہ تاکید کہا تھا کہ تم اپنے سر کے بال منڈوا ڈالو ۔ اگرچہ مجھ کو بال بہت عزیز تھے اور میں ان کی خدمت بھی کرتا تھا لیکن چونکہ مجھ کو یقین تھا کہ حضرت بی جو بات بھی کہتی ہیں ضرور میری مَنفعت کے واسطے کہتی ہیں ، میں نے کہا بہت خوب ۔ حضرت بی نے کچھ اور سبب تو نہیں بیان کیا مگر اتنا کہا کہ بالوں کی بزرگ داشت میں تمھارا بہت سا وقت صرف ہوتا ہے اور وقت ایسی چیز نہیں ہے کہ اسے ایسی فضول باتوں میں صرف کیا جائے اور تم کو بڑے بال رکھنے کی کچھ ضرورت بھی نہیں ہے ۔ اگلے دن جو حجام بڑے بھائی جان کا خط بنانے آیا میں نے کہا ۔ خلیفہ! میرے بال بھی مونڈ دینا ۔ بالوں کا مونڈنا سن کر بڑے بھائی جان اس قدر خفا ہوئے کہ میں عرض نہیں کر سکتا ۔ مجھ کو جو چاہتے کہَ لیتے ، حضرت بی اور ان کے نواسوں کو بہت برا بھلا کہا ۔

یہ کہَ کر سلیم کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے ۔

(توبۃالنصوح سے اقتباس)

---

۱ ۔ کھُلّم کھلا بیان کرو ۔ صاف صاف بتاؤ ۔

(۱۸۷۳ء - ۱۹۵۵ء)

آپ کا نام علی حسن مگر مشہور نام حسن نظامی تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے نسبت رکھتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے بھی وابستہ رہے۔ آپ ۲ محرم ۱۲۹۶ھ کو پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی تعلیم کے حصول کے بعد انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے مگر شُدبُد کے سوا اس میں کوئی ترقی نہیں کی۔

ادب اور لکھنے لکھانے کا شوق اس طرح ہوا کہ ایک بار ایک اخبار اُن کی نظر سے گزرا۔ اُس کے مضامین پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور خود بھی لکھنا شروع کر دیا۔ یہ شوق اتنا بڑھا کہ بارہ سال کے عرصے میں چالیس سے زیادہ کتابیں تصنیف کر ڈالیں۔ شروع ہی سے صوفیانہ ماحول ملا تھا۔ اس لیے خواجہ صاحب خود بھی صوفی ہوئے اور ہندوستان میں بہت سے لوگ آپ کے مرید ہوئے۔ آپ ہندوؤں کو بھی مرید کیا کرتے تھے۔

خواجہ صاحب کی پہلی تصنیف مفلسی کا مجرّب علاج ہے۔ آپ کی نثر سادگی اور پُرکاری کا بہترین مرقّع ہے۔ خیال سے خیال اور بات سے بات پیدا کرتے ہیں۔ روانی اور سلاست ان کی تحریر کے خاص جوہر ہیں یہ رنگ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات بیان کرنے میں نمایاں ہے۔ اس کی وجہ سے خواجہ صاحب پڑھنے والے پر ایک خاص کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ آپ کا شمار صاحبِ طرز انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے معمولی سے معمولی عنوانات پر اپنا قلم اُٹھایا اور انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ۔ مثلاً جھینگر، دیا سلائی، مکھ ایک دھوبی ہوں، یک پیسہ کا سفرنامہ اور اوس وغیرہ۔ ان سے ان کی جزئیات نگاری اور کافی مطالعہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

شہزادی کی بپتا

ہونے کو تو غدر[۱] پچاس برس کی کہانی ہے مگر مجھ سے پوچھو تو کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ان دنوں میری عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔ میں اپنے بھائی یاور شاہ سے دو برس چھوٹی اور مرنے والی بہن ناز بانو سے چھ سال بڑی ہوں۔ میرا نام سلطان بانو ہے۔ ابا جان مرزا قریش بہادر ظلِ سبحانی حضرت بہادر شاہ کے چہیتے اور ہونہار فرزند تھے۔

بھائی یاور شاہ اور ہم بہنوں میں بڑی محبت تھی۔ بس ایک دوسرے پر فدا تھے۔ آکا بھائی کے لیے باہر کئی استاد طرح طرح کی باتیں سکھانے والے رہتے تھے۔ کوئی حافظ تھا اور کوئی مولوی، کوئی خوش نویس تھا اور کوئی تیر انداز۔

ہم محل کے اندر سینا پرونا اور کشیدہ کاڑھنا، مغلانیوں[۲] سے سیکھتے تھے۔ دستور تھا کہ حضرت ظلِ سبحانی جن بچوں اور بڑوں پر خاص نظرِ عنایت رکھتے تھے ان کو صبح کا کھانا شاہی دسترخوان

۱۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جس میں ہندو اور مسلمان مل کر انگریزوں کو اپنے ملک سے نکالنا چاہتے تھے۔ غدر کا مفہوم افراتفری ہے جب کہ قانون کی پابندی ختم ہو گئی ہو، بلوہ۔ انگریزوں نے اسے غدر کا نام دیا ہے۔

۲۔ مغلانیاں: مغل نام ایک قوم کا ہے جو اعلیٰ قوم ترکستان کی ہے۔ مغلانیوں کے معنی مغلوں کی اہلیہ کے ہیں مگر یہاں پر مراد وہ مغل سہیلیاں اور اصیلیں ہیں جو شاہی قلعہ میں رہتی تھیں۔ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر مامور ہوتی تھیں۔

پر حضور والا کے ہمراہ کھلایا جاتا تھا - چنانچہ ظِلِّ سُبحانی مجھ کو بھی بہت چاہتے تھے اور میں ہمیشہ صبح کے وقت کھانے کے واسطے بلائی جاتی تھی - جب میں نے ہوش سنبھالا اور ابوبکر کے لڑکے مرزا سہراب سے میری نسبت ٹھہر گئی تو حضور کے دسترخوان پر جاتے ہوئے شرم آتی تھی کیونکہ وہاں مرزا سہراب بھی کھانا کھانے آیا کرتے تھے - اگرچہ ہمارے کل خاندان میں باہم پردہ نہ تھا اور نہ اب ہے - شرعی نامحرم[1] گھر میں آتے جاتے تھے مگر میں اپنی طبیعت سے مجبور تھی - مجھے ایک آن کے لیے کسی غیر مرد کے سامنے جانا گوارا نہ تھا - پر کیا کرتی حضور کے حکم کے خلاف دسترخوان پر کس طرح نہ جاتی - اول تو آداب سلطانی کے باعث ہم سب نظریں جھکائے رکھتے تھے - مجال نہ تھی کہ ایک بھی ادھر اُدھر دیکھے یا آواز سے بولے - سب چپ چاپ مجرا[2] عرض کر کے اپنے قرینے سے بیٹھ جاتے تھے - قاعدہ تھا کہ جب حضور معلّیٰ کوئی خاص کھانا کسی کو مرحمت فرماتے تو وہ بچہ ہو یا جوان عورت ہو یا مرد ، اپنی جگہ سے اٹھ کر جائے ادب پہ جاتا اور جھک کر تین سلام بجا لاتا - ایک دن میرے ساتھ بھی یہی اتفاق پیش آیا کہ حضور نے ایک نئی قسم کا ایرانی کھانا مجھ کو عطا کیا اور فرمایا "سلطانہ - سلطانہ ! تو تو کچھ کھاتی ہی نہیں ، ادب و لحاظ ایک حد تک اچھا ہوتا ہے ، نہ اِتنا کہ دسترخوان سے بھوکا اٹھا جائے -" میں کھڑی ہوئی اور جائے ادب پر جا کر تین آداب بجا لائی مگر کچھ نہ پوچھو اس مشکل سے آئی گئی کہ دل ہی جانتا ہے - ہر قدم پر اُلجھتی تھی اور اوسان خطا ہو جاتے تھے -

---

۱ - نامحرم : وہ مرد جن سے عورتوں کو شرعاً پردہ کرنا چاہیے -

۲ - مجرا : آداب بجا لانا -

اب میں سوچتی ہوں کہ وہ زمانہ کیا ہوا ، وہ خوشی کے دن کہاں چلے گئے جب ہم اپنے محلوں میں آزاد اور بے فکر پھرا کرتے تھے ۔ظلِّ سبحانی کا سایہ سر پر تھا اورلوگ ہمیں "ملکۂ عالم" کہہ کر پکارتے تھے ۔ دنیا کے آثار چڑھاؤ ایسے ہی ہوتے ہیں ۔

مجھے خوب یاد آیا کہ جب حضور معلّی مقبرۂ حضرت ہمایوں میں گرفتار کیے گئے تو ایک خواجہ سرا آیا اور کہنے لگا ، "بیگم یہاں کیوں کھڑی ہو ، چلو تمھارے ابا جان نے بلایا ہے ۔" میں اسی بے خودی کی حالت میں اس کے ساتھ ہو لی ۔ دریائی دروازے سے اتر کر دیکھا کہ ابا جان مرزا قریش بہادر گھوڑے پر سوار ننگے سر موجود ہیں ۔ تمام چہرے اور سر کے بال خاک آلودہ ہو رہے ہیں ۔ مجھے دیکھتے ہی آنسو بھر لائے اور فرمایا "لو سلطانہ ! اب ہمارا بھی کوچ ہے ۔ جوان بیٹا جس کے سہرے کی آرزو تھی آنکھوں کے سامنے سنگین کی سپر بن گیا ۔" یہ سنتے ہی میں نے ایک چیخ ماری اور ہائے بھائی یاور "کہہ کر رونے لگی ۔ وہ گھوڑے سے اتر کر آئے ۔ مجھ کو اور ناز بانو کو گلے لگا کر پیار اور تسلی کرنے لگے اور کہا "بیٹی ! اب لوگ میری تلاش میں ہیں ۔ میں بھی دو چار گھڑی کا مہمان ہوں ۔ تم ماشاءاللہ جوان اور سمجھدار ہو ، اپنی چھوٹی بہن کو دلاسا دو اور خود آنے والی مصیبتوں پر صبر کرو ۔ خبر نہیں اس کے بعد کیا پیش آنے والا ہے ۔ جی تو نہیں چاہتا کہ تم کو تن تنہا چھوڑ کر کہیں جاؤں پر ایک نہ ایک دن تم کو بن باپ کا بننا پڑے گا ۔ ناز بانو ابھی بچہ ہے اس کی دلداری کرنا اور نیکی سے زندگی بسر کرنا اور دیکھو ناز بانو ! اب تم شہزادی نہیں ہو ، کسی چیز کے لیے ضد نہ کرنا اور جو میسّر آئے شکر کر کے کھا لینا ۔ اگر کوئی شخص کھاتا ہو تو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا ورنہ لوگ کہیں گے کہ شہزادیاں بڑی بدنیت ہوتی ہیں ۔" پھر ہم دونوں کو خواجہ سرا کے سپرد کرکے کہا کہ ان

کو جہاں ہمارے خاندان کے اور آدمی ہوں پہنچا دینا ۔ اس کے
ہم کو پیار کیا اور روتے ہوئے گھوڑا دوڑاتے جنگل میں گھس
پھر پتا نہ لگا وہ کیا ہوئے ۔ خواجہ سرا ہم کو لے چلا ۔ یہ ہما
گھر کا قدیمی نمک خوار تھا ۔ تھوڑی دور تک ناز بانو جو نا
کی پلی ہوئی تھی چلی مگر پھر پاؤں کی طاقت نے جواب دے
اور دو قدم چلنا دوبھر ہو گیا ۔ مجھ کو بھی کبھی پیدل چلنے
اتفاق نہ ہوا تھا ، جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتی تھی مگر بانو کو
ہوئے چلی جاتی تھی ۔ اتنے میں ناز بانو کے ایک نوک دار کانٹا چ
گیا اور وہ ہائے کہ کر گر پڑی ۔ میں نے جلدی سے اس کو اٹھ
اور کانٹا نکالنے لگی ۔ مگر موا خواجہ سرا کھڑا دیکھا کیا اور یہ
ہوا میرا ہاتھ ہٹا لیتا بلکہ چلنے کی جلدی کرنے لگا ۔ بہن بولی "آ
جان! مجھ سے پیدل نہیں چلا جاتا ۔ ناظر کو بھیج کر گھر سے پالکی
منگا لو ۔" گھر اور پالکی کا نام سن کر میرا جی بھر آیا اور اس کو
تسلی دینے لگی ۔ خواجہ سرا نے پھر کہا کہ چلو بس ہو چکا چلو
ناز بانو کا مزاج تیز تھا ، وہ نوکروں کو ہمیشہ سخت سست کہ
لیا کرتی تھی اور یہ لوگ دم بخود ہو کر سن لیتے تھے ۔ اسی خیال
سے اس نے خواجہ سرا کو پھر دو ایک باتیں سنا دیں ۔ کمبخت کو
سنتے ہی اتنا غصہ آیا کہ آپے سے باہر ہو گیا اور بڑی بے ترمی سے
بن باپ کی دکھیا بچی کے ایک طمانچہ مارا ۔ بانو بلبلا گئی وہ کبھی
پھول کی چھڑی سے نہ پٹی تھی یا اب ایسا طمانچہ لگا ۔ اس کے رونے
سے مجھ کو بھی بے اختیار رونا آ گیا ۔ ہم تو روتے رہے اور
خواجہ سرا کہیں چلا گیا ۔ پھر خبر نہیں موا کیا ہوا ۔ ہم دونوں
بمشکل تمام گرتے پڑتے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء پہنچے ۔ یہاں
دلّی کے اور خاص ہمارے خاندان کے سیکڑوں آدمی تھے ۔ مگر سب
اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار ۔ قیامت کا نمونہ تھا ۔ کسی نے بات
تک نہ پوچھی ۔ اسی اثنا میں وبا پھیلی اور پیاری بہن ناز بانو اس

میں رخصت ہو گئی - میں اکیلی رہ گئی - امن ہوا جب بھی مجھ دکھیا کو سکھ نہ ملا - آخر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انگریزی سرکار نے ہم لوگوں کی پرورش کرنا چاہی اور میرا پانچ روپیہ مہینہ وظیفہ مقرّر ہوا جو اب بھی ملتا ہے -

(غدرِ دہلی کے افسانے سے اقتباس)

(۱۸۹۱-۱۹۴۲ء)

چودھری افضل حق پنجاب پولیس میں ملازم تھے مگر ۱۹۲۰ء میں ملازمت ترک کرکے تحریکِ خلافت کے سرگرم رکن بن گئے اور مدتوں قید و بند کے مصائب برداشت کرتے رہے۔ ان تجربات کو انھوں نے "زندگی" میں بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

"خادم خلق کی کہانی" چودھری صاحب کی کتاب "زندگی" کا ایک اقتباس ہے۔ اس میں ایک شخص مرنے کی روداد بیان کرتا ہے۔

ایک خادم خلق کی کہانی

میں نے بھی عمر کی پچیس بہاریں دیکھی تھیں۔ مست شباب تو تھا ہی۔ والد مرحوم نے دریا کے کنارے ایک خوشنما اعلیٰ درجے کا مکان تیار کرایا تھا۔ یہ جگہ میری دل پسند تھی، برسات کا موسم تھا۔ ایک دن ٹھنڈی ہوائیں چلیں، گھٹائیں جھوم کے اٹھیں، بادل تھوڑی دیر تک دل کھول کر برسا۔ پھر مطلع صاف ہوگیا، میں اس مکان کے بالائی حصے میں مست سرور بیٹھا تھا، ساز اور آواز آپس میں مل جاتے تھے۔ یونہی دوپہر ڈھل گئی۔ ابر کا ایک ہلکا سا آوارہ ٹکڑا آفتاب کے چہرے پر چھا گیا۔ افقِ مشرق پر خوش نما قوسِ قزح نمودار ہوئی۔

میں نے شغل طرب چھوڑا اور چھت پر چڑھ کر آسمان کا نکھار دیکھنے لگا ، دریا چڑھاؤ پر تھا - پانی کناروں سے اچھل پڑتا تھا - میں نے اپنی عمر میں ایسی طغیانی اور اتنا پاٹ نہ دیکھا تھا - ابھی پانی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا - کیا دیکھتا ہوں ، ایک ملاح ہلکی کشتی پر بہت سی سواریاں لیے آ رہا ہے - دریا کی موجیں ایک دوسری سے ٹکرائیں اور بھنور بنا - کشتی گرداب میں پھنسی ، ملاح نے بُہتیرا سنبھالا مگر کچھ پیش نہ گئی - ادھر میں بھی ہمہ تن متوجِّہ تھا ، کھڑا کھڑا افراطِ اضطراب سے بے چین ہو گیا اور پکارا سنبھل سنبھل - مگر کشتی نہ سنبھلی -

الٰہی ! میلوں کا پاٹ ، بانسوں کی گہرائی ، ڈوبنے والے ہاتھ پاؤں مارتے تھے اور امداد کے لیے پکارتے تھے - وہ بے کسی کا منظر مجھ سے نہ دیکھا گیا - رحم ! رحم ! خدایا رحم ! کہتا ہوا میں حوصلہ کرکے پانی میں کودا اور شیر کی طرح دریا کے جگر کو چیرتا ہوا کشتی تک جا پہنچا - سواریوں میں بعض لوگ تیراک تھے وہ جان بچا کر ساحلِ سلامتی تک پہنچنا چاہتے تھے - میں زور سے پکارا کہ نامردو ! عورتوں اور بچوں کو منجدھار میں چھوڑے جاتے ہو - کچھ غیرت مند پلٹے - باقیوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا - اس وقت ایک ایک کا سنبھالنا مشکل تھا - میں نے دو بچوں اور ایک عورت کو سنبھالا اور لے چلا - کچھ دور جا کر معلوم ہوا بوجھ قوتِ برداشت سے بہت زیادہ ہے - کنارہ دور تھا - دل نے ہمت تو نہ ہاری مگر مصلحت نہ مانی ، مجبورًا ایک لڑکے کو خُدا کے حوالے کرنا پڑا - وہ ڈوبنے لگا - ایک دفعہ عاجزی اور حسرت سے میری طرف دیکھا میری آنکھوں میں آنسو آ گئے فرطِ رحم نے دو اور جانوں کی ذمہ داری سے غافل کر دیا - میں نتیجے سے بے پروا ہو کر بڑھنا چاہتا تھا کہ اس کو بھی اٹھا لوں - پھر خیال آ گیا کہ اس بار عزیز کو تو جان بوجھ کر پھینکا ہے - اک جگر پاش آہ نکلی - اس نے

مجھے نگاہِ حسرت سے، میں نے اسے نگاہ ترحُّم سے دیکھا۔ اس نے غوطہ کھایا اور لاکھوں من پانی اس کے اوپر سے گزر گیا۔ اتنے میں، میں نے اپنے وفادار ملازم کی آواز قریب ہی سنی کہ آقا جان! میں آ گیا ہوں۔ میں نے کہا "گل نواز اس لڑکے کو جلدی لینا"۔ لڑکا ابھرا ہاتھ پاؤں مارے، چیخا، دوسرا غوطہ کھانا چاہتا تھا کہ گل نواز تیر کی طرح پہنچا، پھول کی طرح لڑکے کو اٹھا لایا اور ہم سہمی ہوئی جانوں کو لے چلے۔ گل نواز بولا: "آقا جان! آپ بہاؤ کے ساتھ ساتھ تَیر کر کنارے کی طرف آئیے۔ میرا بوجھ کم ہے میں دریا کو چیرتا ہوا آ ملتا ہوں۔" میں نے کہا "جلدی کنارے پہنچو تاکہ جلدی واپس آئیں۔ شاید کوئی جان بچ سکے۔ ہم دونوں جلدی جلدی دریا چیرتے پار ہوئے۔ بچے ڈرے ہوئے، دریا سے دور جا کھڑے ہوئے۔ عورت نے سو دعائیں دیں۔ میں نے جو دریا کی طرف نظر اٹھائی۔ دوسروں کو جو پہلے تیرتے تھے، ڈوبتے دیکھا معلوم ہوا کہ تیرنے میں پورے مشاق نہ تھے۔ میں دیکھتے ہی پھر پانی میں کودا اور کہا "گل نواز! آؤ ان کو بچائیں۔" اس نے کہا "آقا جان۔" وہ جواں ہمت بوڑھا ایسا شہزور تھا کہ شیر کی طرح سیدھا بڑھتا آتا میرے پیچھے پانی میں پاؤں ڈالا تھا۔ لیکن مجھ سے پہلے پہنچا اور ایک ڈوبتے کو سہارا دیا۔ میں بھی زور لگا کر پہنچا، دوسرے کو میں نے بچایا۔ اب ہم سوئے ساحل چلے، اگرچہ میں راحت اور آرام کے حصول میں دریا دل تھا۔ روپے پیسے کو اس کے لیے پانی کی طرح بہاتا تھا لیکن اس وقت مجھے ایسا اطمینانِ قلب نصیب تھا اور ایسی سچی خوشی حاصل تھی کہ دولتِ دنیا دے کر میسّر نہ آ سکتی تھی۔ میں وفورِ مسرت میں کہنے لگا: "گل نواز! ساحل پر پہنچ لیں، تجھ کو اتنی دولت دوں گا کہ تیری اولاد بیٹھی کھائے گی۔" یہ سن کر وہ رویا۔ اسے دیکھ کر میں آبدیدہ ہو گیا۔ دونوں کی پریشانی۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو انعام کی خاطر جان

خطرے میں ڈال دیتے ہیں - بہادر اور شریف کے لیے کوئی انعام کافی بھی کیونکر ہو سکتا ہے - اسے افسوس ہوا کہ میں نے اسے ایسا سمجھا ، مجھے شرم آئی کہ میں نے کیا کہہ دیا - اسے کلام کا یارا نہ رہا - اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی - گو بظاہر تیرتے جا رہے تھے لیکن دراصل دریائے حیرت و ندامت میں ڈوبے ہوئے تھے -

اب کچھ دور چل کر معلوم ہوا کہ سانس پھول رہا ہے - میں نے ہمت کر کے رفتار تیز کر دی - پانچ دس قدم گیا تھا بوجھ پہاڑ معلوم ہوا - خود غرضی نے کہا : "جان ہے تو جہان ہے - ایک دوسرے کی جان بھی نہ بچائی اور اپنی بھی ساتھ گنوائی - یہ کہاں کی دانائی ہے ؟" غیرت بولی "جس کو سہارا دیا اس کو پار نہ اتارا یہ کیسی بھلائی ہے ؟" تہوّر مصلحت پر غالب آیا ، خود غرضی نے غیرت سے شکست کھائی - نیچے سے آنکھیں بند کر کے میں نے اپنا آخری زور لگایا - کنارا قریب ہی تھا کہ میرا دم ٹوٹ گیا اور جسے بچا رہا تھا ، ہاتھ سے چھوٹ گیا - اس میں کسی قدر سکت باقی تھی - وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا - میں غوطے کھانے لگا - قسمت کے کھیل ہاتھ پاؤں مارتے اس کے پاؤں زمین پر جا لگے - میں کنارے سے اور الگ ہوتا گیا - جو ڈوب رہا تھا - وہ بچ نکلا اور جو بچانے آیا تھا وہ ڈوب چلا - آخری غوطے سے قبل میں نے دیکھا کہ تمام تماشائیوں کی اس مختصر جماعت میں جن کو ابھی بچایا تھا - اضطرابِ عظیم پیدا ہے - بچے بلک بلک کر میری سلامتی کے لیے "یا خدا رحم ! یا خدا رحم !" پکار رہے تھے - گل نواز نے میرا حال دیکھا - چیختا ہوا پانی میں کودا - یہ آخری نظارہ تھا جو میں نے روئے زمین پر دیکھا - لوگ مضطرب تھے - میں مطمئن ، کہاں مجھ سا فاسق و فاجر، کہاں یہ شاندار موت ؟ مجھے اس کا وہم بھی نہ گزرا تھا -

غلام عباس

غلام عباس امرتسر (بھارت) میں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے
تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی - ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۵ء
میں ہوا - ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک غیر ملکی افسانوں کے
ترجمے میں گزارا - ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۷ء تک پھول اور تہذیب
نسواں کے نائب مدیر رہے -آل انڈیا ریڈیو کے اردو اور ہندی
رسالے آواز اور سارنگ کے مدیر بھی رہے - آزادی کے بعد
پاکستان میں سرکاری عہدے پر مامور رہے - جزیرۂ سخنوراں
اور افسانوں کا مجموعہ آنندی بہت پسند کیے جاتے ہیں -

کتبہ

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے، جو دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں - جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں - دن کے وقت اس علاقے میں چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے - مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے، ایک دریا کا روپ دھار لیتی

ہے ، جو پہاڑوں سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو ۔

گرمی کا زمانہ ، سہ پہر کا وقت ، سڑکوں پر درختوں کے سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جھلسے جاتے تھے ۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی ، سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا ، بخارات اٹھ رہے تھے ۔

شریف حسین کلرک درجۂ دوم ، معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا ، جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے ۔ گھر کو لوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا ، جو اسے مہینے کے شروع کے صرف چار پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دن بھی انہیں مبارک دنوں میں سے ایک تھا ۔ آج خلافِ معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے ۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا ۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوڑیاں لے کر کھا لی تھیں اور اوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا ۔ رات کو شہر کے کسی سستے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی ، بس بے فکری تھی ۔ گھر میں کچھ ایسا اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنا پڑتی ، اس لیے آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری رات سڑکوں ہی پر گھومتا رہے ۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنا شروع ہوئیں ۔ ان میں ٹائپسٹ ، ریکارڈ کیپر ، ڈسپیچر ، اکاؤنٹنٹ ، ہیڈ کلرک ، سپرنٹنڈنٹ غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجے اور حیثیت کے کلرک تھے

اور اسی لحاظ سے ان کی وضع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی - مگر بعض ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے - سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیض ، خاکی زین کی نیکر اور چپل پہنے ، سر پر سولا ہیٹ رکھے ، کلائی پر گھڑی باندھے ، رنگدار چشمے لگائے ، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے ، منہ میں بیڑی ، بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے - ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے ، ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں ان کا کوئی حل سوجھ جائے مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کے کاموں میں ایسے الجھ جاتے ، کہ انھیں دیکھنے کا موقع ہی نہ ملتا اور اگلے روز انھیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا -

بعض منچلے ٹانگے ، سائکل اور چھاتے سے بے نیاز ٹوپی ہاتھ میں ، کوٹ کاندھے پر ، گریبان کھلا ہوا ، جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انھوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی ، سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بد قطع سوٹ پہنے ، اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نکٹائی کالر تک سے لیس ، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے ، خراماں خراماں چلے آ رہے تھے -

گو ان میں سے زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر وہ لہجہ بگاڑ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے - اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی ، جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر اکساتی ہے ، بلکہ یہ کہ انھیں دفتر میں دن بھر اپنے افسروں سے ایسی غیر زبان میں بولنا پڑا تھا اور اس وقت وہ باہم بات چیت کر کے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے -

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے - ایسے کم عمر بھولے

بھالے ناتجربہ کار بھی ، جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنھیں ابھی سکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایسے عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگ بھی ، جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنھیں اس سڑک کے اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس تیس برس ہو چکے تھے - بیشتر کارکنوں کی پیٹھ میں گدّی سے ذرہ نیچے خم سا آ گیا تھا اور کُند استروں سے متواتر داڑھی مونڈھتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں کی مہین جڑیں پھوٹ نکلی تھیں ، جنھوں نے بے شمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی -

پیدل چلنے والوں میں بُھتیرے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں ، ان کا فاصلہ کَے کَے ہزار قدم ہے - ہر شخص افسروں کے چڑچڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا -

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کی کمی دیکھ کر شریف حسین لپک کر گیا ، اس میں سوار ہو گیا ، تانگہ چلا اور تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا - شریف حسین نے اکنّی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کی بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا ، جس کی سیڑھیوں کے گردا گرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سا لگا کرتا تھا - دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے - اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں اور لوگوں کو چیزیں خریدتے ، مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پُر لطف تماشا تھا -

شریف حسین لیکچر باز حکیموں ، سنیاسیوں ، تعویذ گنڈے بیچنے والے سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اتار دینے والے

فوٹو گرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رکتا، سیر دیکھتا ، اس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں - یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں - ان میں سے بعض تو ایسی تھیں ، جو اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ صنعت اعلیٰ کا نمونہ ہوں گی مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑے پڑے یا تو ان کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا ان کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا ، جس سے وہ بیکار ہو گئی تھی - چینی کے ظروف اور گلدان ، ٹیبل لیمپ ، جلی ہوئی بیٹریاں ، چوکھٹے ، گراموفون کے کل پرزے ، جراحی کے آلات ، ستار ، بھس بھرے ہرن ، پیتل کے لم ڈھینگ ، بدھ کا نیم قد کا مجسمہ -

ایک دکان پر اس کی نظر سنگِ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی، جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اکھاڑا گیا ہے - اس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ - شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھا - یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا ، قیمت دریافت کی -

تین روپے ، کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے- مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی - اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا -

کیوں حضرت چل دیے؟ آپ بتائیے ، کیا دیجیے گا؟

وہ رک گیا اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوق تحقیق کو پورا کرنے کے لیے قیمت پوچھی تھی - اس نے سوچا کہ دام اس قدر کم بتاؤ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں - کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے ، جو دکانداروں کا وقت

ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

"ہم تو ایک روپیہ دیں گے۔" یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اس نے اس کی مہلت ہی نہ دی۔

"اجی سنیے کچھ زیادہ نہیں دیں گے، سوا روپیہ بھی نہیں۔ اچھا لے جائیے۔"

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو اٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو سودے کو منسوخ کر دے۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ نہ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔

جب رات کو وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا، خدا کے کارخانے عجیب ہیں وہ بڑا غفور و رحیم ہے، کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجۂ دوم سے ترقی پا کر سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے . . . یہ نہیں تو کم از کم ہیڈکلرک ہی کی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی

بھول ہوتی ۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا ، اس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا مگر دو سال کی سعیِ لا حاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آ چلا تھا ، مگر اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے نے پھر اس کے خیالوں میں ہل چل ڈال دی ۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئند خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگاتے، اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ، دفتر جاتے ، دفتر سے آتے ، کوٹھیوں سے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھے ۔ یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہوا اور اسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا ، جس نے بہت چابک دستی سے اس پر اس کا نام کندہ کر کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی خوش نما بیلیں بنا دیں ۔

اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی ۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا تھا ۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبہ پر سے اس اخبار کو اتار ڈالے جو سنگ تراش نے اسے لپیٹ کر دیا تھا اور اس پر ایک نظر اور ڈال لے ۔ مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جسے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ۔ شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کتبے کو دیکھ کر اس کے ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلّط تھے ۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے اخبار اتار پھینکا اور نظریں کتبے کی دلکش تحریر پر گاڑے دھیرے دھیرے سیڑھیاں

چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر جیب سے چابی نکالی، قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کے مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اس پر بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی تو اس قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے۔ ان کے لیے تو بڑا سا مکان چاہیے، جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے۔...

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبے کو کہاں رکھوں۔ اس کے حصۂ مکان میں دو کوٹھڑیاں، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا الماری صرف ایک ہی کوٹھڑی میں تھی مگر اس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے کتبے کو اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبے ہی پر پڑتی۔ امیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقّت کی تھکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا، آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان پیدا کر دیتیں۔ افسر کی ایک ایک نگاہِ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کے بیوی بچے نہیں آئے، وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا؛ نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا۔ رات کو جلدی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آ جاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا۔ مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ تو فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی ملا۔

ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے اسے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس مدت میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس ہو گئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ کی الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بیٹا کتبے کو گرا نہ دے، اسے وہاں سے اٹھایا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اس صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اس کی بیوی کو گرم کپڑے رکھنے کے لیے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبہ بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے، بے بال کے برش، بیکار صابن دانیاں، ٹوٹے ہوئے کھلونے اور ایسی ہی اور دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفۂ غیبی سے نصیب ہوتی ہے۔ کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا، جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اٹھانی پڑتی۔

پے درپے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے

نکل چکے تھے اور کتبے کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اس کے افسروں نے اس کی دیانتداری اور پرانی کارگزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لیے عارضی طور پر درجۂ اول کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی پر جانا چاہتا تھا۔

جس روز اسے یہ عہدہ ملا، اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا۔

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی سی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبے کی یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی سوئی ہوئی امنگیں جاگ اٹھیں۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے کاٹھ کی پیٹی میں سے کتبہ نکالا۔ صابن سے دھویا، پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر لگا دیا۔

یہ زمانہ اس کے لیے بہت ہی کٹھن تھا کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتری اور کارگزاری دکھانے کے لیے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لیے ان کا بہت سا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اس کا دل بجھ سا جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا، ممکن ہے کہ وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوالے.... ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے.. ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے....

مگر جب تین مہینے گزرے تو اس کلرک نے نہ تو چھٹی کی میعاد ہی بڑھوائی اور نہ بیمار ہی پڑا۔ البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آ جانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گزرے ، وہ اس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے ۔ تھوڑی سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر معلوم ہونے لگی تھی ۔ اس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا ۔ مزاج میں آلکس اور حرکات میں سستی پیدا ہونے لگی ۔ ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا ، نہ کبھی ہنستا نہ کسی سے بولتا چالتا ۔ مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی ۔ افسروں کے تیور جلد ہی اسے راہ راست پر لے آئے ۔

اب اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی ، سینا پرونا سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی ۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جما لیا ۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکول کا کام کرتا ۔ چونکہ میز ہلنے سے کتبہ گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی اس لیے لڑکے نے اسے اٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا ۔

سال پر سال گزرتے گئے ۔ اس مدت میں کتبے نے کئی جگہیں بدلیں ۔ کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر ، کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چارپائی کے نیچے ، کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے بکس میں ۔ ایک دفعہ کسی نے اٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا ، جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے ۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی ، دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چکا تھا ۔ اٹھا کر دھویا پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا مگر چند ہی روز میں اسے غائب کر دیا گیا اور اس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیے گئے ، جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیے تھے ۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ

الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا ۔ مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھڑی دہک اٹھی تھی ۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس سال گزر چکے تھے ۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدّی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا ۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوشحالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی ۔ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو ، تصوّرات کا ایک تسلسل ہے کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا ۔ اب اکثر اوقات ایک آہ دم بھر میں ان تصورات کو اڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی ، لڑکوں کی تعلیم اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات پھر ساتھ ہی ان کے لیے نوکریوں کی تلاش ۔ یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پل بھر کو بھی اس کے خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں ۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی ۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا ۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا ۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب مل ملا کے کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی ، جس میں بخوبی گزر ہونے لگی تھی ۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا ۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں ۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی ۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی مگر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں

نے دبانا شروع کر دیا اور زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا، پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح اس کے سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے، اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں مگر افاقہ نہ ہوا اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرا رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں اسے کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبہ پر باپ کا نام دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک بات سوجھی، جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز وہ کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا اور اس سے کتبے کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

———

مختصر ڈرامے

آغا حشر کا اصلی نام محمد شاہ تھا ان کے والد اپنے وطن کشمیر سے بغرض تجارت بنارس میں مقیم ہوے - وہیں آغا حشر پیدا ہوے - ابتدائی تعلیم اسلامی طریقے پر گھر ہی میں ہوئی - بعد میں جے نرائن مشن سکول میں داخل ہوے - سکول کی تعلیم کے زمانے ہی میں شاعری کی مشق شروع کر دی - بنارس میں تھیئٹر دیکھ کر ڈراما لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور چودہ برس کی عمر میں ایک پرائیویٹ کلب کے لیے ڈراما آفتابِ محبت لکھا - اسی شوق نے انھیں بمبئی پہنچایا جہاں اپنی شاعری اور بمبئی پنچ نامی اخبار میں اپنی تحریروں کے واسطے سے شہرت حاصل کی - بمبئی ہی میں الفریڈ کمپنی کے مالک کاؤس جی کھٹاؤ نے انھیں ڈراما نویس کے طور پر ملازم رکھ لیا - اسی زمانے میں انھوں نے مذہبی مباحثوں میں حصہ لیا - تقریریں کیں اور اپنی بلاغت و خطابت کا لوہا منوایا -

آغا حشر نے الفریڈ کمپنی کے لیے چار ڈرامے مرید شک، پاک دامن، ٹھنڈی آگ اور اسیر حرص لکھے - اس کمپنی کی ملازمت ترک کرکے نو روز جی کی کمپنی میں آ گئے اور اس کے لیے میٹھی چھری عرف دورنگی دنیا اور دامِ حُسن نامی ڈرامے لکھے - اس کمپنی کی ملازمت ترک کرکے دوبارہ الفریڈ کمپنی میں آ گئے اور ان کے لیے شہید ناز لکھا - الفریڈ کمپنی کی ملازمت دوبارہ ترک کی اور بمبئی پارس تھیئٹریکل کمپنی سے

وابستہ ہوئے جس کے لیے انھوں نے سفید خون اور صید ہوس تحریر کیے جو شیکسپئر سے ماخوذ تھے ۔ ان ڈراموں نے بڑی شہرت حاصل کی ۔ اس کے بعد انھوں نے نیو الفریڈ کمپنی کے لیے خوب صورت بلا اور اچھوتا دامن لکھا ۔

۱۹۲۳ء میں آغا حشر لاہور چلے آئے اور انڈین شیکسپئر تھیئٹریکل کمپنی کے نام سے اپنی ذاتی کمپنی قائم کی ۔ اس کے لیے انھوں نے خواب ہستی ، خود پرست ، بن دیوی ، بلوا منگل اور یہودی کی لڑکی نامی ڈرامے لکھے ۔ ۱۹۱۶ء میں یہ کمپنی ٹوٹ گئی ۔

کچھ مدت بعد انھوں نے بمبئی کی امپیریل کمپنی کے لیے ڈراما بھولی بھول لکھا ۔ بعد ازاں کلکتہ کی میڈن تھیٹر کمپنی میں ملازم ہو گئے اور اس کے لیے اردو ہندی اور بنگالی میں متعدد ڈرامے لکھے ۔

۱۹۲۹ء میں بیماری کی بنا پر لاہور چلے آئے اور تندرست ہو کر لاہور میں حشر پکچرز کے نام سے ایک فلم کمپنی قائم کی جس کا پہلا فلم بھیشم تکمیل کے قریب تھا کہ آغا حشر نے ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو انتقال کیا ۔

آغا حشر اردو کے عہد آفرین ڈراما نویس تھے ۔ ان سے قبل ڈرامے کا دار و مدار شاعری اور موسیقی پر تھا حشر نے ڈرامے میں مکالمے شامل کیے اور بڑی حد تک اسے شاعری کی قید سے آزاد کیا ۔ ابتدائی دور کے ڈراموں میں مکالمے شعر سے زیادہ قریب ہیں مگر رفتہ رفتہ شاعری کا اثر کم ہوتا چلا گیا ۔ سٹیج کی جدید تکنیک کی غیر موجودگی کی بنا پر مکالموں کو جدید جذباتی اسلوب اور خطابت کے انداز سے پیش کرنا اس دور کی ضرورت تھی اور آغا حشر کا فن اس ضرورت کو پورا کرتا ہے ۔ انھوں نے ڈرامے کو نئی قدروں سے آشنا کیا اور تہذیب

و معاشرت کے اصلاحی پہلوؤں پر نظر رکھی ۔ ان کی کاوشوں
نے اردو ڈرامے کی صحیح معنوں میں بنیاد رکھی اور یوں آغا
حشر کا نام اردو ڈرامے کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار
کر گیا ۔

رستم و سہراب

چھٹا سین

(میدان جنگ)

(رستم اداس چہرے اور غمگین دل کے ساتھ مایوس نگاہوں سے
آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے) ۔

رستم : پروردگار ! میں نے کبھی تیرے قہر و غضب کو
حقیر نہیں سمجھا ۔ کبھی تیری طاقت کے سامنے اپنی
فانی طاقت کا غرور نہیں کیا ۔ پھر اس ذلت کی شکل
میں تو نے مجھے میرے کس گناہ کی سزا دی ہے ؟
اے دردمندوں کی دوا اور کمزوروں کی طاقت !
اے نا امیدوں کی امید ! میں نے کل ساری رات تیرے
حضور میں سجدہ ہائے نیاز کے ساتھ آنسو بہا کر
مدد کے لیے التجا کی ہے ۔ اپنے عاجز بندے کی التجا
قبول کر ۔ اس بڑھاپے میں دنیا کے سامنے میری شرم
رکھ اور ایک بار میری جوانی کا زور و جوش مجھے دوبارہ
واپس دے دے ۔

تری قدرت پلٹ سکتی ہے سارے کارخانے کو
پھر اک دن کے لیے تو بھیج دے پچھلے زمانے کو

(سہراب کا داخلہ)

سہراب : صبح ہو گئی ممکن ہے یہ آج کی صبح اس کی زندگی کی شام ثابت ہو ۔ نہ جانے کیا سبب ہے کہ اس کی موت کا خیال آتے ہی میری روح کانپ اٹھتی ہے (رستم کو دیکھ کر) تو آ گیا ؟ کیا جنگ کے نقارے کی پہلی چوٹ سے تیری نیند ٹوٹ گئی ؟

رستم : بہادر اپنا وعدہ نہیں بھولتا ۔ میں آدھی رات سے صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا ۔

سہراب : آج لڑائی کا دوسرا دن ہے جانتا ہے اس جنگ کا کیا نتیجہ ہو گا ؟

رستم : ہم دونوں میں سے ایک کی موت !

سہراب : شیر دل بوڑھے ! میرا دل تیری موت دیکھنے کے لیے راضی نہیں ہوتا ۔ ایک غیبی آواز بار بار مجھے اس جنگ سے روک رہی ہے ۔ اگر ایران کی گود بہادر فرزندوں سے خالی نہیں ہے تو جا واپس جا اور اپنے عوض کسی اور ایرانی دلیر کو بھیج دے ۔ میں تجھے زندگی اور سلامتی کے ساتھ لوٹ جانے کی اجازت دیتا ہوں ۔

رستم : کل کی اتفاقی فتح پر غرور نہ کر ۔ ہر نیا دن انسان کے لیے نئے انقلاب لے کر آتا ہے ۔ تقدیر کا پہیا ہمیشہ ایک ہی سمت میں نہیں گھومتا ۔

گھڑی بھر میں بدلنا ہو گا تجھ کو پیرہن اپنا
منگا کر پاس رکھ لے جنگ سے پہلے کفن اپنا

(جنگ شروع ہوتی ہے - تھوڑی دیر بعد سہراب ہاتھ روک لیتا ہے) -

سہراب : آج میں تجھ میں نیا جوش اور نئی قوت دیکھ رہا ہوں - جواں ہمت بوڑھے ! مجھے پھر شک ہوتا ہے کہ تو رستم ہے - میں تیری عزت کا واسطہ اور تیری بہادری کی دہائی دے کر ایک بار پھر تیرا نام پوچھتا ہوں - زور سے نہیں، منت سے ! غرور سے نہیں ، عاجزی سے !

رستم : تو میرا نام ہی جاننا چاہتا ہے تو سن میرا نام ہے - - - -

سہراب : (خوشی کی گھبراہٹ سے) رستم !

رستم : نہیں ! سہراب کی موت -

سہراب : افسوس! تو نے میرے رحم کی قدر نہیں کی -

(دوبارہ جنگ ہوتی ہے - رستم سہراب کو گرا کر سینے پر چڑھ بیٹھتا ہے) -

رستم :
بس اسی ہمت اسی طاقت پہ تھا اتنا غرور
تو کوئی شیشہ نہ تھا کیوں ہو گیا پھر چور چور
کیا ہوا زور جوانی اٹھ اجل ہے گھات میں
دیکھ لے اب کس قدر قوت ہے بوڑھے ہات میں
(سہراب کے سینے میں خنجر بھونک دیتا ہے) -

سہراب : آہ ! اے آنکھو ! تمھارے نصیب میں باپ کا دیدار نہ تھا کہاں ہو ؟ پیارے باپ کہاں ہو ؟ باپ کہاں ہو ؟ آؤ آؤ کہ مرنے سے پہلے تمھارا سہراب تمھیں ایک بار دیکھ لے -

کیا خبر تھی کہ بگڑ جائے گی قسمت اپنی
آخری وقت دکھا دو مجھے صورت اپنی

رستم : اپنی جوانی کی موت پر ماتم کرنے کے لیے باپ کو یاد کر رہا ہے ؟ اب تیرے باپ کی محبت ، اس کے آنسو ، اس کی فریاد ، کوئی تجھے دنیا میں زندہ نہیں رکھ سکتی -

مرہم کہاں جو رکھ دے دلِ پاش پاش پر
آیا بھی وہ تو روئے گا بیٹے کی لاش پر

سہراب : بھاگ جا - بھاگ جا - اس دنیا سے کسی دوسری دنیا میں بھاگ جا - تو نے سام و نریمان کے خاندان کا چراغ بجھا دیا ہے - تاریک جنگلوں میں پہاڑوں کے غار میں ، سمندر کی تہ میں ، تو کہیں بھی جا کر چھپے لیکن میرے باپ رستم کے انتقام سے نہیں بچ سکے گا -

رستم : (چونک کر کھڑا ہو جاتا ہے) کیا کہا ؟ کیا کہا ؟ تو رستم کا بیٹا ہے ؟

سہراب : ہاں -

رستم : تیری ماں کا نام ؟

سہراب : تہمینہ -

رستم : تیرے اس دعوے کا ثبوت ؟

سہراب : ثبوت اس بازو پر بندھی ہوئی میرے باپ رستم کی نشانی -

رستم : جھوٹ ہے ، غلط ہے - تو دھوکا دے رہا ہے - مجھے پاگل بنا کر اپنے قتل کا انتقام لینا چاہتا ہے - (گھبراہٹ کے ساتھ سہراب کے بازو کا کپڑا پھاڑ کر اپنا دیا ہوا مہرہ دیکھتا ہے) وہی مہرہ ، وہی نشانی ! (سر پٹک کر) کیا کیا ؟ کیا کیا ؟ اندھے پاگل جلاد ! یہ کیا کیا ؟ شیر جیسا خونخوار ، بھیڑیے جیسا ظالم ، ریچھ جیسا موذی

حیوان بھی اپنی اولاد کی جان نہیں لیتا ۔ لیکن تو انسان ہو کر حیوان سے بھی زیادہ خونی اور جہنم سے بھی زیادہ بے رحم ہے ۔ ۔ ۔ ۔

خون میں ڈوبا ہے وہ جس سے مزہ جینے میں تھا
دل کے بدلے کیا کوئی پتھر ترے سینے میں تھا
توڑ ڈالا اپنے ہی ہاتھوں سے او ظالم اسے
تیرا نقشہ ، تیرا ہی چہرہ جس آئینے میں تھا

سہراب : فتح مند بوڑھے ! تو رستم نہیں ہے پھر میری موت پر خوش ہونے کے بدلے اس طرح کیوں رنج کر رہا ہے ؟

رستم : (رو کر) اس دنیا میں رنج اور آنسو، رونے اور چھاتی پیٹنے کے سوا میرے لیے اب اور کیا باقی رہ گیا ہے ۔ میں نے تیری زندگی تباہ کر کے اپنی زندگی کا ہر عیش اور اپنی دنیا کی ہر خوشی تباہ کر دی ۔ مجھ سے نفرت کر ! میرے منہ پر تھوک دے ! مجھ پر ہزاروں زبانوں سے لعنت بھیج:

فغاں ہوں، حسرت و ماتم ہوں، سر سے پاؤں تک غم ہوں
میں ہی بیٹے کا قاتل ہوں ، میں ہی بدبخت رستم ہوں

(سہراب کے پاس ہی زمین پر گر پڑتا ہے اور سہراب اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چھاتی سے لپٹ جاتا ہے) ۔

سہراب : بابا ! میرے بابا !

رستم : ہائے میرے پیارے! تو نے الفت سے، نرمی سے، منت سے، کتنی مرتبہ میرا نام پوچھا ۔ اس محبت و عاجزی کے ساتھ پوچھنے پر لوہے کے ٹکڑے میں بھی زبان پیدا ہو جاتی ہے ، پتھر بھی جواب دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے لیکن اس دو روزہ دنیا کی جھوٹی شہرت اور اس فانی دنیا کے فانی غرور نے میرے ہونٹوں کو ہلنے کی اجازت نہ دی ۔ میرے

بچے ! میری تہمینہ کی نشانی ۔۔۔

کس جگہ بے رحم سینے میں یہاں رکھوں تجھے
آنکھ میں ، دل میں ، کلیجے میں ، کہاں رکھوں تجھے

سہراب : ہومان ، بارمان ، ہجیر سب نے مجھے دھوکا دیا ۔ بابا نہ رو ! میری موت کو خدا کی مرضی سمجھ کر صبر کر ۔۔۔

مل گئی مجھ کو جو قسمت میں سزا لکھی تھی
باپ کے ہاتھ سے بیٹے کی قضا لکھی تھی

رستم : جب تیری ناشاد ماں بال نوچتی ، آنسو بہاتی ، چھاتی پیٹتی ، ماتم اور فریاد کی تصویر بنی ہوئی سامنے آکر کھڑی ہوگی اور پوچھے گی کہ میرا لاڈلا سہراب ، میرا بچہ ، میری کوکھ سے پیدا ہونے والا شیر کہاں ہے تو اپنا ذلیل منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لینے کے سوا اسے کیا جواب دوں گا ؟ کن لفظوں سے اس کے ٹوٹے ہوئے دل اور زخمی کلیجے کو تسلی دوں گا ۔۔۔ ؟

سنوں گا ہائے کیسے مامتا کی اس دہائی کو
کہاں سے لاؤں گا مانگے گی جب اپنی کمائی کو
نگاہیں کس طرح اٹھیں گی مجھ قسمت کے ہیٹے کی
دکھاؤں گا میں کن ہاتھوں سے ماں کو لاش بیٹے کی

سہراب : پیارے باپ ! میری بدنصیب ماں سے کہنا کہ انسان سب سے لڑ سکتا ہے ، قسمت سے جنگ نہیں کر سکتا ۔ آہ ! (رستم کی گود سے زمین پر گر کر آنکھیں بند کر لیتا ہے) ۔

رستم : یہ کیا ! یہ کیا ! میرے بچے آنکھیں کیوں بند کر لیں ؟ کیا خفا ہو گئے ؟ کیا ظالم باپ کی صورت دیکھنا نہیں

چاہتے؟ یہ موت کا گہوارہ ، یہ خون میں ڈوبی ہوئی زمین ، پھولوں کا بستر ، ماں کی گود باپ کی چھاتی نہیں ہے - پھر تمہیں کس طرح نیند آ گئی - - - -

سہراب : ماں - - - - خدا - - - - تمہیں - - - - تسلی دے !

رستم : اور - - - - اور - - - - بیٹا بولو - - - - بولو ، چپ کیوں ہو گئے - آہ ! آہ ! اس کا خون سرد ہو رہا ہے - اس کی سانسیں ختم ہو رہی ہیں - اے خدا ! اے کریم و رحیم خدا ! اولاد باپ کی زندگانی کا سرمایہ اور ماں کی روح کی دولت ہے - یہ دولت محتاجوں سے نہ چھین - اپنی دنیا کا قانون بدل ڈال - اس کی موت مجھے اور میری باقی زندگی اسے بخش دے - موت ! موت تو زال و رودابہ کے گھر کا اجالا اور بڑھاپے کی امید ، میری تہمینہ کا بولتا کھیلتا ہوا کھلونا کہاں لے جا رہی ہے ؟ دیکھ ، میری طرف دیکھ ! میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کو تاج و تخت کی بھیک دی ہے - آج ایک فقیر کی طرح تجھ سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں - - - -

ڈال دے جھولی میں تو میرے گلِ شاداب کو
ہاتھ پھیلائے ہوں میں دے دے مرے سہراب کو

سہراب : (آنکھیں بند کیے ہوئے) دنیا - - - رخصت - - - - خدا ! (مر جاتا ہے) -

رستم : آہ ! جوانی کا چراغ آخری ہچکی لے کر بجھ گیا - بے رحم موت نے میری امید کی روشنی لوٹ لی - اب لاکھوں چاند ، ہزاروں سورج مل کر بھی میرے غم کا اندھیرا دور نہیں کر سکتے - آسمان ، ماتم کر ! زمین ، چھاتی پیٹ !

درختو ، پہاڑو ، ستارو ، ٹکرا کر چور چور ہو جاؤ! آج ہی زندگی کی قیامت ہے - آج ہی دنیا کا آخری دن ہے - زندگی ! دنیا ! کہاں ہے زندگی ؟ کہاں ہے دنیا ؟ زندگی سہراب کے خون میں اور دنیا رستم کے آنسوؤں میں ڈوب گئی (دیوانوں کی طرح پکارتا ہے) سہراب -------- سہراب ---- سہراب ---- (غش کھا کر گر پڑتا ہے) -

(پردہ گرتا ہے)

سید امتیاز علی تاج

(۱۹۰۰ء - ۱۹۷۰ء)

تاج صاحب کی پیدائش لاہور کی ہے آپ کے والد شمس العلماء سید ممتاز علی صاحب تھے - انھوں نے دو رسالے جاری کیے ، ایک عورتوں کے لیے جس کا نام تہذیب نسواں تھا ، دوسرا بچوں کے لیے جس کا نام پھول تھا - اس لیے ان کے گھر کا ماحول ادبی تھا اور اسی وجہ سے یہ خود شروع ہی سے لکھنے پڑھنے میں بڑی دلچسپی لیتے رہے -

شروع میں امتیاز علی تاج نے ترجمے کیے ، پھر افسانے لکھے اور اردو کے مزاحیہ ادب میں چچا چھکن کا کردار تخلیق کیا - اصل یہ ہے کہ اردو ادب میں مرزا ظاہر دار بیگ اور حاجی بغلول کے بعد مشہور مزاحیہ کردار چچا چھکن ہی ہے -

تاج صاحب کا انار کلی بیسویں صدی کے اردو ادب میں ایک ممتاز ڈراما ہے - اس کے علاوہ انھوں نے سٹیج ، ریڈیو اور فلم کے لیے بھی متعدد کامیاب ڈرامے لکھے ہیں -

---

آرام و سکون

ڈاکٹر : جی نہیں بیگم صاحبہ ! تردّد کی کوئی بات نہیں - میں نے بہت اچھی طرح معائنہ کر لیا ہے - صرف تھکان کی وجہ سے حرارت ہو گئی ہے - ان دنوں آپ کے شوہر غالباً کام بہت زیادہ کرتے ہیں -

بیوی : ڈاکٹر صاحب ! ان دنوں کیا ، ان کا ہمیشہ یہی حال ہے۔ صبح دس بجے دفتر جا کر شام کے سات بجے سے پہلے کبھی واپس نہیں آتے ۔

ڈاکٹر : جبھی تو ! میرے خیال میں انھیں دوا سے زیادہ آرام اور سکون کی ضرورت ہے ۔ کاروبار کی پریشانیاں اور الجھنیں بھلا کر ایک ہی روز آرام و سکون سے گزارا تو طبیعت اِن شاءَ اللہ بحال ہو جائے گی ۔

بیوی : بیسیوں مرتبہ کہہ چکی ہوں ۔ اتنا کام نہ کیا کرو ، نہ کیا کرو ۔ نصیب دشمناں صحت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے ۔ مگر خاک اثر نہیں ہوتا ۔ ہمیشہ یہی کہہ دیتے ہیں ، کیا کیا جائے ۔ ان دنوں کام بے طرح زور پر ہے ۔

ڈاکٹر : ہر روز تھوڑا تھوڑا وقت آرام و سکون کے لیے نہ نکالا جائے تو پھر بیمار پڑ کر بہت زیادہ وقت نکالنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے ۔

بیوی : یہ بات آپ نے انھیں بھی سمجھائی ؟ میں نے کہا سن رہے ہو ، ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں ۔

میاں : ہوں !

ڈاکٹر : جی ہاں ۔ میں نے سمجھا کر اچھی طرح تاکید کر دی ہے کہ دن بھر خاموش لیٹے رہیں ۔

بیوی : تو تاکید کیا میں نہیں کرتی ؟ مگر ان پر کسی کے کہنے کا کچھ اثر بھی ہو !

ڈاکٹر : جی نہیں ابھی انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ پورے طور سے میری ہدایات پر عمل کریں گے ۔

بیوی : اور دوا کس کس وقت دینی ہے ؟

ڈاکٹر : جی نہیں ۔ دوا کی مطلق ضرورت نہیں ۔ بس آپ صرف ان کے آرام اور سکون کا خیال رکھیے ۔ غذا جو کچھ دینی ہے ، میں لکھ چکا ہوں ۔

بیوی : بڑی مہربانی آپ کی ۔

ڈاکٹر : تو پھر اجازت ؟

بیوی : فیس میں آپ کو بھجوا دوں گی ۔

ڈاکٹر : اس کی کوئی بات نہیں ۔ آ جائے گی ۔

بیوی : (اونچی آواز سے پکار کر) ارے للّو ۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب کا بیگ باہر کار میں پہنچا دیجیو ۔

ڈاکٹر : ایک بات عرض کر دوں بیگم صاحبہ ۔ مریض کے کمرے میں شور و غل نہیں ہونا چاہیے ۔ اعصاب پر اس کا بہت مضر اثر پڑتا ہے ۔ خاموشی اعصاب کو ایک طرح کی تقویت بخشتی ہے ۔

بیوی : مجھے کیا معلوم ڈاکٹر صاحب ۔ آپ اطمینان رکھیں ان کے کمرے میں پرندہ پر نہ مارے گا ۔ (ملازم آتا ہے)

للو : حضور !

ڈاکٹر : اٹھا لو یہ بیگ ۔ تو آداب !

بیوی : (ڈاکٹر اور ملازم جاتے ہیں ، قریب آ کر) میں نے کہا سو گئے کیا ؟

میاں : ہوں ! یونہی چپکا پڑا ہوا تھا ۔

بیوی : بس بس - بس بس چپکے ہی پڑے رہیے - ڈاکٹر صاحب بہت سخت تاکید کر گئے ہیں کہ آپ بات کریں نہ کوئی آپ کے کمرے میں بات کرے - اس سے بھی تھکان ہوتی ہے۔ تمام وقت پورے آرام اور سکون سے گزاریں - سمجھ گئے نا؟

میاں : ہوں (کراہتا ہے) -

بیوی : کیوں بدن ٹوٹ رہا ہے کیا ؟

میاں : ہوں -

بیوی : کہو تو دبا دوں ؟

میاں : ہوں -

بیوی : سونے کو جی چاہ رہا ہو تو چلی جاؤں ؟

میاں : اچھی بات - (کراہتا ہے) -

بیوی : اگر پیچھے کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو ؟ اچھا بلانے کی گھنٹی پاس رکھے جاتی ہوں - گھنٹی کہاں گئی ؟ رات میں نے آپ یہاں میز پر رکھی تھی - اللہ جانے یہ کون اللہ مارا میری چیزوں کو الٹ پلٹ کرتا ہے ؟

(کنڈی کی آواز) کون ہے یہ نامراد ؟ ارے للّو ! دیکھو

بیوی : یہ کون کواڑ توڑے ڈال رہا ہے ؟

للّو : (دور سے) سقہ ہے بیوی جی !

بیوی : سقہ ! گھر میں بھرے بستے ہیں - جو کمبخت اس زور سے کنڈی کھٹکھٹاتا ہے؟ اللہ ماروں کو اتنا خیال بھی تو نہیں آتا کہ گھر میں کوئی بیمار پڑا ہے - ڈاکٹر نے تاکید کر رکھی ہے کہ شور و غل نہ ہونے پائے اور اس سے کہو یہ کیا وقت ہے ، پانی لانے کا - اچھی خاصی دوپہر ہونے کو

آ گئی ہے - کل سے اتنی دیر میں آیا تو نوکری سے الگ کر دوں گی - میں نامراد کو بیسیوں مرتبہ کہلا چکی ہوں کہ صبح سویرے ہو جایا کرے - کان پر جوں ہی نہیں رینگتی -

میاں : ارے بھئی اب بخشو اسے -

بیوی : بخشوں کیسے ؟ ذرا طرح دو تو یہ لوگ سر پر سوار ہو جاتے ہیں -

میاں : ہوں - (کراہتا ہے) -

بیوی : کیوں - زیادہ درد محسوس ہو رہا ہے ؟

میاں : ہوں -

بیوی : للّو سے کہوں آ کر دبا دے ؟

میاں : اوں ہوں !

بیوی : یہ دیکھو - یہاں انگیٹھی پر رکھی ہے - آپ بتائیے آپ سے آپ آ گئی یہاں ؟ پاؤں تھے اس کے ؟ یہ سب حرکتیں اس للّو کی ہیں - کم بخت نے قسم کھا رکھی ہے کہ کبھی کوئی چیز ٹھکانے پر رہنے نہ دے گا - اللہ جانے یہ نامراد میری چیزوں کو ہاتھ لگاتا کیوں ہے ؟ او للّو ! ارے للّو !

میاں : ارے بھئی کیوں ناحق غل مچا رہی ہو - گھنٹی رات میں نے خود میز پر سے اٹھا کر انگیٹھی پر رکھ دی تھی - ہوں (کراہتا ہے) -

بیوی : تم نے ؟ اے ہے وہ کیوں ؟

میاں : ننھا بار بار بجائے جا رہا تھا - میرا دم الجھنے لگا تھا۔ ہوں (کراہتا ہے) -

للّو : (آکر) مجھے بلایا ہے بیوی جی ؟

بیوی : کمبخت - اتنی دیر سے آوازیں میں دے رہی ہوں ، کہاں مر گیا تھا ؟

للّو : آپ نے ریٹھے کوٹنے کو کہا - وہ گودام میں ڈھونڈ رہا تھا -

میاں : ہوں (کراہتا ہے) -

بیوی : صبح سویرے کہا تھا ، کمبخت تجھے اب تک ریٹھے مل نہیں چکے ؟

للّو : جی مہلت بھی ملے - ادھر گودام میں جاتا ہوں ، ادھر کوئی بلا لیتا ہے -

بیوی : ہاں بڑا کام رہتا ہے نا بچارے کو سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی - بھاگ یہاں سے نکل ، جا کر ریٹھے ڈھونڈ (للّو جاتا ہے) -

بیوی : تو یہ گھنٹی یہاں تمھارے سرہانے رکھ جاتی ہوں -

میاں : (کراہ کر) کواڑ بند کرتی جانا -

بیوی : پیچھے اکیلے میں جی تو نہ گھبرائے گا تمھارا ؟

میاں : (تنگ آ کر) نہیں بابا نہیں -

بیوی : ارے ہاں - یہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں - ڈاکٹر صاحب کھانے کے لیے کیا کیا چیزیں لکھ گئے ہیں - کہاں گیا اُن کا لکھا ہوا کاغذ ؟ اے لو یہ نیچے پڑا ہوا ہے - ابھی کہیں کوڑے میں چلا جاتا تو - ہوں - مالٹڈ ملک MALTED

MILK نارنگی کا رس ، ساگو دانے کی کھیر ، یخنی ، کیا تیار کرا دوں اس وقت کے لیے ؟

میاں : جو جی چاہے ۔

بیوی : اس میں میرے جی چاہنے کا کیا سوال ؟ کھانا آپ کو ہے یا مجھ کو ؟

میاں : ساگودانہ بنا دینا تھوڑا سا ۔

بیوی : بس ؟ اس سے کیا بنے گا ۔ یخنی پی لیتے تھوڑی سی ۔ چوزے کی یخنی بنوائے دیتی ہوں ۔ مقوّی چیز ہے ۔

میاں : بنوا دو ۔

بیوی : (دو قدم چلتی ہے) مگر میں نے کہا ، دیر لگ جائے گی یخنی کی تیاری میں ، چوزہ بازار سے منگوانا ہوگا اس للّو اللہ مارے کو تو جانتے ہو ۔ بازار جاتا ہے تو وہیں کا ہو رہتا ہے ۔

میاں : اوں ۔ ہوں ۔

بیوی : تو پھر یوں کرتی ہوں ۔ (صحن میں بچہ پٹ پٹ گاڑی چلانے لگتا ہے) ۔

میاں : ارے بھئی ۔ اب یہ کیا کھٹ پھٹ شروع ہو گئی ۔

بیوی : ننھا ہے آپ کا ۔ عید کے روز میلے میں سے یہ کھلونا گاڑی لے آیا تھا ۔ نہ اس کمبخت کا دل اس سے بھرتا ہے ، نہ وہ کمبخت ٹوٹتی ہے ۔ ارے میں نے کہا ننھے نہیں مانے گا نامراد ؟ چھوڑ اس اپنی پٹ پٹ کو ۔ جب دیکھو لیے لیے پھر رہا ہے ۔ صاحبزادے کا دل کسی طرح پُر ہونے ہی میں نہیں آتا ۔ چولھے میں جھونک دوں گی اس کمبخت کو، اتنا

خیال بھی نہیں آتا کہ ابا بیمار پڑے ہیں۔ شور و غل سے
ان کی طبیعت گھبراتی ہے۔

میاں : ہوں۔ (کراہتا ہے)۔

بیوی : کم نہیں ہوا درد؟

میاں : اوں۔ ہوں۔

بیوی : دبوا لیتے تو گھٹ جاتا۔

میاں : اوں ہوں۔

بیوی : تو میں کیا کہہ رہی تھی؟ کھانے کا پوچھ رہی تھی۔ (پھر ننھے کی پٹ پٹ کی آواز) پھر وہی۔ نہیں مانے گا نامراد، ٹھہر تو جا۔ (غصے میں جاتی ہے۔ میاں کراہتا ہے۔ دور سے بیوی کی آواز آ رہی ہے)۔

چھوڑ اپنی یہ پٹ پٹ۔ (بچہ رونے لگتا ہے)۔ چپ نامراد، اتنا خیال نہیں ابّا بیمار پڑے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے شور و غل نہ ہو۔ انہیں تکلیف ہوگی۔ چپ! خبردار جو آواز نکالی گلا گھونٹ ڈالوں گی۔ (بچہ رونا بند کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے) کمبخت کا جو کھیل ہے، ایسا ہی بے ڈھنگا ہے۔ چل ادھر۔ نہیں چپ ہوگا۔ تو؟ (کھینچتی ہوئی لے جاتی ہے میاں اس ہنگامے سے زچ ہو کر کراہے جا رہا ہے۔ بیوی کی آواز غائب ہوتے ہی کمرے میں جھاڑو پھرنے کی آواز آنے لگتی ہے)۔

میاں : (چونک کر) ہوں؟ ارے بھئی یہ گرد کہاں سے آنے لگی۔ لاحول ولا قوۃ، ارے کیا ہو رہا ہے؟

ملازم : جھاڑو دے رہا ہوں میاں۔

میاں : کمبخت دفع ہو یہاں سے ۔

ملازم : جھاڑو نہ دی تو خفا ہوں گی بی بی جی ۔

میاں : بیوی جی کا بچہ نکل یہاں سے ۔ کہہ دے اُن سے (ملازم جاتا ہے) ۔ کواڑ بند کر کے جا ۔ (میاں کراہ کر چپ ہو جاتا ہے ، ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے اور بجتی رہی) ارے بھئی کہاں گئیں ؟ ارے کوئی ٹیلیفون سننے تو آؤ ۔ لاحول ولا قوۃ ۔ (خود اٹھتا ہے) ہیلو میں اشفاق بول رہا ہوں ۔ بیگم اشفاق کسی کام میں مصروف ہیں ۔ اس وقت کمرے میں نہیں ہیں۔جی ۔ یہاں کوئی ایسا نہیں جو انہیں بلا لائے ۔ میں علیل ہوں ۔ کیا فرمایا آپ نے ؟ آواز دینے کے لیے ضروری نہیں گلا بھی خراب ہو ۔ آپ پھر کسی وقت فون کر لیجیے گا ۔ میں نے عرض کیا نا ، چونکہ میں بیمار ہوں ، کمرے سے باہر نہیں جا سکتا ۔ (زور سے فون بند کرتا ہے) بد تہذیب ۔ گستاخ کہیں کی ۔ ہوں ۔

بیوی : مجھے بلایا تھا ؟ ہے ہے تم اٹھے کیوں ؟

میاں : اتنی آوازیں دیں کوئی سنے بھی ۔

بیوی : توبہ توبہ ، لیٹو لیٹو، میں ذرا گودام میں چلی گئی تھی ۔ اے للّو کو ریٹھے نکال کر دے رہی تھی ۔ بلایا کیوں تھا ؟ (ہمسائے کے ہاں گانا شروع ہوتا ہے) ۔

میاں : فون تھا تمھارا ؟

بیوی : کس نے کیا تھا ؟

میاں : ہوگا کوئی اب مجھے کیا پتہ ۔

بیوی : جب اٹھ ہی کھڑے ہوئے تھے تو نام پوچھ لینا کوئی گناہ تھا ۔

میاں : میں نے کہہ دیا تھا پھر کر لیں فون ۔

بیوی : مفت کی الجھن میں ڈال دیا ۔ اللہ جانے کون تھی اور کیا چاہتی تھی ۔

میاں : اے بھئی کوئی ایسا ضروری کام نہ تھا ۔ ورنہ مجھے پیغام نہ دے دیتیں ۔ تم خدا کے لیے ان ہمسائے کے صاحبزادے کا ہارمونیم اور گانا بند کراؤ ۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے ۔

بیوی : اب اسے کیونکر روک دوں میں ؟

میاں : بابا ایک دفعہ لکھ کر بھیج دو ۔ میں بیمار ہوں ۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میرے لیے آرام اور سکون کی ضرورت ہے ۔ ایک روز ان صاحبزادے نے نغمہ سرائی نہ فرمائی تو دنیا کسی بہت بڑی نعمت سے محروم نہ ہو جائے گی !

بیوی : کہے تو دیتی ہوں مگر کہیں چڑ نہ جائیں ۔

میاں : مناسب الفاظ میں لکھو نا ۔ ہوں (کراہتا ہے) ۔

(بے سرے گانے کا شور جاری ہے ۔ میاں کراہ رہا ہے ۔ یک لخت بچے کے رونے کی آواز) ۔

بیوی : ارے کیا ہو گیا ننھے ۔

بچہ : (زور سے) گر پڑا خون نکل آیا ۔

بیوی : (زور سے) خط لکھ رہی ہوں ابھی آئی چپ ہو جا ۔

میاں : (کراہتے ہوئے) یک نہ شد دو شد ۔

بیوی : توبہ آپ تو بوکھلا دیتے ہیں ۔ انسان ہوں دیکھ رہے ہیں ، خط لکھ رہی ہوں ۔ بچے کو چپ کیونکر کرا سکتی ہوں ۔ نامراد چپ ہو جا ۔ خون نکل آیا تو کیا قیامت آ گئی ۔ ابھی آ رہی ہوں دو سطریں لکھ لوں ۔

(میاں کراہتا ہے ۔ بے سرے گانے اور بچے کے رونے کی آواز جاری ہے) ۔

میاں : ختم نہیں ہوا خط ؟ جانے کیا دفتر لکھنے بیٹھ گئی ہو ۔

بیوی : ابھی ہوا جاتا ہے ختم ۔

(اس غل میں ایک فقیر کی آواز بھی شامل ہو جاتی ہے) ۔

فقیر : بال بچے کی خیر ۔ راہ مولا کچھ مل جائے فقیر کو ۔

میاں : (کراہ کر) بس ان ہی کی کسر رہ گئی تھی ۔ ہوں ۔

بیوی : تو اب میں تو اسے بلا کر لے نہیں آئی ۔

میاں : ارے تو خدا کے لیے اسے رخصت تو کر آؤ ۔

بیوی : او للّو ! ارے اوللو !

(للّو ہاون دستے میں ریٹھے کوٹنے شروع کر دیتا ہے ۔ بے سرے گانے میں بچے کے رونے اور فقیر کی صدائیں اور ہاون دستے کی دھمک اور شامل ہو جاتی ہے) ۔

میاں : ہائے توبہ ، توبہ ، ہائے ۔

بیوی : ارے نامراد ریٹھے پھر کوٹ لینا ۔ پہلے اس فقیر کو رخصت تو کر دے ۔

(للّو ریٹھے کوٹنے میں بیوی کی آواز نہیں سنتا)

میاں : (جلدی جلدی کراہتا ہوا گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے) میری ٹوپی اور شیروانی دینا ۔

بیوی : ٹوپی اور شیروانی !!

میاں : ہاں میں دفتر جا رہا ہوں ۔ ابھی دفتر جا رہا ہوں ۔

بیوی : ہے ہے وہ کیوں ؟

میاں : آرام اور سکون کے لیے ۔

———

میرزا ادیب نے ۱۹۱۴ء میں لاہور کے ایک مُتوسّط گھرانے میں آنکھ کھولی ، روزگار اور معاش کی مشکلات سے ان کو ہمیشہ دو چار رہنا پڑا - پہلی جنگ عظیم نے دنیا پر جو بے یقینی مسلّط کر رکھی تھی ، اس کے درمیان میرزا ادیب نے آنکھ کھولی - اس افراتفری کے دَور میں انھوں نے علم و ادب کی مشعل کو کبھی اپنے سے الگ نہ رکھا - شاعری سے فطری ذوق کا یہ عالم تھا کہ دسویں جماعت ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا - اسلامیہ کالج لاہور سے بی - اے آنرز کیا - کالج سے نکل کر وہ تلاشِ معاش کے چکر میں رہے - جس نے ان کی فطری صلاحیتوں کو بڑی حد تک کچل کر رکھ دیا ، مگر یہ ڈوبا ہوا تارا نمودار ہو کر رہا - میرزا ادیب نے اٹھارہ سال کے عرصہ میں بہت کچھ لکھا ہے ، جس میں ڈرامے ، افسانے اور متنوّع مضامین سب کچھ شامل ہیں -

میرزا ادیب کے ڈرامے عموماً سماجی آویزش کے رہونِ منت ہیں - ان کے ہاں کلاسیکی ڈرامے کی ہمہ گیری نہیں ہے - یہ عموماً ایک ایکٹ سے آگے نہیں بڑھتے اور ایک ایکٹ میں زندگی کی مختصر کینوس کو پیش کرتے ہیں - ان کے یہاں تغیر پسندی ہے اور کہیں کہیں جذباتیت بھی - میرزا ادیب زندگی میں میانہ روی اور اعتدال کے قائل ہیں - اس لیے سماجی زندگی کے ان غیر معتدل عناصر کو پیش کرتے ہیں اور

اسی سے کردار کا تضاد اور ڈرامے کی بنیادی آویزش فراہم کرتے ہیں۔

وہ کردار نگاری کو اس قدر اہمیت نہیں دیتے جتنی عہد حاضر کے اکثر ڈراما نویس دینے لگے ہیں۔ اُن کے کرداروں میں غیر معمولی کردار نہیں ہوتے اور رومانوی کردار بہت کم ہوتے ہیں۔ میرزا کے کردار عام زندگی کی تصویریں ہیں۔ میرزا آسان، سیدھی سادی روز مرہ بول چال کی زبان لکھتے ہیں۔

فن کار

کردار

سرفراز ---------- مصور

عصمت ---------- سرفراز کی بیوی

جیواں ---------- بوڑھی ہمسائی جو ناک میں بولتی ہے۔ ان کے علاوہ تین آدمی

منظر

[مصور سرفراز کا گھر جو ایک کوٹھڑی اور ایک دالان پر مشتمل ہے۔ کمرہ بہ یک وقت ڈرائنگ روم، خواب گاہ اور سٹوڈیو بھی ہے اور اس لحاظ سے ادنیٰ درجے کا جتنا سامان اکٹھا ہو سکتا ہے سب کا سب اس کمرے میں بکھرا پڑا ہے۔

دیواروں پر سرفراز کی اپنی بنائی ہوئی تصویریں لٹک رہی ہیں جن کا رنگ و روغن دھوئیں اور گرد و غبار سے خراب ہو چکا ہے۔ شمالی دیوار کے ساتھ چارپائی پر مصور کی بیوی عصمت لحاف اوڑھے لیٹی ہے۔ سوائے سر اور چہرے کے سارا جسم لحاف کے اندر ہے۔

کمرے کے دوسرے کونے میں صحن والے دروازے سے ٹیک لگائے سرفراز کسی فکر میں غرق ہے۔ اس کے آگے ایک سفید کاغذ پڑا ہے۔۔۔ چند لمحے وہ سفید کاغذ کو گھور کر دیکھتا رہتا ہے۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سر کے بالوں میں کنگھی کرتا ہے، پھر پاس پڑی ہوئی تپائی پر سے کوئی کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دیتا ہے۔۔۔۔ کتاب چھوڑ دیتا ہے۔ بیڑی سلگاتا ہے اور اس کے کش لینے لگتا ہے۔ عصمت کھانستی ہے۔ سرفراز اٹھ کر اس کے پاس جاتا ہے۔]

سرفراز : ابھی طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی، سر کا کیا حال ہے؟

عصمت : (لہجہ میں بیزاری) خاک ٹھیک ہوئی ہے طبیعت! سر میں سخت درد محسوس ہو رہا ہے۔

سرفراز : بری خبر۔

عصمت : سر پھٹا جا رہا ہے اور وہ جو رات دال کھائی تھی اس کی وجہ سے معدہ خراب ہے۔۔۔۔ کھانسی بھی شروع ہو گئی ہے۔ تم کہو۔۔۔۔ (کھانستے ہوئے) ٹائیٹل بنا لیا ہے نا؟

سرفراز : ٹائیٹل ۔۔! اونہوں (نفی میں سر ہلا دیتا ہے) کچھ سوجھ ہی نہیں رہا ہے، بناؤں کیا؟

عصمت : (ذرا چیخ کر) ہائے صبح سے بیٹھے ہو اور ابھی تک ٹائیٹل ہی نہیں بنا سکے، خبر ہے پبلشر کو چار بجے آنا ہے۔ کیا دو گے اسے؟ یوں ہی پیسے دے دے گا نا وہ خیرات

میں ، توبہ ! - - - - دو دن سے چیخ رہی ہوں کہ تمام
کی تمام رقم ختم ہو چکی ہے ، تکیے کے نیچے صرف دو روپے
سات آنے پڑے ہیں - کب تک گزارہ ہوگا ان میں - ایک
مصیبت ہو تو انسان سہے بھی - تم نے تو لٹیا ہی ڈبو دی ہے-
(سرفراز بیڑی کے جلدی جلدی کش لیتا رہتا ہے -)

سرفراز : بیگم میں کیا کروں آخر ، دماغ کام ہی نہیں کرتا - تم
ہی کچھ بتاؤ کیا کروں ؟

عصمت : مزے سے فاقے کرو اور ساتھ مجھے بھی مارو اور کیا کرو گے
تم بھلا - (جیسے درد سے بیقرار ہو کر) ہائے پیٹ -

سرفراز : کیا ہوا ؟

عصمت : درد ہے پیٹ میں دیکھتے نہیں ؟

سرفراز : ابھی تو سر میں درد تھا -

عصمت : تو کیا پیٹ میں درد نہیں ہو سکتا - کس شان سے فرمایا
جاتا ہے - (نقل اتارتے ہوئے) ابھی تو سر میں درد تھا !

سرفراز : (ہنس کر) خوب !

عصمت : اب مذاق کی سوجھ رہی ہے حضور کو !

سرفراز : ہرگز نہیں ، تمہارے سر میں درد ہو اور پیٹ میں بھی
ہونے لگے اور میں مذاق کروں ؟ یہ کبھی نہیں
ہو سکتا -

عصمت : تمھیں درد ہو تو پتا چلے نا !

سرفراز : میں نے ہزار بار کہا کہ یہ دال نہ پکایا کرو -

عصمت : اچھا جی نہیں پکایا کروں گی ، مگر ہر روز سبزی گوشت

کہاں سے آئے گا؟ اوقات کیا ہے ہماری؟ اگر یہی حالت
رہی اور تمہارا دماغ یوں ہی بے کار رہا تو ایک روز
یقیناً دال بھی نہیں پک سکے گی اور کیا؟ ابھی دھوبی کے
پیسے دینا ہیں ---- سبزی والے کے الگ مقروض ہیں
اور صبح ہی صبح اماں فاطمہ بھی قرض کا تقاضا کرنے
آئی تھیں - کیوں نہ مانگے اپنا روپیہ؟ کتنے دن گزر
چکے میں، کچھ خیال بھی ہے جناب کو؟

سرفراز : مابدولت کو سب خیال ہے -

عصمت : مابدولت کی حالت تو کوئی دیکھے آ کر (آہ بھر کر) اللہ
ہی جانتا ہے کس طرح زندگی کے دن پورے کر رہی
ہوں - نہ تن پر کپڑا نہ پیٹ میں روٹی، وہ کون سی
اللہ ماری گھڑی تھی جب اس منحوس گھر میں قدم
رکھا تھا -

سرفراز : بیگم رائی کا پہاڑ نہ بنایا کرو[۱] -

عصمت : اچھا تو ہم رائی کا پہاڑ بناتے ہیں! گھر میں سب کچھ
ٹھیک ٹھاک ہے نا!

سرفراز : دیکھو نا بیگم (لہجے میں سنجیدگی) میں کہتا ہوں ---

عصمت : کیا کہتے ہیں آپ؟

سرفراز : بیگم تمھیں معلوم نہیں تمھاری یہ حالت دیکھ دیکھ کر
میرا دل کس قدر کڑھتا رہتا ہے - مگر کیا کروں؟
کس کا دل نہیں چاہتا کہ اطمینان سے زندگی بسر کرے؟

عصمت : تمہارا دل تو بالکل نہیں چاہتا -

سرفراز : کس طرح کہہ سکتی ہو تم؟

---

۱ - ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دینا -

عصمت : ذرا غور کرو - تمہارے دوست اور ساتھی کہاں سے کہاں جا پہنچے ، لیکن تم ابھی تک وہیں ہو ، بلکہ اور پیچھے ہٹ گئے - ترقی دنیا میں عقل مند آدمی کرتے ہیں بیوقوف نہیں -

سرفراز : سچ کہتی ہو بیگم - اس سے زیادہ بے وقوف اور کیا ہوگی کہ مصوری کو ذریعہ معاش بنائے بیٹھا ہوں - کوئی انتہا بھی ہے حماقت کی -

عصمت : توبہ کس طرح بات کو مذاق میں ٹالا جا رہا ہے -

سرفراز : بالکل سچ - - - کہہ رہا ہوں - جی چاہتا ہے کوئی اور کام شروع کر دیا جائے - پر اور کوئی کام کر ہی نہیں سکتا - اب کہاں نئی دنیا بسائی جائے -

عصمت : تو مزے کرو ، صبح میں ایک ٹائیٹل بھی نہیں بن سکا -

سرفراز : یہ تو درست ہے -

عصمت : اب کیا ہوگا ؟

سرفراز : میرا خیال ہے بیگم اگر اس وقت گرم گرم چائے کا ایک آدھ کپ پی لیا جائے تو ممکن ہے سوئی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھیں -

عصمت : ہاں یہ تو ہوگا ہی -- گلا گھونٹ کر کیوں نہیں مار دیتے - ہمیشہ کے لیے قصہ ہی ختم ہو جائے - درد سے سر پھٹا جا رہا ہے . پیٹ میں درد الگ ہے - کھانسی رکنے کا نام نہیں ، اس پر فرمایا جا رہا ہے گرم گرم چائے تیار کر دو - توبہ میرے اللہ -- ستا لو جی بھر کے ، پھر شاید کبھی موقع نہ مل سکے -

(انگلیوں سے رخسار اس طرح پونچھتی ہے جیسے رو رہی ہو) ۔

سرفراز : بھئی اس قدر بگڑنے کی کیا ضرورت ہے بازار میں کئی ہوٹل ہیں اور ہر ہوٹل سے چائے منگوائی جا سکتی ہے ؟

عصمت : یوں ہی بگڑ رہی ہوں نا ؟

سرفراز : اور کیا ؟

عصمت : جی ہاں ۔ دماغ جو خراب ہو گیا ہے ۔ کیوں نہ بگڑوں گی بھلا ۔

سرفراز : دیکھو بیگم !

عصمت : چھوڑ آؤ پاگل خانے میں جا کر ۔ کہیں تمہیں کاٹ نہ کھاؤں !

سرفراز : آخر ہو کیا گیا ہے تمہیں ؟

عصمت : (سچ مچ روتے ہوئے) یوں ہی بگڑ رہی ہوں ۔ یہ بات کہتے ہوئے تمہیں شرم تو نہیں آتی ؟

سرفراز : (خفا ہو کر) بیگم ! میں یہ ہر وقت کے طعنے برداشت نہیں کر سکتا ۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر شادی کیوں کی تھی ۔ کیا تمہیں خبر نہیں ایک فن کار کی اس ملک میں مالی حالت کیا ہوتی ہے ۔ اب چیخ کیوں رہی ہو ۔ اس روز روز کی چیخ پکار نے تو میری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے ۔

عصمت : اور میری زندگی جنت ہے نا ! دیکھتے نہیں کتنا آرام میسر ہے مجھے ، دو دن سے چارپائی پر پڑی ہوں اور سارا گھر کباڑ خانہ بن گیا ہے ۔ کوئی چیز بھی ٹھکانے پر نہیں رہی ۔ نفاست تو تمہیں چھو کر بھی نہیں گئی ، بڑے مصور بنے پھرتے ہو اور گھر کا یہ حال ہے ۔

سرفراز : گھر کی صفائی میرا نہیں تمھارا فرض ہے۔

عصمت : اب قبر سے اٹھ کر آؤں گی گھر کی صفائی کے لیے۔

(وقفہ)

سرفراز : بیگم (نرم لہجے میں) میں نے کہا ......

عصمت : (بدستور گرم لہجے میں) کیا ہے کوئی کسر باقی، رہ گئی ہے کیا ؟

سرفراز : ذرا تحمّل سے کام لو۔

عصمت : تحمّل سے کام لیتے لیتے تو قبر میں پہنچ چکی ہوں۔

سرفراز : (گرج کر) تم تو پاگل ہو گئی ہو اور مجھے بھی پاگل کر کے چھوڑو گی۔

عصمت : یہی ہو گا آخرکار۔

سرفراز : زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں، گلاس کہاں ہے ؟

عصمت : کیا خبر مجھے ؟

سرفراز : (کونے میں برتنوں کا ڈھیر دیکھ کر) یہ تو سب گندے پڑے ہیں۔

عصمت : صاف کونسی چیز ہے اس گھر میں ؟

سرفراز : (ایک گلاس اٹھا کر) جی چاہتا ہے سب کے سب پھینک دوں باہر گلی میں۔ ایک برتن بھی صاف ستھرا نہیں۔

---

۱ - قوت برداشت - صبر -

عصمت : تو میں سر پیٹوں اپنا !

سرفراز : (گرج کر) بس خاموش رہو۔ انتہا ہو چکی ہے۔ زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ۔ گھر کیا ہے دوزخ کا نمونہ ہے ۔

(سرفراز دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے۔ عصمت نڈھال ہو کر سسکیاں بھرنے لگتی ہے ۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہے ۔ چند لمحے گزر جاتے ہیں ··· سرفراز واپس آتا ہے ۔ چہرہ سرخ ہے ۔ بیوی کے پاس آ کر رک جاتا ہے ۔ عصمت ابھی تک سسکیاں بھر رہی ہے) ۔

سرفراز : (آواز میں مسرت کی لرزش) بیگم !

(عصمت جواب نہیں دیتی)

میں نے کہا عصمت بیگم (عصمت لحاف میں منہ چھپا لیتی ہے) ارے منہ کیوں چھپا لیا لحاف میں ذرا دیکھو تو سہی ۔ میں نے کہا عصمت بانو خدا کی قسم ایک ایسا حادثہ پیش آیا ہے کہ خوشی سے اچھل پڑو گی۔ ذرا دیکھو تو ۔

عصمت : (لہجے میں بیزاری) سونے مرنے دو ۔

سرفراز : یہ دیکھو تو کیا ہے میرے ہاتھ میں ، دیکھو (جیب سے ایک لفافہ نکالتا ہے) ۔

عصمت : میں نہیں دیکھتی ۔ خدا کے لیے پریشان نہ کرو چھلانگ لگا کر مر جاؤں گی گلی میں ۔

سرفراز : یوں نہیں مانوگی ۔(لحاف میں ہاتھ ڈال کر گدگدی کرتا ہے ، لحاف ہٹ جاتا ہے) ۔

عصمت : ہائے اللہ چھوڑو ...... گدگدی کرتے شرم تو نہیں آتی ہوگی ۔

سرفراز : دیکھتی کیوں نہیں ۔

عصمت : کیا دیکھوں ؟

سرفراز : (لفافے سے نوٹ نکالتے ہوئے) ۔
یہ نوٹ سو سو کے ۔

عصمت : کیا ؟ (نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے) دکھاؤ ۔

سرفراز : اونہوں ۔

عصمت : (بیٹھ کر) کہاں سے آئے !

سرفراز : ارے تم تو بیٹھ گئی ہو ۔ ابھی تو قبر کے کنارے پہنچ گئی تھیں ۔

عصمت : دکھاؤ ذرا ۔

سرفراز : (ذرا دور سے دکھاتے ہوئے) سچ مچ کے نوٹ ہیں ۔ سادہ کاغذ نہیں ۔

عصمت : ملے کہاں سے ؟

سرفراز : (بیوی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے)
واہ کیسی چمک آ گئی ہے آنکھوں میں ۔

عصمت : میں پوچھتی ہوں آئے کہاں سے ؟

سرفراز : بس یوں ہی سمجھ لو اللہ دین کا چراغ ہمارے ہاتھ آ گیا تھا ، ادھر رگڑا ادھر جن حاضر ہوگیا ۔ ہم نے حکم دیا ۔ دیکھو ہماری بیگم بہت خطرناک حد تک بگڑ رہی ہیں بلکہ روٹھ کے قبر کے کنارے تک جا پہنچی ہیں ۔ اس لیے فوراً ایک ہزار کے نوٹ لے آؤ ۔ وہ لے آیا ۔ قصہ ختم ۔

عصمت : بھئی مذاق وذاق چھوڑو۔ سچ سچ بتاؤ یہ لفافہ ملا کہاں سے ؟...... دیکھوں ذرا ۔ (عصمت لفافہ لیتی ہے) اس پر تو تمھارا نام بھی نہیں ۔

سرفراز : لفافے پر میرا نام تو نہیں مگر اور کس کا ہے ؟

عصمت : نام تو نہیں ، تو ڈاکیا دے کیوں کر گیا ؟

سرفراز : ڈاکیا کہاں آیا تھا یہاں ؟ دینے والے کا مقصد صرف یہ تھا کہ نوٹ پہنچ جائیں اور یہ پہنچ گئے ہیں ۔

عصمت : کس نے دیے ! کیسے ملے .... معما[1] کیا ہے یہ ؟

سرفراز : آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے سے ؟

عصمت : بہر حال یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ آم گرے کس پیڑ سے ہیں ؟

سرفراز : اس کی ضرورت نہیں ۔ ہمیں روپوں کی اشد ضرورت تھی اور وہ ہمیں مل گئے ۔ اور کیا چاہیے ۔

عصمت : بتاتے کیوں نہیں ؟ خواہ مخواہ پریشان کر رہے ہو ۔

سرفراز : بات یہ ہے عصمت بانو کہ یہ کسی ایسے شخص نے بھیجے ہیں جسے میں جانتا ہی نہیں ۔

عصمت : جسے میں جانتا ہی نہیں .... یہ کیا بات ہوئی بھلا ؟

سرفراز : اگر جانتا ہوتا تو نام بتانے میں کیا ہرج تھا ؟

عصمت : ہے وہ کون ؟

سرفراز : کوئی مداح میرے فن کا .... کوئی عقیدت مند ہے ۔ جسے میرے فن سے گھری دلچسپی ہے ۔

---

۱ - پیچیدہ بات ۔

عصمت : رہتا کہاں ہے ؟

سرفراز : میں کہ رہا ہوں کہ میں اس کا نام تک نہیں جانتا ۔

عصمت : نام کیوں نہیں پوچھا ۔

سرفراز : مجھ سے ملتا تو نام بھی پوچھتا نا ۔

عصمت : ملا بھی نہیں ؟

سرفراز : اونہوں ۔

عصمت : ہائے اللہ یہ پہیلی کیا ہے ۔ خدا کی قسم بہت پریشان کر رہے ہو ۔

سرفراز : بیگم واقعہ صرف یہ ہے کہ تم سے لڑ کر باہر جا رہا تھا کہ باہر ڈیوڑھی والے دروازے کے پاس ایک لفافے پر نظر پڑی ۔ یہی ہے وہ لفافہ ۔ کھولا تو چودہ طبق[۱] روشن ہو گئے ۔

عصمت : وہاں کس نے رکھا تھا ؟

سرفراز : یہ عقیدت مندی کے کرشمے ہیں ۔

عصمت : پہلے تو کبھی یہ کرشمہ نہیں ہوا تھا آج یکایک یہ کیسے ہو گیا ؟

سرفراز : ہر روز یہ کرشمے نہیں ہوتے ۔

---

۱ ۔ طبق کے معنی تھال کے ہیں ۔ یہاں مراد انتہائی خوشی سے ہے کہ گویا ساتوں آسمان اور ساتوں زمین کے پردے میرے لیے کھل گئے ۔

عصمت : تمھارا بھی کوئی عقیدت مند ہوگا ...... یہ مجھے معلوم نہیں تھا ۔ مگر اس بھلے مانس نے لفافہ ہاتھ میں دیا ہوتا۔ منی آرڈر کے ذریعہ بھیجا ہوتا ۔ رجسٹری کی ہوتی ۔

سرفراز : یہ بات تمھارے ذہن میں کبھی نہ آئے گی ۔

عصمت : کونسی بات ؟

سرفراز : عقیدت مندی کا جذبہ تکلف سے بہت بلند رہتا ہے۔ عقیدت مند جب اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے تو وہ احسان نہیں کرتا ۔ کیا سمجھیں ؟

عصمت : پھر بھی ......اور پھر یہ بھی دیکھو ۔ ڈیوڑھی میں پھینک گیا تھا ۔ اگر کسی اور کی نظر پڑ جاتی تو !

سرفراز : کیسے پڑ جاتی ؟

عصمت : جیسے تمھاری پڑ گئی ہے ۔

سرفراز : میرے لیے تو یہ ہے ہی ۔

عصمت : میں کچھ سمجھ نہیں سکی ۔

سرفراز : اس میں الجھن کیا ہے آخر ؟ معاملہ بالکل صاف ہے یہ میرے کسی عقیدت مند کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے ۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں ۔ ابھی پرسوں اخبار میں پڑھ رہا تھا کہ ایک مصنف بڑی تنگدستی سے گزر اوقات کر رہا تھا ۔ ایک دن صبح ہی صبح اسے ایک لفافہ ملتا ہے ، کھول کر دیکھتا ہے تو اس میں دس ہزار کا چیک موجود ہے ۔ ظاہر ہے یہ اس کے کسی عقیدت مند ہی نے از راہ عقیدت اس کو بھیجا تھا ۔ رڈ یارڈ کپلنگ کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ کپلنگ کو کسی کا روپیہ ادا

کرنا تھا ۔ اس نے چیک بھیج دیا مگر یہ چیک کبھی کیش نہ ہوا ۔

عصمت : کیوں ؟

سرفراز : جسے چیک ملا تھا وہ کپلنگ کا عقیدت مند تھا ۔ اپنے ممدوح کے دستخط اسے اس قدر عزیز تھے کہ اس نے چیک کیش ہی نہیں کروایا ۔

عصمت : اچھا !

سرفراز : ہم کپلنگ بننے سے تو رہے ، تاہم مصوری کا فن بے آسرا بے سہارا بھی نہیں ہے ، آج تم نے دیکھ ہی لیا ہے ۔ خیر بتاؤ پروگرام کیا ہے ؟

عصمت : کیسا پروگرام ؟

سرفراز : یعنی اب ہمیں کیا کرنا ہوگا ؟ میرا خیال ہے سب سے پہلے ڈاکٹر کے یہاں جائیں گے ، درد سے تمھارا سر پھٹا جا رہا ہے ، معدہ خراب ہے اور شدید کھانسی بھی آ رہی ہے ۔

عصمت : اوہ (ذرا مسکرا کر) اس کی پروا نہ کرو ۔ تکلیف ہے مگر اس قدر نہیں کہ فوراً ڈاکٹر کے پاس بھاگا جائے ۔

سرفراز : تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا ۔

عصمت : وہ تو تم جانتے ہی ہو جب آدمی پریشان ہوتا ہے تو (مسکرا کر) کسی قدر پاگل ہو جاتا ہے ۔

سرفراز : مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر کے یہاں جانے کی ضرورت نہیں ۔

عصمت : جی نہیں ۔

سرفراز : پر بازار تو جانا ہی پڑے گا...... تمھارے لیے دو جوڑے خریدنا ہی چاہییں ۔

عصمت : تمھارا لباس بھی تو ٹھیک نہیں ۔

سرفراز : ایک آدھ جوڑا خرید لیں گے اور ہاں یاد آیا ، وہ آویزے تو ضرور خریدے جائیں گے جنھیں اس دن تم نے بڑی حسرت انگیز نظروں سے دیکھا تھا ۔

عصمت : کون سے آویزے ؟

سرفراز : وہی جو نازی کے کانوں میں جھلملا رہے تھے ۔ مجھے معلوم ہے یہ کس دکان میں بکتے ہیں ۔ اس کے علاوہ تمھارے لیے سینڈل تو آئیں گے ہی ۔

عصمت : چوڑیاں ...... دیکھو نا ! سب کی سب ٹوٹ چکی ہیں ۔

سرفراز : بازار جائیں اور عصمت بانو کے لیے چوڑیاں نہ خریدیں ، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا ۔

عصمت : آج تو بڑی دریا دلی کا ثبوت دیا جا رہا ہے ۔

سرفراز : میں دل کا برا نہیں ہوں عصمت بانو ! جب گھر میں دریا بہنے لگے تو دریا دلی خود بخود آ جاتی ہے ۔ مگر جب قطرے کو ترس رہے ہوں تو آدمی کتنا برا بن جاتا ہے ۔

عصمت : تم برے نہیں ہو ۔

سرفراز : یہ آج انکشاف ہوا تم پر ۔

عصمت : توبہ ! کیسی بری بات ہے ؟

سرفراز : کونسی ؟

عصمت : میں نے پریشانی میں نہ جانے تمھیں کیا کیا کہا ہوگا ؟ پاگل ہوگئی تھی میں -

سرفراز : اب ایسی باتیں سوچنے کی ضرورت نہیں -

عصمت : (لہجے میں شرمندگی کا احساس) سچ مچ مجھے اس کا بہت افسوس ہے - معاف کر دو -

سرفراز : بیگم معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - میرا لہجہ بھی تو کافی تلخ ہوگیا تھا -

عصمت : بہر حال مجھے معاف کر دو -

سرفراز : اچھا بھئی اگر تمھاری یہی خواہش ہے تو معاف کر دیا ، تم کو اور اپنے آپ کو بھی - اب تو خوش ہو نا ؟

عصمت : بڑی مہربانی -

سرفراز : کیسی عجیب بات ہے - ادھر ہم لڑتے رہے ادھر گھر کے دروازے پر زندگی مسرتوں کے شگفتہ پھول لیے ہمارا انتظار کرتی رہی - بیگم سچ کہتا ہوں جیسے ہی میری نظر لفافے پر پڑی کچھ محسوس ہوا ، جیسے ، جیسے کچھ عجیب ہی کیفیت تھی - اوہ ! دماغ کہتا تھا لو وہ چیز آ گئی جس سے زندگی میں بہار آتی ہے - جس سے پژمردہ پھول کھل جاتے ہیں اور جس کے دامن میں قوسِ قزح کی رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں -

عصمت : کیسے شاعرانہ فقرے ہیں -

سرفراز : آج تو یہی جی چاہتا ہے - خوب شاعری کی جائے - بہار کی رنگینیاں اور مسکراہٹیں ذہن پر نشہ سا برسا رہی ہیں - ہر شے پر خوب صورتی چھائی ہوئی ہے - اختر شیرانی کا وہ شعر یاد آگیا ہے :

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے لگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے

عصمت : میں نے اب عہد کر لیا ہے کہ آئندہ کبھی نہیں لڑوں گی، کبھی تلخ بات زبان سے نہیں نکالوں گی ۔

سرفراز : ماضی کی باتیں ماضی کے ساتھ رخصت ہو گئیں ۔ مستقبل خوشگوار بنانا چاہیے ۔

عصمت : یہ تو ہوگا ہی ۔

سرفراز : تو بیگم اگر تم اجازت دو جھٹ پٹ کتاب کا ٹائیٹل بنا دوں ۔

عصمت : جی چاہے تو بنا دو اور نہ چاہے تو نہ بناؤ ۔

سرفراز : ذہن میں ایک خیال آیا ہے ۔ واللہ پبلشر تڑپ اٹھے گا ۔

عصمت : بنا دو پھر ۔ میں تمھارے لیے چائے بناتی ہوں ۔ ٹھیک ہے نا !

سرفراز : نا بھئی یہ غضب نہ کرنا ۔ تمھارا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے ۔

عصمت : اب چھوڑو بھی نا یہ قصہ ۔ ٹھیک ٹھاک تو ہوں ۔

سرفراز : جیواں کو آواز دے دو ۔ لے آئے گی دودھ وغیرہ ۔

عصمت : اچھا ۔

(عصمت کمرے سے باہر نکل جاتی ہے ۔ سرفراز صحن والے دروازے سے ٹیک لگا کر تصویر بنانے لگتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گنگناتا جاتا ہے ۔

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے
عصمت واپس آتی ہے - شوہر کو تصویر بناتے ہوئے دیکھتی ہے
اور انگیٹھی میں کوئلے ڈالنے لگتی ہے - جیواں آتی ہے)

جیواں : (ناک میں بولتی ہے) کیا ہیں ؟

عصمت : دودھ لے آؤ آدھ سیر -

جیواں : آندھ سیر بانس -

سرفراز : (وہیں سے) عصمت کتنے پیسے ہیں تمھارے پاس ؟

عصمت : تین روپے اور شاید سات آنے -

سرفراز : جیواں دو روپے کی مٹھائی لے آؤ ...... دو کی نہیں، اڑھائی روپے کی - آدھ سیر دودھ اور باقی جو بچے وہ تمہارا -

جیواں : واں واں ...... آنج تو عینش ہیں -

سرفراز : عینش ہیں عینش -

عصمت : تکیہ کے نیچے پیسے پڑے ہیں - اُٹھا لو جا کر -

جیواں : آنچھا -

جیواں تکیہ کے نیچے سے پیسے نکالتی ہے ...... برتنوں میں سے
گلاس اٹھاتی ہے ...... سرفراز بدستور گنگنا رہا ہے ... عصمت
اٹھ کر شوہر کے پاس آتی ہے)

عصمت : خوب !

سرفراز : میرا گانا یا ٹائیٹل ؟

عصمت : یہ ...... ٹائیٹل خوب سوجھا ہے -

سرفراز : دیکھ لو آج طبیعت زوروں پر ہے ...... چاہوں تو دس کتابوں کے ٹائیٹل ابھی بنا سکتا ہوں ۔

عصمت : واقعی ۔

سرفراز : دیکھ لو ! کتنی جلدی ٹائیٹل مکمل کر لیا ہے ۔ بات یہ ہے کہ جب طبیعت میں امنگ ہو تو ہر کام آسان ہو جاتا ہے ۔ ٹائیٹل دیکھ کر مصنف اور پباشر دونوں خوش ہو جائیں گے ۔

عصمت : خوش نہیں ہوں گے تو اور کیا ہو گا ؟

سرفراز : میں نے کہا بیگم ایک پلیٹ صاف کر دو ۔

عصمت : مٹھائی کے لیے ؟

سرفراز : ہاں ۔

عصمت : اچھا ، جیواں نہیں آئی ابھی تک ؟

(جیواں آتی ہے ۔ ایک ہاتھ میں گلاس اور دوسرے میں مٹھائی کا لفافہ ہے ۔)

سرفراز : آ تو گئی ہے ۔

عصمت : بڑی لمبی عمر ہے جیواں تیری ۔

جیواں : آنچھا ...... کہاں رنکھوں ؟

عصمت : دے دو مجھے ۔

جیواں دودھ والا گلاس عصمت کے پاس رکھ دیتی ہے اور لفافہ ہاتھ میں پکڑا دیتی ہے)

جیواں : آں ...... باہر تین آدمی پوچھتے ہیں ۔

سرفراز : مجھے؟...... اچھا کون ہیں یہ حضرات ؟

عصمت : پبلشر وغیرہ ہوں گے ...... یا شاید وہی لوگ (مسکرا کر) آپ کے عقیدت مند ۔

سرفراز : ہو سکتا ہے - دیکھتا ہوں باہر جا کر -

(جیوان چلی جاتی ہے - سرفراز بھی دروازے سے نکل جاتا ہے - عصمت مٹھائی پلیٹ میں ڈالتی ہے اور اسے تپائی کے اوپر رکھ کر رومال سے ڈھانپ دیتی ہے - سرفراز واپس آتا ہے) -

عصمت : کون ہیں ؟

سرفراز : تین معزز آدمی - - - کہتے ہیں ملنے کا بڑا اشتیاق تھا -

عصمت : تو - - - - ؟

سرفراز : تو کیا - - - - اندر بلانا چاہیے انھیں -

عصمت : بٹھائیں گے کہاں ؟

سرفراز : تم کوٹھری میں چلی جاؤ - - - اور لباس تبدیل کر لو بازار جانے کے لیے - میں چند منٹ اُن سے باتیں کرتا ہوں ہاں بٹھائیں گے کہاں ، یہیں چارپائی پر بیٹھ جائیں گے -

(لحاف لپیٹ کر رکھ دیتا ہے - دری کی شکنیں نکالنے لگتا ہے) -

عصمت : اچھا

(عصمت کوٹھری کے اندر چلی جاتی ہے - سرفراز دروازے کے پاس کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہتا ہے) -

تشریف لائیے جناب - (دو خوش پوش شخص اور ایک معمولی لباس میں ملبوس آدمی داخل ہوتے ہیں -)

سرفراز : معاف کیجیے جناب ، ایک مصور کی اتنی توفیق کہاں کہ کوئی شاندار ڈرائنگ روم بنا سکے -

پہلا آدمی : آپ تو ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں -

سرفراز : تشریف رکھیے ۔ (چارپائی کی طرف اشارہ کرکے) بیٹھیے ۔

(تینوں چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں) ۔

دوسرا آدمی : یہ کمرہ ہماری نظروں میں خوبصورت سے خوبصورت ڈرائنگ روم سے بھی بہتر ہے کیونکہ یہاں ایک سچا فن کار کام کرتا ہے ۔

سرفراز : یہ ۔ ۔ ۔ آپ کی ذرہ نوازی ہے ۔

پہلا آدمی : اس میں ذرہ نوازی کو قطعاً کوئی دخل نہیں ۔ مدت سے آپ کا ذکر سن رہے تھے ۔

دوسرا آدمی : اور آج ملاقات کا اشتیاق کشاں کشاں لے آیا ہے ۔

(سرفراز تپائی چارپائی کے قریب لے آتا ہے اور پلیٹ پر سے رومال ہٹا دیتا ہے ۔)

سرفراز : یہ لیجیے میری قدر افزائی کیجیے ۔

پہلا آدمی : یہ کیا ؟ اس قدر تکلف ۔

سرفراز : نہیں صاحب یہ میرا فرض ہے ۔ لیجیے نا ۔

(دونوں خوش پوش کھانے لگتے ہیں ۔ تیسرا چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے ۔ سرفراز کی اس کی طرف نظر نہیں جاتی) شرمندہ ہوں کہ خاطر خواہ تواضع نہیں کر سکا.........ایک مصور ۔

پہلا آدمی : ارے صاحب آپ کیا ہیں ، یہ ہم جانتے ہیں ۔

سرفراز : ہاں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس عزت افزائی کا کچھ مقصد بھی ہو گا ۔

پہلا آدمی : جی ہاں ۔ ۔ ۔ ایک مقصد کے تحت ہی حاضر خدمت ہونے کا شرف حاصل کیا ہے ۔

سرفراز : فرمائیے ۔

دوسرا آدمی : اس سے پہلے مختصر سی تمہید سن لیجیے ۔

پہلا آدمی : میں عرض کرتا ہوں ۔ آج کل فن کی جو حالت ہے آپ سے پوشیدہ نہیں ۔ آپ تو ماشأ اللہ خود اس دشت کی سیاحی میں مصروف ہیں ۔

سرفراز : جی ہاں ۔

دوسرا آدمی : یہاں چند اہلِ درد نے ایک انجمن کی بنیاد رکھی ہے ۔ اس انجمن کا مقصدِ حیات صرف یہ ہے کہ ان فنکاروں کی مدد کی جائے جو بدقسمتی سے مالی الجھنوں میں مبتلا ہیں اور فن کی طرف پوری توجہ نہیں کر سکتے ۔ ظاہر ہے کسی اثاثے کے بغیر یہ انجمن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی ۔

سرفراز : بجا فرما رہے ہیں آپ ۔

دوسرا آدمی : یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تائید ہر معقول آدمی کرے گا ۔ تو جناب ہم نے چندہ جمع کرنے کا کام شروع کر دیا ہے ۔

سرفراز : اس کے علاوہ سرمایہ جمع کرنے کی اور کوئی سبیل ہی نہیں ۔

دوسرا آدمی : بالکل درست فرمایا آپ نے ۔

پہلا آدمی : ہم جانتے ہیں کہ آپ ایک فنکار ہیں اور آپ کی حالت عام فن کاروں سے مختلف نہیں ہوگی ۔ تاہم یہ بھی خیال ہے شاید ان دنوں آپ کی کوئی تصویر فروخت ہو گئی ہو ۔

---

۱ ۔ پونجی ۔

سرفراز : تصویر فروخت نہیں ہوئی ---- یہاں یہ فن سمجھنے والے ہی کتنے ہیں -

پہلا آدمی : جی ہاں - !

سرفراز : مگر آپ مایوس نہ ہوں -

دوسرا آدمی : کیا فرمایا آپ نے ؟

سرفراز - : میں اس مقصد کے لیے ضرور چندہ دوں گا -

پہلا آدمی : جب ان دنوں آپ کی کوئی تصویر ہی نہیں بکی تو آپ سے چندہ طلب کرنا مناسب بات نہیں ہوگی -

سرفراز : نہیں صاحب میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا - میری طرف سے پچاس روپیہ کی حقیر رقم منظور کر لیجیے -

دونوں آدمی : (بیک وقت) جی !

سرفراز : کاش میں زیادہ دے سکتا -

پہلا آدمی : مگر یہ آپ پر زیادتی ہوگی -

(تیسرا آدمی بالکل نہیں بولتا - پاگلوں کی طرح ان کو دیکھتا رہتا ہے -)

سرفراز : نہیں صاحب -

دوسرا آدمی : مگر دیکھیے نا ! آپ کی حالت -

سرفراز : (مسکرا کر) آپ ایک گھنٹا پیشتر آتے تو پچاس روپیہ کیا پچاس پیسے بھی نہ دے سکتا تھا -

پہلا آدمی : اچھا !

سرفراز : اب میں یہ رقم دے سکتا ہوں ۔

پہلا آدمی : خوب ! معلوم ہوتا ہے کہیں سے خزانہ مل گیا ہے ۔

سرفراز : خزانہ کہاں سے ملے گا صاحب ؟

پہلا آدمی : بات تو کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے ۔

سرفراز : واقعہ یہ ہے کہ آج ہمارے کسی عقیدت مند نے عقیدت مندی کا مظاہرہ کیا ہے ۔

دوسرا آدمی : واقعی ؟

سرفراز : جی جناب ۔

پہلا آدمی : بہت نیک انسان ہوگا ۔ خدا سب کو ایسی توفیق دے ، ویسے یہ کوئی خاص حادثہ نہیں ، آپ ہیں ہی ایک عظیم مصور ۔

سرفراز : آپ ایسا سمجھتے ہیں تو آپ کی بہت کرم فرمائی ہے بلکہ بہت بڑا مبالغہ ہے ۔

پہلا آدمی : ہم بالکل درست عرض کر رہے ہیں ۔ ہمیں یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ابھی دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ایک عظیم مصور کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں ۔ مگر واقعہ کیا ہے ۔

سرفراز : معمولی سی بات تھی ۔ ہوا یہ کہ چائے لینے بازار جا رہا تھا کہ یکایک ڈیوڑھی میں ایک لفافے پر نظر پڑی ۔ اٹھایا تو اس میں ایک ہزار کے نوٹ تھے ۔

دونوں آدمی : (ایک ساتھ) بہت خوب !

سرفراز : وہ کپلنگ والا واقعہ آپ کو یاد ہوگا۔ یورپ میں یہ بات عام ہے۔

پہلا آدمی : واہ واہ۔ ۔ ۔ ۔ سرفراز صاحب، خدا کی قسم آپ واقعی ایک عظیم مصور ہیں۔ آپ نے تو ہمیں ذرا برابر پریشان نہیں کیا۔

سرفراز : (گھبرا کر) جی!

پہلا آدمی : ہمیں یقین نہیں تھا کہ معاملہ اتنی جلدی صاف ہو جائے گا۔

سرفراز : میں سمجھا نہیں مطلب۔

دوسرا آدمی : (ہنستا ہے) ایک فن کار۔ ۔ ۔ فن کار ہی ہوتا ہے۔

سرفراز : نہ جانے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

پہلا آدمی : ہم۔ ۔ ۔ یعنی میں اور یہ صاحب، دونوں خفیہ پولیس کے آدمی ہیں۔

سرفراز : (پریشان ہو کر) جی۔ ۔ ۔ مگر۔

پہلا آدمی : (تیسرے آدمی کی طرف اشارہ کرکے) اور یہ حضرت ایک مجرم۔

سرفراز : میں کچھ سمجھ نہیں رہا۔

دوسرا آدمی : سنیے سرفراز صاحب۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ (تیسرے آدمی کی طرف اشارہ کرکے) یہ صاحب بھی ہیں۔ یہی ہے وہ شخص جسے آپ اپنا عقیدت مند سمجھ رہے ہیں۔ میں آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔ اصل واقعہ بتائے دیتا ہوں۔ یہ شخص ایک مقامی بینک میں ملازم تھا۔ اچھا خاصا شریف آدمی سمجھا جاتا تھا۔

مگر آج اسے ہاتھ رنگنے کا موقع مل گیا۔ اس نے کام کرتے کرتے کچھ نوٹ اڑا لیے اور فوراً مینیجر سے چھٹی لے کر بینک کے باہر نکل آیا۔ اسے اتفاق کہیے کہ ہم دونوں ایک خاص کام سے بینک میں موجود تھے۔ ایک کلرک نے ان صاحب کو یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ خبر اسی وقت مینیجر کو پہنچائی گئی اور مینیجر نے ہمیں خبر دار کر دیا۔ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا۔ آپ سمجھتے جا رہے ہیں نا ؟

سرفراز : (مردہ آواز میں) کہیے۔

دوسرا آدمی : تو جناب ہم نے اس کا تعاقب شروع کر دیا اور دور جا کر پکڑ لیا۔ اس نے بک دیا کہ بینک سے ایک ہزار کے نوٹ اڑائے تو تھے مگر ہمیں دیکھ کر راہ میں کسی گھر میں پھینک دیے۔ شک آپ کے مکان پر تھا ۔ ۔ ۔ اور معاف کیجیے گا۔ ہم نے آپ کو بہت پریشان کر دیا ہے، کیا کیا جائے۔ فرض بہر صورت ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔

سرفراز : جی۔

دوسرا آدمی : وہ لفافہ عنایت فرما دیں، بینک کی رقم بینک ہی میں جانی چاہیے۔

پہلا آدمی : ہو سکتا ہے۔ آپ کے واقعی عقیدت مند موجود ہوں اور انھیں ابھی تک عقیدت کے اظہار کا موقع نہ ملا ہو۔

دوسرا آدمی : وہ لفافہ دے دیجیے۔ صرف ایک مرتبہ آپ کو اور تکلیف کرنی ہوگی عدالت میں۔

سرفراز : مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

پہلا آدمی : دیکھیے نا سرفراز صاحب بحیثیت ایک ذمہ دار شہری کے آپ پر کچھ فرض بھی عائد ہوتے ہیں، مگر یہ یقین رکھیے آپ کو زیادہ سے زیادہ سہولت دی جائے گی۔

دوسرا آدمی : اچھا۔

(سرفراز اٹھتا ہے .... کوٹھڑی کے اندر جاتا ہے۔ اس اثناء میں وہ دونوں آدمی ایک دوسرے کو مسکرا مسکرا کر دیکھتے رہتے ہیں۔ سرفراز واپس آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں لفافہ ہے جسے وہ پہلے آدمی کے حوالے کر دیتا ہے۔ پہلا آدمی نوٹ گنتا ہے اور لفافہ جیب میں ڈال لیتا ہے)۔

پہلا آدمی : معاف کیجیے گا آپ کو بہت تکلیف دی۔ اچھا خدا حافظ۔

دوسرا آدمی : آپ کا حسنِ سلوک ہمیشہ یاد رہے گا۔ (تینوں آدمی دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔ عصمت باہر آتی ہے۔)

عصمت : (لہجہ میں سخت غصّہ) میں کہتی ہوں تم سا بے وقوف آج تک دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ لفافہ کا قصہ بتانے کی ضرورت کیا تھی؟

سرفراز : وہ خفیہ پولیس کے آدمی تھے بیگم۔

عصمت : مگر ان کے پاس اس کا کیا ثبوت تھا کہ لفافہ یہیں پھینکا گیا تھا۔ تم نے خود انھیں اطلاع دی، شیخی میں آ کر۔

سرفراز : لیکن بیگم ۔ ۔ ۔

عصمت : (بات کاٹتے ہوئے) لیکن ویکن کیا؟ تم نے خود انھیں بتایا کہ میرے ایک عقیدت مند نے یہ لفافہ پھینکا تھا۔

سرفراز : وہ مجھے گرفتار کر سکتے تھے بیگم ۔

عصمت : بڑے آئے مصور ۔ ۔ ۔ کس شان سے فرمانے لگے کہ ایک عقیدت مند نے عقیدت مندی کا ثبوت دیا ہے ۔ توبہ اللہ ! تو مجھے موت دیدے ۔ چھوٹ جاؤں اس عذاب سے ۔ کباب ہوگئی ہوں اس شخص کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر ۔ کیا مجال جو کبھی کوئی عقل مندی کا کام بھی کر جائے ۔

(رونے لگتی ہے) ۔

یہ گھر یوں ہی جہنم بنا رہے گا ، میں اسی طرح تڑپتی رہوں گی ۔

سرفراز : بات بھی سنو بیگم ! معاملہ بڑا سنگین تھا ۔

عصمت : اور یہ معاملہ سنگین نہیں کہ گھر میں ایک دمڑی بھی نہیں ۔ سر پھٹا جا رہا ہے ۔ معدہ سخت خراب ہے (کھانستی ہے) ہائے اللہ ! اٹھا لے اب مجھے تو تیرا بڑا کرم ہوگا ۔

(باہر دروازے پر دستک)

سرفراز : سنو باہر کوئی ہے ۔ شاید پبلشر ہے ۔

(ٹائیٹل اُٹھا کر باہر نکل جاتا ہے) ۔

عصمت : موت آئی ہے اب ۔

(سرفراز باہر چلا جاتا ہے ، عصمت بستر پر گر کرسِسکیاں بھرنے لگتی ہے ، سرفراز لوٹ کر آتا ہے ۔ ہاتھ میں نوٹ ہے) ۔

سرفراز : بیگم موت تو نہیں آئی ، پبلشر آیا ہے ۔ پچاس روپے دیے ہیں اس نے ۔ ۔ ۔ ٹائیٹل بہت پسند کیا ہے ۔ چند چیزیں تو آ ہی جائیں گی ، اس رقم سے ۔ اُٹھو میری رانی

(سرفراز اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے ۔ عصمت برابر سسکیاں بھرتی رہتی ہے ۔)

(پردہ)

حصۂ نظم

میر تقی میر

(۱۷۲۳ء - ۱۸۱۰ء)

میر تقی میر ۱۷۲۳ء میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ عنفوانِ شباب میں دہلی آئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ آرزو کے شاگرد ہوئے اور فنِ شعر میں انھی سے اصلاح لیتے رہے۔ دہلی کے اُجڑنے کے بعد آصف الدولہ کے عہد میں ۱۷۸۲ء مطابق ۱۱۹۷ھ میں لکھنئو چلے گئے۔ آصف الدولہ نے قدردانی کی اور ایک معقول وظیفہ مقرر کیا۔ میر نے لکھنئو میں ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔

میر کی غزلیات کے چھ دیوان ہیں۔ یہ غزلیں زیادہ تر مروّجہ بحروں میں ہیں۔ مجموعی حیثیت سے ان کی تمام غزلیں سوز و گداز سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ میر کا اپنا رنگ ہے۔ غم و الم کی واردات و کیفیات کے بیان میں جیسا سحر اور اعجاز میر کے یہاں ملتا ہے، اردو کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں پایا جاتا۔ میر کی زندگی خود سراپا گداز اور درد و الم سے بھرپور تھی۔ بچپن سے مصیبتوں کا شکار رہے، ساری عمر پریشاں حالی میں گزری، اس کا اثر ان کی شاعری پر پڑا اور ان کا پورے کا پورا کلام درد و غم کا مجسمہ بن کر رہ گیا۔ چنانچہ ان کے کلام کو آہ اور نشتر سے تعبیر کرتے ہیں۔ میر صاحب نے خود اپنے کلام کے متعلق فرمایا:

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میر کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کی طبیعت غزل کے لیے زیادہ مناسب تھی - زبان کی فصاحت اور سادگی سوز و گداز ، مضامین کی جدت اور تاثیر جو غزل کی جان ہے ، میر صاحب کے کلام کی ایسی خوبیاں ہیں جو اردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں ، پھر کلام میں محاکات اور تخیّل کا زور بھی ہے -

میر نے جذبات عشق و محبت اور واردات قلب کی ایسی صحیح اور سچی عکاسی کی ہے کہ اضطراب اور قلق کی جو انتہائی صورت اور کیفیّت ذہن میں آ سکتی ہے ، اس کی سچی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے - انسانی جذبات اور خصوصاً درد و غم کا بیان جیسا میر نے کیا ہے اردو کے کسی دوسرے شاعر سے نہ ہو سکا -

میر کا کلام عاشقانہ ہے لیکن ان میں سے اکثر اشعار ایسے بھی ملیں گے جن میں کوئی اخلاق یا حکیمانہ نکتہ خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے - میر کے اشعار عاشقانہ ہوں یا حکیمانہ ، ان میں اندوہ و الم ، ناکامی و مایوسی کی جھلک پائی جاتی ہے - ان کے ظریفانہ اشعار میں بھی وہی حسرت و یاس پائی جاتی ہے جو ان کے دم کے ساتھ تھی - غرضیکہ ان کا پورے کا پورا کلام حسرت و ناکامی ، حرمان و مایوسی کا مرقع ہے -

غزل گوئی میں میر کا اپنا ایک منفرد مقام ہے - وہ استاد زمانہ ہیں - بڑے بڑے شعراء ان کی استادی کے معترف رہے ہیں اور آج تک ان کے کمال کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے -

———

(۱)

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لوہو[۱] آتا ہے ، جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونسِ ہجراں
سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

(۲)

سرسری تم جہان سے گزرے ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
دل کی کچھ قدر کرتے رہیو[۲] تم یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

---

۱ - لوہو یعنی خون - لوہو کا یہ تلفظ یعنی "ل" کے ساتھ "و" کا استعمال اور "ہ" کو کھینچ کر کہنا اب متروک ہے - اب واؤ حذف کر کے معمولی پیش کے ساتھ "لہو" بولتے ہیں -

۲ - رہیو پرانی زبان ہے اب اس کی جگہ رہو یا رہنا بولتے ہیں -

(۳)

تجاہل[1] تغافل[2] تساہل[3] کیا — ہوا کام مشکل توکل کیا
نہیں تاب لاتا دلِ زار اب — بہت ہم نے صبر و تحمل کیا
حقیقت نہ میر اپنی سمجھی گئی — شب و روز ہم نے تأمل[4] کیا

(۴)

آہِ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا
اس باد نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا

اس موج خیز دہر میں ہم کو قضا نے آہ
پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا

سب شورِ ما و من کو لیے سر میں مر گئے
یاروں کو اس فسانے نے آخر سلا دیا

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

کیا کچھ نہ تھا ازل میں نہ طالع جو تھے درست
ہم کو دلِ شکستہ قضا نے دلا دیا

تکلیف دردِ دل کی عبث ہمنشیں نے کی
دردِ سخن نے میرے سبھوں کو رلا دیا

ان نے تو تیغ کھینچی تھی پر جی چلا کے میر
ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا

---

۱ - تجاہل : انجان بننا ۔
۲ - تغافل : غفلت لاپرواہی
۳ - تساہل : سہل جاننا ۔ کاہل
۴ - تأمل : غور و فکر

(۵)

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری[۱] کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری[۲] کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

---

۱ - آشفتہ سری : جنوں
۲ - سفری : مسافر

خواجہ میر درد

(۱۷۱۹ء - ۱۷۸۵ء)

خواجہ میر درد دہلی میں پیدا ہوئے اور ساری عمر دلی میں رہے - والد کا نام خواجہ ناصر عندلیب تھا جو اپنے زہد و تقویٰ اور پیری مریدی کے باعث بہت مشہور تھے - خواجہ صاحب کے بزرگ بخارا سے ہندوستان آئے اور یہیں سکونت اختیار کی - خواجہ صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے صوفی منش والد سے حاصل کی - انتیس سال کی عمر میں والد کی جگہ خود سجادہ نشین ہوئے اور ذاتی تقدس کے سبب بہت مشہور ہوئے - احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی لوٹ مار نے سب شعراء کو دہلی سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا لیکن خواجہ صاحب اللہ پر توکّل کیے بزرگوں کے سجّادے پر بیٹھے رہے اور ۶۶ برس کی عمر پا کر انتقال کیا -

خواجہ صاحب اردو کے ایک بہت بڑے صوفی شاعر گزرے ہیں - ان کا درجہ اردو شاعری میں بہت بلند ہے - میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا کے معاصر تھے - زبان کی سادگی میں میر صاحب کے حریف ہیں - دیوان نہایت مختصر ہے لیکن جو کچھ کہا ہے ، تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے - اس میں اخلاق ، تصوّف ، کیفیاتِ قلبی ، وارداتِ حسن و عشق ، سبھی کچھ موجود ہے -

درد کی شاعری اور ان کی زندگی میں بڑی مطابقت ہے ، وہ خود بھی اِستِغنا کی مکمل تصویر تھے - زندگی کا یہ رخ ان کے کلام کے آئینے میں جھلکتا ہے - کلام میں تصوّف اور درد کی چاشنی ہے - خواجہ صاحب نے غزلیں عموماً چھوٹی بحروں میں لکھی ہیں -

غزلوں کے علاوہ میر درد کی رباعیاں بھی اردو شاعری میں خاص مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان میں انھوں نے صوفیانہ، عاشقانہ اور اخلاق مضامین نہایت مؤثر انداز میں بیان کیے ہیں۔

---

(۱)

مجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ
کہ جس کو کسو نے کبھو، وا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں!
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں
کبھی تو نے آکر تماشا نہ دیکھا

تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے
ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

شب و روز اے درد درپے ہوں اس کے
کسوا نے جسے یاں نہ سمجھا، نہ دیکھا

(۲)

دنیا میں کون کون نہ یک بار ہو گیا
پر منہ پھر اس طرف نہ کیا اس نے جو گیا

پھرتی ہے میری خاک صبا در بدر لیے
اے چشمِ اشکبار! یہ کیا تجھ کو ہو گیا

۱۔ کسو بمعنی کسی۔ "کسو" پرانی زبان ہے۔

طوفانِ نوح[۱] نے تو ڈبوئی زمیں فقط
میں ننگِ خلق ساری خدائی ڈبو گیا

واعظ کسے ڈراوے ہے یوم الحساب سے
گریہ مرا تو نامۂ اعمال دھو گیا

پھولے گا اس زبان سے گلزارِ معرفت
یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا

آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاجِ دھر
میں گرچہ گرم و سرد زمانہ سمو گیا

اے درد جس کی آنکھ کھلی اس جہان میں
شبنم کی طرح جان کو وہ اپنی رو گیا

(۳)

ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تجھ پر
مگر یہ زندگیٔ مستعار رکھتے ہیں!

فلک سمجھ تو سہی ہم سے اور گلو گیری
یہ ایک جیب ہے سو تار تار رکھتے ہیں

بتوں کے جبر اٹھائے ہزارہا ہم نے
جو اس پہ بھی نہ ملیں اختیار رکھتے ہیں

---

۱ - طوفانِ نوحؑ : نوحؑ کا طوفان - حضرت نوح علیہ السلام ایک جلیل القدر پیغمبر تھے - ان کے زمانے میں ایسا طوفان اور سیلاب آیا کہ دنیا کا تہائی حصہ ڈوب گیا - صرف وہ لوگ اس سے محفوظ رہے جو ان کے کہے پر ایمان لے آئے اور حضرت نوحؑ کے ساتھ ان کی کشتی میں سوار ہو کر بچ نکلے - یہاں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے -

نہ برق ہیں نہ شرر ہم نہ شعلہ نَے سیماب
وہ کچھ ہیں پر ، کہ سدا اضطرار رکھتے ہیں

جنھوں کے دل میں جگہ کی ہے نقش عبرت نے
سدا نظر میں وہ لوحِ مزار رکھتے ہیں

وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا
اگرچہ درد ، اُسے ہم ہزار رکھتے ہیں

(۴)

کام مردوں کے جو ہیں سو وہی کر جاتے ہیں
جان سے اپنی جو کوئی کہ گزر جاتے ہیں

موت کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے
مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

دید وا دید جو ہو جائے غنیمت سمجھو
جوں شرر ورنہ ہم اے اہلِ نظر! جاتے ہیں

بے ہنر دشمنِ اہلِ ہنر سے آ کر
منہ پر چڑھتے تو ہیں پر دل سے اُتر جاتے ہیں

ہم کسی راہ سے واقف نہیں جوں نورِ بصر
رہنما تو ہی تو ہوتا ہے ، جدھر جاتے ہیں

اے رگِ ابر، یہ مژگاں بھی اگر ٹک برسیں
ایک پل میں کئی تالاب تو بھر جاتے ہیں

آہ معلوم نہیں ساتھ سے اپنے شب و روز
لوگ جاتے ہیں چلے سو یہ کدھر جاتے ہیں

تا قیامت نہیں مٹنے کا دلِ عالم سے
درد ، ہم اپنے عوض، چھوڑے اثر جاتے ہیں

(۵)

فرصتِ زندگی بہت کم ہے
مغتنم[۱] ہے یہ دید جو دم ہے

دل پُر چاک ہے گل خنداں
شادی و غم جہاں میں توام ہے

دین و دنیا میں تو ہی ظاہر ہے
دونوں عالم کا ایک عالم ہے

سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف
جس کے ہاتھ آوے جام، سو جم[۲] ہے

اپنے نزدیک باغ میں تجھ بِن
جو شجر ہے ، سو نخل ماتم ہے

نہ ملیں گے اگر کہے گا تو !!
تیری خاطر ہمیں مقدّم ہے

درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم
وہ ہی رونا ہے ، نت وہی غم ہے

---

۱ - مغتنم : غنیمت
۲ - ایرانی بادشاہ - جمشید مراد ہے -

غلام ہمدانی مصحفی

(۱۷۵۱—۱۸۲۴ء)

مصحفی تخلّص ، غلام ہمدانی نام - باپ کا نام ولی محمد تھا - یہ امروہے کے رہنے والے تھے - ۱۷۷۶ء میں عالمِ جوانی میں وطن چھوڑ کر دہلی پہنچے اور تحصیلِ علم اور مشقِ سخن میں مصروف ہوئے - بزرگان دہلی کی صحبتوں سے اکتساب کیا اور بہت جلد مشہور ہوئے - اس وقت دہلی پر تنزّل اور افلاس کا دَور دورہ تھا - اہل ہنر لکھنئو کی طرف کھنچ رہے تھے - چنانچہ یہ بھی لکھنئو پہنچ گئے - سعادت علی خان کا زمانہ تھا ، مگر ان تک رسائی نہ ہو سکی - مرزا سلیمان شکوہ کے پاس پہنچے اور انھیں کے دامان دولت سے وابستہ ہوئے - انھوں نے ان کا معمولی سا وظیفہ مقرر کر دیا - جس کے سہارے ان کی زندگی بڑی عسرت سے بسر ہوتی تھی مگر مفلِسی کے باوجود خوش خلقی ، خوش مزاجی اور طبیعت کی خداداد موزونیت نے انھیں ہر دل عزیز بنا دیا تھا - لکھنئو میں ان کی کافی قدر ہوئی - مصحفی اپنے مکان پر مشاعرے کرتے تو مشاہیر عصر ، میر حسن ، انشاء ، آتش ، ضمیر ، خلیق ، اسیر وغیرہ اور ان کے شاگرد ضرور شریک ہوتے - اس سے بڑھ کر ثبوت مصحفی کے کمال فن کا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جتنے اُستاد ان کے شاگردوں میں نکلے ، اتنے کسی اور کو نصیب نہیں ہوئے -

مصحفی کی شہرت زیادہ تر ان کے ضخیم اُردو دواوین اور تذکروں پر مبنی ہے - اُردو کے آٹھ دیوان ان کی یادگار ہیں ،

جن میں ہزاروں غزلیں ، قطعے ، قصائد وغیرہ موجود ہیں۔ شعرائے اُردو کا تذکرہ ہندی گویاں جو فارسی زبان میں ہے ، اس میں تقریباً ساڑھے تین سو شعراء کا ذکر ہے۔ دو اور تذکرے ریاض الفصحاء اور عِقدِ ثریا ہیں۔ مصحفی نے مثنویاں بھی لکھیں ، جن میں "بحر المحبت" بہت مشہور ہوئی۔ غرضیکہ مصحفی نے جملہ اصناف سخن کو ترقی دی لیکن ان کو شہرت صرف غزل گو شاعر کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔

مصحفی کے کلام میں میر کا سوز و گداز ، سودا کی بلند پروازی ، میر سوز کی سادگی ، جرأت کی شوخی اور کہیں کہیں انشاء کا رنگ بھی ملتا ہے۔ غرضیکہ مصحفی نے ہر رنگ میں غزلیں کہی ہیں۔ ان میں سے بعض تو صفائی اور برجستگی میں لاجواب ہیں ، جو غزلیں سنگلاخ زمینوں میں کہی ہیں ان کے مطالعے سے ان کی قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔

مصحفی نے بڑی عمر پائی۔ جب تک زندہ رہے ، لکھنؤ میں رہے اور وہیں فوت ہوئے۔

---

(۱)

یہ قصہ تمام ہو چکا اب — بس اپنا تو کام ہو چکا اب

جب ناظم ملک سو رہے ہائے — دنیا کا نظام ہو چکا اب

قاصد اگر اس گلی میں جائے — کہیو کہ غلام ہو چکا اب

دنیا ہے سرائے فانی اس سے — چلیے کہ مقام ہو چکا اب

(۲)

نہ گیا کوئی عدم کو دلِ شاداں لے کر
یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت و ارماں لے کر

باغ وہ دشتِ جنوں تھا کہ کبھی جس میں سے
لالہ و گل گئے ثابت نہ گریباں لے کر

پردۂ خاک میں سو سو رہے جا کر افسوس
پردہ رخسار پہ کیا کیا مہ تاباں لے کر

ابر کی طرح سے کر دیویں گے عالم کو نہال
ہم جدھر جاویں گے یہ دیدۂ گریاں لے کر

پھر گئی سوئے اسیران قفس باد صبا
خبرِ آمدِ ایامِ بہاراں لے کر

مصحفی گوشۂ عزلت کو سمجھ تختِ شہی
کیا کرے گا تو عبث تخت سلیماں[1] لے کر

---

۱ - حضرت سلیمان علیہ السلام ایک عظیم الشان پیغمبر کی حیثیت میں بڑے جاہ و جلال کے حامل تھے اور اللہ نے انھیں زمین ، ہوا اور جنات پر قدرت بخشی تھی -

خواجہ حیدر علی آتش

(۱۷۶۴ - ۱۸۴۶ء)

خواجہ آتش کے بزرگوں کا اصل وطن بغداد تھا۔ اجداد ترک وطن کر کے شاہجہان آباد (دلی) چلے آئے۔ ان کے والد دلی سے فیض آباد آئے۔ آتش وہیں پیدا ہوئے۔ نام خواجہ حیدر علی تھا اور آتش تخلُص۔ والد کا نام خواجہ علی بخش تھا۔ ان کا خاندان خواجہ زادوں کا خاندان تھا۔ جس میں مسند فقیری بھی قائم تھی اور پیری مریدی کا سلسلہ بھی تھا۔ خود درویشانہ مزاج رکھتے تھے اس لیے ساری عمر سادگی اور فقیری میں گزار دی۔ طبیعت میں قناعت و اِستغنا تھا۔ امیروں اور دولت مندوں کے ہاں نہ خود جاتے تھے اور نہ ان کو پاس آنے دیتے تھے۔

آتش جوانی میں لکھنئو آئے۔ یہاں اس وقت انشاء اور مصحفی کی شاعری کا بازار گرم تھا۔ آتش بھی مصحفی کے شاگرد ہوگئے اور لکھنئو میں سکونت اختیار کی۔ چند ہی روز میں اپنی محنت سے کمال حاصل کیا اور اُستاد کہلائے۔ آتش کی آتش بیانی نے اُستاد کا نام روشن کیا۔ سیکڑوں شاگردوں نے ان کے دامن تربیت میں پرورش پاکر درجۂ اُستادی حاصل کیا۔ آتش کا انتقال ۱۸۴۶ء میں ہوا۔

تمام عمر کی کمائی جس کو حیات جاوداں کا مول کہنا چاہیے، تین دیوان ہیں، جن میں دو زیادہ مشہور ہیں۔ انھوں نے شعر اس طرح کہے ہیں، جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام نے پسند خاص اور قبولِ عام کی سند حاصل کی ۔ آتش ، امام بخش ناسخ کے ہم عصر تھے ۔ ناسخ بھی لکھنئو کے ممتاز شاعر ہیں ۔ شاعری میں دہلی سکول کے مقابلے میں لکھنئو سکول قائم کرنے والے یہی آتش اور ناسخ ہیں ۔

دلی کے مکتب شاعری کی خوبی ، جذبات کی سادگی ، اصلیّت ، بیان کی صفائی اور دلکشی ہے ۔ اس کے برعکس آتش ، ناسخ اور ان کے متّبعین نے اپنی تمام تر توجّہ شعر کے ظاہری حسن ، رعایت لفظی اور صنائع بدائع میں صرف کردی ۔ آتش اور ناسخ نے زبان ، الفاظ اور محاورات کے اصول بنائے ، پرانے الفاظ اور محاورات ترک کرکے نئے الفاظ اور محاورات استعمال کیے ۔ بیان اور بندش میں خوبصورتی پیدا کرنے کی خاطر استعارے سے مضامین کو وسعت دی ۔ یہاں تک کہ بے لطف مبالغہ ، خیال آرائی اور پیچیدہ مضامین اشعار میں دخل پانے لگے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنئو سکول کے طرز میں دہلوی سکول کے طرز کی سی دلکشی اور لطف و اثر باقی نہ رہا ۔ تاہم یہ عیب آتش میں ناسخ سے کم ہے ۔ آتش کے کلام پر ان کی سادہ زندگی اور درویشانہ مزاج کا بہت اثر تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں صداقت اور واقعیت نمایاں ہے ۔ لطفِ محاورہ ناسخ کے مقابلے میں زیادہ ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ آتش کے یہاں عام لکھنوی رنگ کے اشعار بھی کافی ہیں ۔

———

(۱)

مری آنکھوں کے آگے آئے گا کیا جوش میں دریا
ہمیشہ صورت ساحل ہے یاں آغوش میں دریا

خموشی اور گویائی مری اک اک سے بہتر ہے
سکونت میں یہ قطرہ ہے گہر ، تو جوش میں دریا

کیا جو ضبط گریہ تو کیا دریا کو کوزے میں
کبھی دل کھول کر رویا تو آیا جوش میں دریا

اگر موتی نہ بنتے قطرہ ہائے ابر نیساں سے
تو حلقہ ڈالتا آتش ، صدف کے گوش میں دریا

(۲)

نہ کسی کو کڑی کہی ہم نے
نہ کسی کی کڑی اٹھائی[۱] بات

درد دل کہنے میں، ہے کیا پس و پیش
کہی جاتی ہے منہ تک آئی بات

تازگی فکر کی کبھی نہ گئی
جب سنائی ، نئی سنائی بات

کہہ گئے تم کنائے میں کیا کیا
نہ کسی نے تمھاری پائی بات

---

۱ - کڑی اٹھانا : سختی جھیلنا ، سخت بات سہنا ، کڑی جھیلنا بھی محاورہ ہے -

تم جو گویا ہوئے تو پھول جھڑے
غنچہ سے منہ میں رنگ لائی بات

یہ صدا آتی ہے خموشی سے
منہ سے نکلی ہوئی پرائی بات

تیرے شیریں کلام کو سن کر
پھر نہ آتش کسی کی بھائی بات

(۳)

ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی، بہار راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر ، نہ کوئی دیار راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایت پروردگار راہ میں ہے

سفر ہے شرط ، مسافر نواز بُہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے، دشمن ہزار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل، نہ ٹھہر آتش
گُلِ مراد ہے منزل میں ، خار راہ میں ہے

(۴)

خوشا، وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا، دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

یقیں ہے اٹکے گی جان اپنی آکے گردن میں
سنا ہے، جا ہے قریب رگ گلو تیری

یہ گردش فلک پیر سے ہوا ثابت
قوی ضعیف کو کرتی ہے جستجو تیری

جو ابر گریہ کُناں ہے، تو برق خندہ زَناں
کسی میں خو ہے ہماری، کسی میں خو تیری

زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زباں
رہے گی معرکے میں آتش آبرو تیری

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

(۱۷۹۷—۱۸۶۹ء)

مرزا اسد اللہ خاں نام ، غالب تخلّص تھا - ۱۷۹۷ء میں آگرے میں پیدا ہوئے - ان کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں ترکستان سے ہندوستان آئے اور انھیں کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوگئے - والد کے انتقال کے بعد چچا کی نگرانی میں پرورش پائی - تیرہ چودہ برس کی عمر میں دہلی آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے - کچھ خاندانی جائداد تھی ، جس سے بسر اوقات بدقّت ہوتی تھی - غالب اپنے ہم عصر شاعر ذوق کے انتقال کے بعد ہندوستان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے اُستاد مقرر ہوئے - ۱۸۵۷ء میں بساطِ شاہی درہم برہم ہو گئی اور ۱۸۶۹ء میں مرزا کا انتقال ہوا -

غالب کو ہمارے مبصّرین نے اردو شاعری کا مسلم الثبوت اُستاد مانا ہے - میر کی طرح وہ عام طور پر اردو ادب کے ایک بہت بڑے غزل گو سمجھے جاتے ہیں - ان کا طرزِ بیان نرالا ہے ، ان کا تخیّل انوکھا اور اچھوتا ہے - جذبات کے اظہار میں انھیں غیر معمولی قدرت حاصل ہے - ادب اور خاص طور سے غزل میں مرزا غالب نے اپنی جدتِ طبع سے نئی راہیں پیدا کی ہیں - قدماء کے انداز سے ہٹ کر ایک مختلف انداز ایجاد کیا ہے - غزل میں گہرائی اور وسعت پیدا کی ہے - اس قادر الکلام شاعر نے شعر و سخن کے گل بوٹے کھلائے ہیں - کہیں فارسی

کے نادر استعاروں اور اضافتوں کو اُردو میں ملا کر انوکھی ترکیبوں اور بندشوں سے کلام کو مرصّع کیا ہے، کہیں بلند پروازی اور معنی آفرینی سے مضامین کو آسمان پر پہنچا دیا ہے، کہیں وسیع خیالات اور مطالب کے دامن کو مختصر الفاظ میں لپیٹا ہے۔ کہیں سیدھی سادی زبان میں جذبات کا تلاطُم اور درد کی داستان ہے، مگر ہر جگہ تناسب الفاظ اور برجستگی کا خیال رکھا ہے۔ انداز استِدلال فلسفیانہ ہے۔ تخیّل میں جدت اور فکر میں ندرت ہے۔ واقعی مرزا نے سچ کہا ہے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

---

(۱)

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

دلِ ہر قطرہ ہے ساز انا البحر[۱]
ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا

سن اے غارت گرِ جنسِ وفا، سن
شکست قیمت دل کی صدا کیا

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

---

۱ - انا البحر: میں دریا ہوں (قطرے کے ساز دار سے انا البحر کا نغمہ نکل رہا ہے)۔

(۲)

عشق مجھ کو نہیں ، وحشت ہی سہی
میری وحشت ، تری شہرت ہی سہی

قطع کیجیے نہ تعلّق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی[1] ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں ، غفلت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۳)[2]

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

---

۱ - غزل نمبر -
۲ - یہ غزل مسلسل ابو ظفر بہادر شاہ ، بادشاہ دہلی کے غسلِ صحت کی مبارکباد میں لکھی گئی تھی -

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
رُوکش سطح چرخ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کو دیکھنے کے لیے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہ دیندار نے شفا پائی

(۴)

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے[۱]
گر باغ گدائے مے نہیں ہے[۲]

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

شادی سے گزر، کہ غم نہ ہووے
اردی[۳] جو نہ ہو، تو دے[۴] نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے؟ اے نہیں ہے

---

۱ - تونبے : کدو - مراد فقیروں کا کاسہ -
۲ - گر باغ گدائے مے نہیں ہے : مطلب یہ کہ باغ ضرور شراب کی بھیک مانگتا ہے ، ورنہ باغباں تونبے نہ بوتے -
۳ - اردی : بہار کا موسم - یہ فارسی مہینے کا نام ہے -
۴ - فارسی میں خزاں کا مہینہ -

مومن خان مومن دہلوی

(۱۸۰۰ء - ۱۸۵۱ء)

مومن خان مومن کوچہ چیلاں دہلی کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام غلام نبی تھا۔ مومن کے دادا نامدار خان اکیاون برس کی عمر میں کشمیر سے دہلی آئے اور شاہ عالم کے عہد میں شاہی اطباء کے حلقے میں داخل ہو کر کوچہ چیلاں میں سکونت اختیار کی۔ مومن یہیں ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالقادر سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ نجوم اور رمل سے بھی شوق تھا۔ شطرنج سے بھی ان کی طبیعت کو مناسبت تھی اور شعر و شاعری سے تو مومن کو خاص لگاؤ تھا لیکن انھوں نے شاعری کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا اور نہ کبھی کسی امیر کی مدح میں قصیدہ کہا۔ شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ اکیاون برس کی عمر میں کوٹھے پر سے گرے اور صرف پانچ ماہ بیمار رہ کر ۱۸۵۱ء میں انتقال کیا۔

حکیم مومن خان کی کلیات میں غزلوں کے علاوہ چند مثنویاں واسوخت ترکیب بند اور ترجیع بند ہیں۔ ان کی مثنویاں تیر و نشتر جو جذبات سے بھری ہوئی ہیں اور مضطرب دلوں کی صدائے باز گشت معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

غزل مومن کا سرمایۂ کمال ہے۔ اسی کی بدولت وہ آج صاحب طرز اور مجتہدِ فن مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے

شاعری میں کسی کی تقلید نہیں کی ، بلکہ عام روش سے ہٹ کر اپنا راستہ بنایا ہے - انداز بیان میں عجیب ندرت اور نازک خیالی سے کام لیا ہے اور ادائے مفہوم کے لیے اسلوب اختراع کیے ہیں ، اسی وجہ سے مومن اسلوب اور بیان کے بادشاہ کہلائے -

کلام میں غالب کی سی مشکل پسندی کے ساتھ ساتھ لطافت اور نزاکت خیال موجود ہے - تشبیہات اور استعارات کا استعمال بھی برجستہ ہے - واقعات حسن و عشق کو اس طرح منظوم کیا ہے کہ پڑھنے والے کو گویا اپنے ہی دل کی آواز معلوم ہوتی ہے - اسلوب بیان نے ان خوبیوں کو اور نکھارا ہے - مومن خیالات نازک اور مضامین اعلیٰ باندھتے ہیں تشبیہ ، استعارہ اور الفاظ کی تکرار سے کلام میں جان پیدا کرتے ہیں - سیدھی سادی بات کو بھی الفاظ کے اُلٹ پھیر سے مؤثر بنا دیتے ہیں -

فارسی اضافتیں بھی مومن نے اُردو میں استعمال کی ہیں - ان کے اشعار میں تھوڑی سی پیچیدگی بھی پائی جاتی ہے مگر ان میں فلسفے اور حکمت کی ثقالت نہیں ہے - شاعری میں بہت سی خوبیوں کے باعث مومن اردو کے بڑے ہر دل عزیز شعراء میں سے ہیں - انھوں نے مقطعوں میں اپنے تخلص کی مناسبت اور رعایت سے بڑے دلچسپ مضمون پیدا کیے ہیں -

---

(۱)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار، جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

ہم سے نہ بولو تم، اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاہد شکایتوں پہ تری، مدعی سے ہم

کیا گُل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

نوٹ: مولانا فضل حق خیر آبادی، جن سے مومن کو بڑی والہانہ عقیدت اور محبت تھی، ان سے ایک مرتبہ ناچاقی ہو گئی اور دوستی بھی منقطع ہو گئی، بعد میں جب صلح صفائی ہو گئی تو مومن نے یہ مسلسل غزل لکھ کر پیش کی۔

(۲)

اگر غفلت سے باز آیا، جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

موئے آغاز اُلفت میں ہم افسوس
اُسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی

چمن میں کوئی اُس کوُ سے نہ آیا
گئی برباد سب محنت صبا کی

تمھیں شورِ فغاں سے میرے کیا کام
خبر لو اپنی چشمِ سرمہ سا کی

دیا علم و ہنر حسرت کشی کو
فلک نے مجھ سے یہ کیسی دغا کی

غمِ مقصد رسی تا نزع اور ہم
اب آئی موت، بختِ نارسا کی

مجھے اے دل! تری جلدی نے مارا
نہیں تقصیر اس دیر آشنا کی

جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا
کہ تو نے کس توقّع پر وفا کی

کہا اُس بت سے جب، مرتا ہے مومن
کہا، میں کیا کروں، مرضی خدا کی

(۳)

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم
کہیں پامال سر نہ ہو جائے

میرے تغیّرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

میرے آنسو نہ پونچھنا ، دیکھو
کہیں دامان ، تر نہ ہو جائے

بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں
کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

رشکِ دشمن کا فائدہ معلوم
مفت جی کا ضرر نہ ہو جائے

اے دل آہستہ آہِ تاب شکن
دیکھ ٹکڑے جگر نہ ہو جائے

مومن ایماں قبول دل سے مجھے
وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

——

بہادر شاہ ظفر

(۱۷۷۵ء - ۱۸۶۲ء)

سراج الدین نام ، ظفر تخلّص ، تیموری سلاطین ہند میں آخری بادشاہ تھے - ظفر نے اردو زبان کے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ اپنے جملہ عیب و ہنر کے ساتھ ساتھ شاعری کی تاریخ میں ایک نہایت اہم اور دلچسپ دور تھا - قلعۂ معلّٰی میں دن رات شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتیں ، ان محفلوں میں نصیر ، ذوق ، ممنون ، مومن ، غالب ، تسکین ، شیفتہ جیسے شاعر شریک ہوتے تھے ، جن کی شاعری نے زمینِ سخن کو آسمان تک پہنچا دیا تھا - نو عمری ہی سے ظفر کے لیے یہ محفلیں دلچسپیوں کا باعث بنی رہیں۔ ظفر نے ان میں خوب خوب حصہ لیا - فطری لگاؤ کے باعث یہ مشغلہ آخری دم تک قائم رہا -

ظفر شاعری میں پہلے تو شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے ، پھر بیقرار ، پھر ذوق اور اس کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے اور ۱۸۵۷ء تک غالب ہی سے اصلاح لیتے رہے ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا اور اس کے ساتھ وہ بزمِ سخن درہم برہم ہو گئی - بہادر شاہ ظفر زندگی کے آخری ایام قید میں گزارنے کے لیے رنگون بھیج دیے گئے اور وہیں بحالت اسیری ۱۸۶۲ء میں ان کا انتقال ہوا -

ظفر اپنے عہد کے سب سے زیادہ پُرگو شعراء میں سے تھے۔ ان کا دیوان چار جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ جن میں ہزارہا اشعار حمد، نعت، سلام، مسدّس، مخمّس، مستزاد، قطعات، رباعیات، پنکھے اور سہرے کے موجود ہیں۔ غزلوں کے اشعار تقریباً دس ہزار ہیں ان کے علاوہ پنجابی زبان کے شعر بھی ملتے ہیں، جن سے ظفر کی طباعی اور مختلف زبانوں پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ظفر کے کلام کا کچھ حصہ انقلاب کی نذر ہو گیا۔

ظفر نصیر سے لے کر غالب تک بڑے بڑے اساتذہ کے شاگرد رہے مگر ان کی ذہین اور مجتہدانہ طبیعت نے کسی کی بھی تقلید نہیں کی۔ ظفر کے کلام میں نہ تو نصیر کی سی مضمون آفرینی اور شکوہ الفاظ ہے، نہ ذوق کی سی محاورہ بندی کی کثرت ہے اور نہ غالب کا سا فلسفہ اور تصوّف ملتا ہے۔ ان میں سے کسی کے رنگ کی اثر پذیری ظفر کے کلام میں نہیں بلکہ ظفر کا اپنا ایک رنگ ہے، جو سب سے جدا ہے۔

ظفر کی غزلوں میں رنگینیوں اور سرمستیوں کی جھلکیاں ہیں۔ایسے اشعار میں جرأت کی شوخی اور معاملہ بندی پائی جاتی ہے۔ بعض اشعار تصوّف میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں دنیا کی بے ثباتی، عبرت انگیزی اور پند و نصائح کے مضامین ملتے ہیں۔ بعض اشعار خالص وارداتی ہیں اور ان کی زبان سادہ اور آسان ہے۔ کلام میں فارسی کی غیر مانوس ترکیبیں اور الفاظ موجود نہیں، یہی وجہ ہے کہ کلام میں اُلجھاؤ کے بجائے سلاست اور روانی ہے۔

زندگی کے حادثات اور واردات کی جھلکیاں جن اشعار میں ملتی ہیں ، وہ بڑے پُر درد ہیں ۔ بعض غزلیں تو پوری کی پوری المناک قلبی واردات سے بھری ہوئی ہیں ۔ اسلاف کی مٹی ہوئی شوکت و حشمت اور اپنی قید و بند کی مصیبتوں اور صعوبتوں نے ظفر کے ذہن میں ایک حشر برپا کیا تو ظفر نے شاعری میں خون جگر خوب خوب بہایا ۔ کہتے ہیں :

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

ظفر کے نالہ و شیون میں بڑی گہرائی اور گیرائی ہے ۔ شاعری کے ہر پہلو میں سوز اور گداز ہے ۔ ظفر کی زندگی اور اس کا المناک خاتمہ کچھ ایسا تھا کہ دنیا کی بے ثباتی اور احساس غم کی مکمل اور پر درد تصویر کچھ وہی کھینچ سکتا تھا اور اس نے کھینچی بھی خوب ہے ۔

مختصر طور پر ظفر کی شاعری میں غالب اور مومن کی معجزبیانی نہ سہی ، قادرالکلامی ضرور ہے ۔ ظفر نے زندگی کے سوز و گداز اور حزن و ملال کا صحیح مرقع کھینچا ہے ۔ اخلاق مسائل اور صوفیانہ نکات کو عام فہم بنایا ۔ سادگی اور سلاست بیان کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ۔ قلعہ معلّٰی کی زبان اور محاورات کو اپنی شاعری میں محفوظ کیا اور اپنے زور طبع سے پرانے اساتذہ فن کی یاد تازہ کی ۔ انھی وجوہ کی بنا پر ظفر ایک قادرالکلام شاعر اور استاد کہلائے ۔

———

(۱)

مقدور کس کو حمد خدائے جلیل کا
اس جا پہ بے زباں ہے دہن قال و قیل کا

پانی میں اس نے راہبری[۱] کی کلیم[۲] کی!
آتش میں وہ ہُوا چمن آرا خلیل[۳] کا

اس کی مدد سے فوج ابابیل نے کیا
لشکر تباہ کعبہ پہ اصحاب فیل[۴] کا

کیا پائے کُنہ ذات کو اس کے کوئی ظفر
واں عقل کا نہ دخل نہ ہرگز دلیل کا

۱- پانی سے مراد دریائے نیل ہے، جس کے کنارے مصر آباد ہے۔ راہبری کرنا سے مراد حضرت موسیٰؑ کو دریائے نیل میں ڈوبنے سے بچا لینا ہے۔ یہاں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے وہ یوں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں مصر میں فرعون نافرمان حکومت کرتا تھا۔ جب اس نے خدائی کا دعوٰی کیا اور حضرت موسیٰؑ کے کہنے پر اس سے باز نہ آیا بلکہ لڑائی پر آمادہ ہوا اور حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کا پیچھا کیا، اس وقت حضرت موسیٰؑ نے اپنا عصائے معجز نما دریائے نیل میں ڈال دیا۔ دریا کا پانی دو طرف ہٹ گیا اور حضرت موسیٰؑ مع ساتھیوں کے پار ہو گئے، لیکن جب فرعون داخل ہوا تو ہٹا ہوا پانی اپنی جگہ پر آ گیا اور فرعون مع لشکر کے ڈوب گیا۔

۲- کلیم۔ حضرت موسیٰؑ کا لقب تھا۔ جنھوں نے کوہ طور پر خدا سے گفتگو کی تھی۔ چونکہ خدا سے ہم کلام ہوتے تھے، اس لیے کلیم کا لقب ملا۔

(باقی صفحہ ۳۲۸ پر)

(۲)

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں ، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے ، میں وہ ایک مشت غبار ہوں

میرا رنگ روپ بگڑ گیا ، میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا ، میں اُسی کی فصل بہار ہوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۷)

۳ - آتش میں وہ ہُوا چمن آرا خلیل کا - خلیل حضرت ابراہیمؑ کا لقب تھا۔ ان کے زمانے میں بابل کے بادشاہ نمرود کی حکومت تھی - اس نے حضرت ابراہیمؑ کو توحید پرستی کی وجہ سے آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں پھنکوا دیا تھا مگر حضرت ابراہیمؑ نے اس موقع پر کسی اضطراب کا اظہار نہیں کیا بلکہ خدا سے دعا مانگی جس کے اثر سے آگ بجھ کر گلزار بن گئی اور حضرت ابراہیمؑ اس میں سے صحیح و سلامت نکل آئے - اس شعر میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے -

۴ - اس شعر میں اصحاب فیل کے جس مشہور واقعے کی طرف اشارہ ہے وہ یوں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے زمانے میں ابرہہ نے جو یمن کا حاکم اور قوم کا عیسائی تھا ، کعبہ ڈھانے کی غرض سے ہاتھی پر سوار فوجیں لے کر کعبے پر چڑھائی کی - کسی نے جناب عبدالمطلب کو اس کی خبر پہنچائی - عبدالمطلب نے خدا سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگیں - پھر مکےؔ کی پہاڑی پر چڑھ کر دشمن کی فوج کا جائزہ لیا کہ یکایک آسمان پر بدلی سی چھائی اور ابابیلوں کا جھنڈ کا جھنڈ منڈلانے لگا - ہر ایک کی چونچ میں کنکر تھا - یہ ابابیل ابرہہ کی فوج پر کنکر برساتے گزر گئے - جس سے ابرہہ کی فوج پسپا اور برباد ہو گئی - قرآن پاک میں بھی اس کا ذکر آیا ہے -

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں ، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں ، میں وہ بیکسی کا مزار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا ، مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا ، میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

(۳)

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں

بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید تھی لکھی فصل بہار میں

ان حسرتوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

اک شاخِ گل پہ بیٹھ کے بلبل ہے شادماں
کانٹے بچھا دیے ہیں دلِ لالہ زار میں

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے ، دو انتظار میں

دن زندگی کے ختم ہوئے، شام ہو گئی
پھیلا کے پاؤں سوئیں گے ، کنجِ مزار میں

کتنا ہے بد نصیب ظفر ، دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی ، کوئے یار میں

(۴)

جب چمن میں اس کے آنے کی خبر اڑ جائے گی
گل کی رونق دم میں اے بادِ سحر ، اڑ جائے گی

آپ کا کیا جائے گا ، گر خواب میں آؤ گے تم
نیند آنکھوں سے ہماری رات بھر اڑ جائے گی

خون تو مل لے گا میرا تو، کف پا سے تیرے
سرخیٔ رنگ حنا، اے فتنہ گر! اڑ جائے گی

آئے گا وہ مہروَش، اے دل، تو شبنم کی طرح
تاب و طاقت تیری اس کو دیکھ کر اڑ جائے گی

یہ صبا سے کوئی پوچھے، تیرے کیا آئے گا ہاتھ
خاک میری اس کے کوچے سے اگر اڑ جائے گی

شعلۂ رخسار ساقی، گر ہوا پرتو فگن
مے جو ہے ساغر میں تیرے، اے ظفر اڑ جائے گی

(۵)

جہاں ویرانہ ہے، پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے
شغال اب ہیں جہاں رہتے، کبھی بستے بشر یاں تھے

جہاں چٹیل ہے میدان اور سراسر ایک خارستاں
کبھی یاں قصر وایواں تھے، چمن تھے اور شجر یاں تھے

جہاں پھرتے بگولے ہیں اڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اُڑتی تھی دولت، رقص کرتے سیم بر یاں تھے

جہاں ہیں سنگ ریزے، تھے یہاں یاقوت کے تودے
جہاں کنکر پڑے ہیں اب، کبھی رُلتے گہر یاں تھے

جہاں سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشاں
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں اور شور و شر یاں تھے

جہاں اب خاک پر ہے نقشِ پائے آہوئے صحرا
کبھی محوِ تماشا دیدۂ اہل نظر، یاں تھے

ظفر! احوال عالم کا کبھی کچھ ہے، کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا بیشتر یاں تھے

———

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی کے ہم عصر تھے - ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے ۱۸۵۴ء میں ۱۷ سال کی عمر میں دلی پہنچے اور تحصیل علم اور مشق سخن میں مشغول ہوئے- یہیں غالب سے فن شعر میں اصلاح لی اور مشہور ہوئے - نواب مصطفٰی خاں شیفتہ کے یہاں بھی ملازم رہے اور ان سے بھی فیض پایا - ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد تک قدیم رنگ میں غزلیں کہتے تھے ۱۸۷۵ء کے بعد پنجاب پہنچے اور سرکاری بک ڈپو میں ملازم ہو گئے - اس زمانے میں آزاد بھی لاہور میں تھے - چنانچہ حالی اور آزاد نے انجمن پنجاب کے مشاعرے کے لیے نظمیں لکھنی شروع کیں - اس زمانے میں حالی نے بے شمار چھوٹی بڑی مذہبی، نیچرل، اخلاق اور قومی نظمیں لکھیں، جن میں برکھا رت، نشاطِ امید، حبِ وطن، مناظرۂ رحم وانصاف بہت مشہور ہوئیں - ان نظموں کی بڑی خوبی زبان اور بیان کی سادگی ہے -

سرسید کے ساتھ حالی قومی تحریک میں شریک تھے - حالی کی قومی نظمیں اسی تحریک کے زمانے کی یادگار ہیں جن میں مشہور و معروف مسدّس مدّ و جزر اسلام بھی ہے - حالی کی قومی و اخلاق رباعیات بھی بہت مشہور ہیں - عبارت کی خوبی، صفائی اور روانی، جذبات اور درد و اثر اور دلکش اندازِ بیان ان کے کلام کی خصوصیات ہیں -

حالی کے کلیات میں قدیم اور جدید دونوں رنگ میں غزلیں موجود ہیں ان کی ابتدائی غزلوں میں قدیم غزلوں کا رنگ ہے، بعد میں پرانے رنگ کو ترک کر کے جدید رنگ میں غزلیں کہی ہیں۔ مجموعی طور پر سب غزلیں جذبات سے لبریز ہیں۔ غزلوں کے علاوہ دوسرے اصناف سخن بھی اپنی جگہ پر خوب ہیں۔ قصائد نئی شان کے ہیں۔ مرثیہ درد انگیز اور پُر زور ہے اور سچے جذبات اور حقیقی تأثر سے لبریز اور ایک غمزدہ دل کی کیفیات کی سچی تفسیر ہے۔ رباعیات مختلف مضامین پر اکثر اخلاق اور نصیحت آمیز ہیں۔ دیوان میں غزلیات دوسرے اصناف سخن کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہیں۔ کلام مغلق اور پیچیدہ خیالات سے خالی، مبالغے اور اغلاق سے پاک اور درد و اثر سے مملو ہے۔ زبان و بیان میں سادگی و صفائی ہے۔

حالی کو ابتدا ہی سے سادگی اور صفائی سے مناسبت تھی۔ غالب اور شیفتہ کی تربیت نے اس رنگ کو اور نکھارا۔ لاہور کے تاریخی مشاعرے کے توسُّط سے انگریزی ادب کی صفائی اور سادگی سے بھی متاثر ہوئے۔

سرسید کی صاف ستھری سلجھی عبارت کا بھی اثر تھا کہ حالی نے غزل میں مروُّجہ بیان حسن و عشق کے، جس میں خارجی رنگ زیادہ نمایاں تھا، خلاف شور بلند کیا۔ حالی غزل کو اس بلند پائے پر دیکھنا چاہتے تھے، جس میں صرف بہترین اور اعلیٰ ترین مَظاہر دوستی و محبت کا بیان ہو۔ جس میں واردات قلبی اور داخلی جذبات کا ذکر ہو اور تکلُّف، تصنُّع اور خلاف واقع وقیاس چیزیں بیان نہ کی جائیں۔

غزل کو حالی نے ترک نہیں کیا بلکہ اس میں اصلاح کی۔ طرز قدیم پر، کہ جس میں خلافِ واقع باتیں جزو غالب تھیں ضربِ کاری لگائی۔ ہمواریِ خیال کو مدنظر رکھا۔ عبارت

کو تعقید اور تکلّف سے پاک کیا اور ان واردات زندگی کو اپنے کلام میں داخل کیا جن سے ہمیں روزانہ واسطہ پڑتا ہے اور عاشقانہ مضامین کے علاوہ نیچرل، اخلاقی، قومی اور سیاسی مضامین کو اپنے کلام میں داخل کر کے غزل کا دامن اور اس کی زبان کا احاطہ وسیع کیا۔

حالی کے یہاں طنز و ظرافت کے نمونے بھی ہیں لیکن ان میں تیزی و تلخی نہیں۔ حالی نے لغویات سے دامن بچایا ہے۔

حالی کی غزلوں پر پرانے شعراء نے بڑے شد و مد سے اعتراضات کیے ہیں اور ان کو "بے رنگ" بتایا ہے۔ ان شعراء کی نظر میں زبان اور تخیّل کے اعتبار سے حالی کی غزلیں پرانے رنگ میں نہ سہی لیکن اردو شاعری میں جدید رنگ کی رہبری ضرور کرتی ہیں۔

---

(۱)

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے، رعب و جلال تیرا

گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز، دل سے خیال تیرا

پھندے سے تیرے کیوں کر، جائے نکل کے کوئی
پھیلا ہوا ہے ہر سو، عالم میں جال تیرا

ان کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے، جن کی جمال تیرا

دل ہو کہ جان، تجھ سے کیوں کر عزیز رکھیے
دل ہے سو چیز تیری، جاں ہے سو مال تیرا

بیگانگی میں حالی یہ رنگ آشنائی
سن سن کے سر دھنیں گے قال اہل حال تیرا

(۲)

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو! دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا، اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم، نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دِل شوریدہ بہانے، مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک
دفن ہو گا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک! اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں، ہم بھی انہیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا ، تو رلایا ، اے چرخ !
ہم پہ غیروں کو تو ظالم ! نہ ہنسانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے، اے دورِ زماں !
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیرؔ و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا ، کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ، ہم میں یگانہ ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں ، بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

(۳)

کاٹیے دن زندگی کے ، اُن یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس ، پاسبانوں کی طرح

منزل دنیا میں ہیں پا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں مہماں سرا میں ، میہمانوں کی طرح

سعی سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے[1] نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو ، سخت جانوں کی طرح

رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پہ رکھتے ہیں کوڑا ، حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ ، شادمانوں کی طرح

رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں ، جوانوں کی طرح

پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پھر بھی منہ تکتے ہیں اک اک کا یگانوں کی طرح

آس کھیتی کے پنپنے کی انھیں ہو یا نہ ہو
ہیں انھیں پانی دیے جاتے ، کسانوں کی طرح

ان کے غصے میں ہے دل‌سوزی، ملامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں ، نا مہربانوں کی طرح

کام سے کام اپنے ان کو، گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں ، زبانوں کی طرح

طعن سن سن احمقوں کے، ہنستے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

کیجے کیا حالی ، نہ کیجے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب ، رنگین بیانوں کی طرح

---

۱ - کنیانا : کترانا -

(۴)

اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے

دیکھ اے بلبل! ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے، کانٹے میں بھی اک شان ہے

عقل پھیلی پر نہ سمٹی حرص و آز انسان کی
لے نہ اب نام آدمیت کا، اگر انسان ہے

چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دشمن، خدا کی شان ہے

دل میں حالی کے رہے باقی، نہ بس ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی، تو یہ ارمان ہے

———

نوابِ مرزا خان داغِ دہلوی

(۱۸۳۱ء - ۱۹۰۵ء)

نواب مرزا داغ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب شمس الدین، نواب لوہارو کے بھائی تھے۔ نواب شمس الدین کے انتقال کے بعد داغ کی والدہ نے شہزادہ فتح الملک عرف "مرزا فخرو" ولی عہد بادشاہ دہلی (بہادر شاہ ظفر) سے شادی کر لی۔ داغ کی عمر اُس وقت چھ یا سات سال کی تھی۔ وہ بھی اپنی والدہ کے ہمراہ قلعۂ معلّٰی میں چلے آئے اور وہیں شہزادوں کے ساتھ تعلیم اور تربیت پائی۔ لال قلعہ کے تعلق سے داغ کو ذوق جیسا اُستاد ملا۔ انھیں سے اصلاح لیتے رہے۔ انھیں کے ساتھ مشاعروں میں بھی جاتے۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کے انتقال کے بعد داغ کو مع اپنی والدہ کے قلعہ چھوڑنا پڑا۔ اس سے بڑھ کر جس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا وہ اگلے سال جنگ آزادی کا ہنگامہ تھا۔ یہ ہنگامہ ختم ہوا تو داغ نے رامپور کا رخ کیا۔ اس وقت داغ کی عمر پچیس سال تھی۔ والیان ریاست نے داغ کی بڑی قدر کی۔ رامپور میں اس وقت شعرائے باکمال کا مجمع تھا۔ داغ کو یہاں جوہر شاعری کے جگمگانے کا خوب موقع ملا۔ نواب کلب علی خان والیٔ رامپور کے انتقال کے بعد داغ ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد آئے۔ یہاں نظام دکن میر محبوب علی خان نے انھیں اپنا اُستاد مقرر کیا اور ناظم یار جنگ، دبیرالملک، فصیح الملک وغیرہ خطابات عطا کیے۔ ۱۹۰۵ء میں وہیں انتقال کیا۔ ان کے نام نواب داغ سے تاریخ وفات ۱۹۰۵ء نکلتی ہے۔

تصانیف میں "گلزار داغ ، آفتاب داغ ، دیوان داغ ، مہتاب داغ" اُن کی یادگار ہیں ۔ داغ اپنے زمانے کے بہت مشہور شاعر تھے ۔ اُنھوں نے قصیدے بھی کہے ہیں اور مثنویاں بھی لکھی ہیں ، لیکن ان کی شہرت کا سبب ان کی غزل گوئی ہے ۔ زبان میں فصاحت اور سادگی اور بیان میں ایک قسم کی شوخی اور بانکپن ہے ۔ یہ خوبیاں ایسی ہیں کہ جن کی نظیر اُردو شاعری میں ملنی مشکل ہے ۔ داغ کے کلام کو جیسی مقبولیت اُردو شاعری میں حاصل ہوئی ایسی بیسویں صدی تک میر اور غالب کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی ۔ داغ عاشقانہ شاعری کے مسلّم الثبوت اُستاد اور دلّی سکول کے نمائندے ہیں ۔ مگر اپنے خاص طرز کی وجہ سے ایک الگ سکول قائم کر گئے ، جس کی نمائندگی آگے چل کر نوح ناروی ، بیخود دہلوی ، بیخود بدایونی ، احسن مارہروی نے کی ۔ ان شعراء کے کلام میں زبان دانی ، محاورہ بندی ، الفاظ و محاورات کی صحت ، شعر کے فنی لوازم ، عروض کی پابندیوں کا احترام موجود ہے ۔

داغ کے شاگردوں کی فہرست بڑی لمبی ہے ، جس میں علامہ اقبال ، سائل ، بیخود اور آغا شاعر دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

———

(۱)

اب دل ہے مقام بے کسی کا ۔۔۔ یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا

رونا ہے اب ہنسی خوشی کا ۔۔۔ ماتم ہے بہار زندگی کا

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں ۔۔۔ کہنا نہیں مانتے کسی کا

جو دم ہے وہ ہے بسا غنیمت ۔۔۔ سارا سودا ہے جیتے جی کا

آغاز کو کون پوچھتا ہے ۔۔۔ انجام اچھا ہو آدمی کا

کہتے ہیں اسے زبان اُردو ۔۔۔ جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

ایسے سے جو داغ نے نباہی ۔۔۔ سچ ہے کہ یہ کام تھا اسی کا

(۲)

ان آنکھوں نے کیا کیا تماشا نہ دیکھا
حقیقت میں جو دیکھنا تھا نہ دیکھا

تجھے دیکھ کر وہ دوئی اُٹھ گئی ہے
کہ اپنا بھی ثانی نہ پایا نہ دیکھا

ان آنکھوں کے قربان جاؤں جنھوں نے
ہزاروں حجابوں میں پردا نہ دیکھا

نہ ہمت، نہ قسمت، نہ دل ہے، نہ آنکھیں
نہ ڈھونڈا، نہ پایا، نہ سمجھا، نہ دیکھا

وہ کب دیکھ سکتا ہے اس کی تجلّی
جس انسان نے اپنا جلوہ نہ دیکھا

اسے دیکھ کر اور کو بھی جو دیکھے
کوئی دیکھنے والا ایسا نہ دیکھا

وہ[۱] تھا جلوہ آرا مگر تم نے موسیٰؑ
نہ دیکھا، نہ دیکھا، نہ دیکھا، نہ دیکھا

تری یاد ہے یا ہے تیرا تصوُّر
کبھی داغ کو ہم نے تنہا نہ دیکھا

---

۱ - وہ تھا جلوہ آرا مگر تم نے موسیٰؑ - اس شعر میں حضرت موسیٰؑ (جن کا لقب کلیم اللہ تھا) کے اور کوہِ طور کے واقعے کی طرف اشارہ ہے -

(۱۸۲۷ - ۱۹۰۰ء)

منشی امیر احمد مینائی نام ، امیر تخلّص ، والد کا نام مولوی کرم احمد تھا - ۱۸۲۷ء میں بعہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں پیدا ہوئے - ان کے بزرگ حضرت مخدوم شاہ مینا تھے - اسی تعلق سے مینائی کہلاتے ہیں - ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے اور بعد میں علمائے فرنگی محل سے حاصل کی - امیر کی طبیعت بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھی - چنانچہ اسیر کے شاگرد ہوئے اور انھیں سے اصلاح لیتے رہے - ۱۸۵۲ء میں ابھی امیر ۲۴ سال کے تھے کہ ان کے اشعار کا تذکرہ واجد علی شاہ کے دربار میں ہوا - نواب نے انھیں بلا کر کلام سنا - اسی زمانے میں انھوں نے دو کتابیں "ارشاد السلاطین" اور "ہدایت السلاطین" لکھ کر واجد علی شاہ والیٔ اودھ کے دربار میں پیش کیں ، جس کے صلے میں ان کو انعام ملا - ۱۸۵۶ء میں اودھ کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کا ہنگامہ ہوا تو امیر ریاست رامپور چلے گئے - وہاں امیر کی قدر و منزلت ہوئی اور نواب کلب علی خان والیٔ رامپور کے استاد مقرر ہوئے - اپنی عمر کے ۴۴ سال تک وہیں رہے - اس زمانے میں رامپور میں علماء اور شعرائے باکمال کا مجمع تھا - امیر ، منیر ، سحر ، جلال اور داغ وغیرہ یہاں موجود تھے - یہیں امیر نے نظیر اللغات و امیر اللغات

لکھنی شروع کی۔ دو ہی جلدیں اس کی مرتب ہو کر شائع ہوئی تھیں کہ نواب کلب علی خان کا انتقال ہو گیا۔ نواب کی وفات کے بعد کچھ دنوں امیر رامپور میں رہے۔ پھر داغ کے بلانے پر حیدر آباد چلے گئے اور وہیں ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔

امیر اپنی قابلیت کے لحاظ سے فخر روزگار ہیں۔ ان کی تصانیف کی فہرست کافی لمبی ہے۔ نورِ تجلّی، ابرِ کرم، صبحِ ازل، شامِ ابد، خیابانِ آفرینش، صنم خانۂ عشق وغیرہ ان سے یادگار ہیں۔

امیر مینائی اپنے زمانے کے نہایت قادرالکلام اور جامع الکلام شاعر تھے۔ قصائد، غزلیات، مثنویات، واسوخت تمام اصناف شاعری ان سے یادگار ہیں۔ قصیدے نہایت کامیاب اور استادانہ کمال فن کا نمونہ ہیں۔ اردو نعت گوئی کو شاعرانہ محاسن سے امیر نے بڑے اعلٰی مقام پر پہنچا دیا ہے۔ دیوان میں زبان و بیان کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ یہ لکھنؤ کے شعراء میں ایک خاص طرز کے مالک ہیں۔ نزاکت تخیل اور خارجی مضامین کے باوجود کلام درد و اثر سے خالی نہیں۔

---

(۱)

وہی چراغ، وہی گل، وہی قمر، وہی برق
نئے لباس میں دیکھا اسے، جہاں دیکھا

فنا ہے حسن کو، دولت کو، زندگانی کو
جہان میں نہ کوئی باغ، بے خزاں دیکھا

پھنسی جو دام میں بلبل تو کن نگاہوں سے
کبھی چمن کو ، کبھی سوئے آشیاں دیکھا

بہار میں جو نکالا ہمیں تو کیا پایا
خزاں میں حال چمن ، تو نے باغباں دیکھا

کہیں گے وقتِ ملاقات ان سے اتنی بات
جو کچھ سنا تھا، وہ آنکھوں سے مہرباں دیکھا

دکھائی ترکِ تعلق نے شانِ بے رنگی
بڑھے مکاں سے آگے تو لا مکاں دیکھا

(۲)

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر
سر فروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر

رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا
نکہتِ گل کی طرح ، شوقِ سفر پیدا کر

کون سی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں
شوق دیدار اگر ہے ، تو نظر پیدا کر

میرے ہی دل پہ گرے کاش، یہ بجلی بن کر
اے فلک آہ میں اتنا ہی اثر پیدا کر

آخرت میں عمل نیک ہی کام آئیں گے
پیش ہے تجھ کو سفر ، زادِ سفر پیدا کر

صدمے اُلفت کے اُٹھانے ہیں الٰہی مشکل
دل اگر ایک دیا ، لاکھ جگر پیدا کر

(۳)

دوسرا کون ہے، جہاں تو ہے
کون جانے تجھے، کہاں تو ہے

لاکھ پردوں میں ہے، تو بے پردہ
سو نشانوں پہ، بے نشاں تو ہے

تو ہے خلوت میں، تو ہے جلوت میں
کہیں پنہاں، کہیں عیاں تو ہے

نہیں تیرے سوا، یہاں کوئی،
میزباں تو ہے، میہماں تو ہے

جسم کہتا ہے، جان ہے تو ہی
جان کہتی ہے، جانِ جاں تو ہے

رنگ تیرا چمن میں، بو تیری
خوب دیکھا، تو باغباں تو ہے

محرمِ راز تو بہت ہیں امیرؔ
جس کو کہتے ہیں راز داں، تو ہے

(۴)

ہوئے نام ور، بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی، آسماں کیسے کیسے

نہ گل ہیں، نہ غنچے، نہ بوٹے، نہ پتے
ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے

ہر اک دل پہ ہیں داغ ، ناکامیوں کے
نشاں دے گیا ، بے نشاں ، کیسے کیسے

بہارآ کے قدرت کی گلشن میں دیکھو
کِھلاتا ہے گل ، باغباں ، کیسے کیسے

امیر اب مدینے کو تُو بھی رواں ہو
چلے جاتے ہیں کارواں کیسے کیسے

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی

(۱۸۷۵ — ۱۹۵۱ء)

سید فضل الحسن نام ، حسرت تخلص ، رئیس المُتغزّلین کہلاتے ہیں - ۱۸۷۵ء میں موہان ضلع اناؤ (اودھ) میں پیدا ہوئے - والد کا نام سید اظہر حسن تھا - حسرت کا سلسلۂ نسب امام علی ابن موسیٰ رضاؑ سے ملتا ہے - ان کے جدِّ اعلیٰ نے موہان میں سکونت اختیار کر لی تھی - حسرت کی ابتدائی تعلیم موہان کے ایک مکتب میں ہوئی اور وہیں انھوں نے ۱۸۹۴ء میں اُردو مڈل کا امتحان پاس کیا - اس کے بعد فتح پور گئے اور گورنمنٹ سکول میں انگریزی تعلیم شروع کی - ۱۸۹۹ء میں انٹرنس کرنے کے بعد علی گڑھ چلے گئے اور ۱۹۰۳ء میں بی - اے کا امتحان پاس کیا - سید سجاد حیدر یلدرم اور مولانا شوکت علی ان کے ساتھیوں میں سے تھے -

طالب علمی ہی کے زمانے میں حسرت نے شعر و شاعری کی دنیا میں نام پیدا کر لیا تھا - تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے اساتذۂ قدیم کا گہرا مطالعہ کیا - ادبی تنقیدیں لکھیں ، کلام کے انتخابات کیے - حسرت کی سیاسی دلچسپی بھی طالب علمی کے زمانے سے شروع ہو چکی تھی - ۱۹۰۸ء میں حسرت کو سیاسی معاملات ملکی میں حصہ لینے کی وجہ سے قید با مشقت کی سزا بھی ملی اور حکومت نے انھیں باغی قرار دیا - اس قید و بند کے مصائب کا جستہ جستہ ذکر بھی حسرت کی غزل میں ملتا ہے - باوجود سیاسی مشاغل کے

حسرت شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے "انتخاب سخن" کے نام سے گیارہ جلدوں میں تمام ممتاز قدیم و جدید شعراء کے دواوین کا انتخاب بھی شایع کیا۔ ۷۵ سال کی عمر پا کر ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو حسرت نے انتقال کیا۔ وہ نہایت پاکیزہ منش، با اصول اور منکسر المزاج انسان تھے۔ حسرت منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ تسلیم، نسیم دہلوی کے اور نسیم، مومن دہلوی کے شاگرد تھے۔ اس لیے حسرت نے ابتدا میں تسلیم و مومن کے رنگ میں شعر کہنا شروع کیا اور دلّی سکول کے طرز کو پسند کیا۔ بعد کی غزلوں میں حسرت کا اپنا رنگ پایا جاتا ہے۔ حسرت کا کلام بیان کی شگفتگی، خیال کی جولانی، عشق کی رنگینی، حسن کی رعنائی اور سوز و گداز کا مرقع ہے۔

غزل میں سیاسی تصور ۱۸۷۵ء سے پہلے اور اس کے بعد کی شاعری میں کہیں کہیں ملتا ہے لیکن حسرت نے سیاست کو واضح طور پر غزل کی مستقل روایت میں شامل کر لیا۔ مختصر یہ کہ فانی بدایونی کی یاس و حسرت، اصغر گونڈوی کی پاکیزگی، گہرائی اور لطافت، جگر کی سرمستی اور سرشاری کے اجزاء حسرت نے اس طرح کلام میں سموئے کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ کلام میں حسنِ بندش، جدتِ تخیل، سوز و گداز اور درد و اثر کے اعتبار سے حسرت اردو شعراء میں ممتاز ہیں اور رئیس المتغزّلین کہلائے۔

———

(۱)

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلی ہمرہاں سے ہم

کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزلِ مراد
لیکن یہ جب کہ چھوٹ چکیں کارواں سے ہم

بیتابیوں سے چھپ نہ سکا حال آرزو
آخر بچے نہ اس نگۂ بدگماں سے ہم

مایوس بھی تو کرتے نہیں تم زراہ ناز
تنگ آ گئے ہیں کشمکشِ امتحاں سے ہم

ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آ گئے وہیں پہ، چلے تھے جہاں سے ہم

حسرت پھر اور جا کے کریں، کس کی بندگی
اچھا جو سر اٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

(۲)

لطف کی ان سے التجا نہ کریں
ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں

مل رہے گا جو ان سے ملنا ہے
لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں

صبر مشکل ہے آرزو بے کار
کیا کریں بیخودی میں، کیا نہ کریں

مسلکِ عشق میں ہے فکر حرام
دل کو تدبیر آشنا نہ کریں

مرضیِ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

شوق ان کا سو مٹ چکا حسرت
کیا کریں ہم اگر وفا نہ کریں

(۳)

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مَشقّت بھی
اک طرفہ تماشا ہے، حسرت کی طبیعت بھی

رکھتے ہیں مرے دل پر، کیوں تہمتِ بے تابی
یاں نالۂ مضطر کی، جب مجھ میں ہو قوت بھی

اے شوق کی بے تابی، وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انھیں غصہ ہے، انکار بھی، حیرت بھی

ہیں شاد و صفی شاعر یا شوق و وفا حسرت
پھر ضامن و محشر ہیں، اقبال بھی، وحشت بھی

(۴)

دلِ مایوس کو سرچشمۂ صدق و صفا کر دے
گدازِ غم اگر چاہے تو مجھ کو با خدا کر دے

عطا ہو اس وفا دشمن کو توفیقِ کرم یا رب!
نہیں تو پھر مجھی کو بے نیازِ مدعا کر دے

اثر ایسا کہاں سے لاؤں یا رب نالۂ دل میں
جو اس بے مہر کو بھی رازِ غم سے آشنا کر دے

شوکت علی فانی بدایونی

(۱۸۷۵ء - ۱۹۴۱ء)

شوکت علی نام ، فانی تخلّص - ان کے آباؤ اجداد کابل سے شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آئے - پھر دہلی سے بدایوں آئے اور یہیں سکونت اختیار کی - فانی ۱۸۷۵ء میں یہیں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی - پھر بریلی کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۱ء میں بی - اے پاس کرکے ایل ، ایل - بی کی ڈگری کے لیے علی گڑھ آئے -

شعر گوئی کا شوق گیارہ برس کی عمر سے تھا - طبیعت بھی رسا پائی تھی - بیس سال کی عمر میں اپنا پہلا دیوان مکمل کر لیا لیکن وہ ضائع ہو گیا - ۱۹۲۶ء میں دوسرا دیوان باقیات فانی کے نام سے شائع ہوا - یہ مجموعہ فانی کے اصل رنگ کا مظہر ہے -

فانی کی زندگی مایوسیوں اور ناکامیوں کی ایک داستان ہے - کچھ دنوں وکالت کی ، پھر حیدر آباد دکن میں محکمۂ تعلیم میں ملازمت کی - یہیں ۱۹۴۱ء میں ان کا انتقال ہوا - پروفیسر رشید احمد صدیقی نے انھیں "یاسیات کا امام" کہا ہے -

قدیم شعراء میں میر تقی میر کا کلام سوز و گداز میں رچا ہوا ہے اور اس میں بے پناہ تاثیر ہے - میر نے اپنے کلام میں قلبی واردات اور یاس آمیز مضامین جس سادگی اور بے ساختگی سے پیش کیے ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی - عہدِ جدید کے غزل

گو شعراء میں فانی نے غم کے مضامین باندھنے میں میر کی پیروی کی ہے - فانی کے یہاں اظہار کی وہ بے تکلفانہ سادگی تو نہیں جو میر کے یہاں ہے لیکن فکر کی آمیزش ضرور ہے - فانی کے نزدیک چونکہ کائنات کا سارا نظام تصوّرات غم کے امور پر قائم ہے اس لیے وہ ہمیشہ لذت غم کے جویا رہے - ان کے یہاں غم کا تصوّر اور غم کا احساس دونوں میں ایک نیا رنگ ہے - کہتے ہیں :

ہر تبسّم پردہ دارِ غم نظر آیا مجھے
گل خزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے

فانی زندگی کو ایک سلسلۂ آلام سمجھتے ہیں اور غم کو شخصیت کی تعمیر و تہذیب کا ذریعہ خیال کرتے ہیں - اسی کے ذریعہ سے وہ جذبات کی پرورش اور تہذیب چاہتے ہیں - ان کے نزدیک اسی کے ذریعہ سے حواس اور ادراک میں تیزی اور فکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے - غرض کہ فانی نے اپنے مخصوص انداز سے غزل کو ایک نیا مزاج دیا اور اسے نئی کیفیتوں سے لبریز کیا ہے - انھوں نے سنجیدہ انداز میں حسن و عشق کے معاملات اور زندگی کے اسرار کی تشریح غمناک لہجے سے کی ہے - ان کی واردات میں صداقت اور خلوص ہے - جو پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے - ان سب کے باوجود میر کا سا بے ساختہ و براہِ راست احساسِ غم ، جس پر انسان دیر تک سر دھنتا ہے ، نہیں ملتا اور نہ فانی کے غم میں وہ نشتریت ہے جو میر کے یہاں ہے -

غالب کی تقلید کے اثر سے فانی کے کلام میں رمز و ایماء کی کیفیت بھی ملتی ہے - فانی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ غالب کے شعوری طور پر مقلد تھے - نیز یہ کہ "وہ میر کے دل کا مرقع ہیں" - بہر حال دورِ جدید کے غزل گوشعراء میں فانی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں -

---

(۱)

ناکام ہے تو کیا ہے، کچھ کام پھر بھی کر جا
مردانہ وار جی اور مردانہ وار مر جا

دنیا کے رنج و راحت، کچھ ہوں، تیری بلا سے
دنیا کی اک ادا سے منہ پھیر کر گذر جا

اس بحرِ بیکراں میں ساحل کی جستجو کیا
کشتی کی آرزو کیا، ڈوب اور پار کر جا

کثرت میں دیکھتا جا، تکرارِ حسنِ وحدت
مجبور یک نظر آ، مختار صد نظر جا

گھبرا گیا خرد کی تاریکیوں سے فانی
اے نورِ عشق، دل کی گہرائیوں میں بھر جا

(۲)

ضبط اپنا شعار تھا نہ رہا
دل پہ کچھ اختیار تھا، نہ رہا

دلِ مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی غم گسار تھا، نہ رہا

آ کہ وقت سکونِ مرگ آیا
نالہ ناخوشگوار تھا، نہ رہا

ان کی بے مہریوں کو کیا معلوم
کوئی امید وار تھا، نہ رہا

آہ کا اعتبار بھی کب تک
آپ کا اعتبار تھا، نہ رہا

موت کا انتظار باقی ہے
آپ کا انتظار تھا، نہ رہا

مہرباں! یہ مزار فانی ہے
آپ کا جاں نثار تھا، نہ رہا

———

اصغر حسین اصغر گونڈوی

(۱۸۸۴ء - ۱۹۳۶ء)

اصغر حسین نام ، اصغر تخلّص ۔ یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے ۔ آباء و اجداد گورکھپور کے رہنے والے تھے لیکن ان کے والد منشی تفضل حسین نے بسلسلہ ملازمت گونڈہ میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔ اس تعلّق سے اصغر گونڈوی کہلائے ۔ اصغر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی ۔ خانگی مجبوریوں کے سبب اعلیٰ تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے اور ذاتی مطالعہ سے ادب پر عبور اور فنِ شاعری میں بصیرت حاصل کی ۔ اصغر فطری طور پر بڑے طبّاع ، محنتی اور صاحبِ ذوق تھے ۔ شاعری میں پہلے منشی جلیل احمد بلگرامی سے اصلاح لی اور اور پھر منشی امیر اللہ تسلیم سے ۔ اصغر کو شاہ عبدالغنی منگلوری سے گہری عقیدت تھی اور انہیں کے توسط سے اصغر کی شاعری میں تصوّف کا رنگ پیدا ہوا ۔ اصغر ایک مدت تک رسالہ ہندوستانی کے ایڈیٹر رہے ۔ ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو الہٰ آباد میں وفات پائی ۔

اصغر کا کلام مقدار میں بہت تھوڑا ہے ۔ ساری عمر کی کمائی نشاطِ روح اور سرودِ زندگی دو مختصر سے مجموعے ہیں ۔ ان میں جو غزلیں ہیں وہ بھی مختصر ہیں لیکن جو کچھ ہے وہ منتخب ہے ۔ اس میں بھرتی کے اشعار یا رطب و یابس کا وجود نہیں ۔ کلام ہموار اور سلیس ہے ۔ وہ پاکیزہ طبیعت اور پرہیزگار آدمی تھے ۔ ان کے کلام میں بھی پاکیزگی اور

طبیعت کی نفاست پسندی ہے۔ ان کا عشق، عشقِ حقیقی کے درجے پر ہے۔ انھوں نے اسے جس نفاست و نزاکت سے پیش کیا ہے وہ اس عام انداز سے بالکل الگ ہے جو بعض دوسرے تصوّف پسند شعراء کے یہاں ملتا ہے۔ ان کے کلام میں صرف تصوّف کے عام مسائل اور موضوعات، مروّجہ مضامین اور اصلاحات اور استعارات نہیں بلکہ ان میں ایک تازگی و ندرت ہے۔ تصوّف کے مضامین کی عام افسردگی، پامالی، ہیجان و بے قراری کی جگہ کیف و وجد کی سی کیفیت ہے۔ جوش، شور و ولولہ اور ہنگامے کی بجائے ایک دھیا پن اور سکون ہے مضامین میں جو کیف اور دلکشی ہے اسے الفاظ کے عمدہ انتخاب، تراکیب کی برجستگی اور نفاست نے اور چمکا دیا ہے۔

غرضیکہ اصغر کا سارا کلام پاکیزگی کے ساتھ رعنائی خیال اور حسنِ بیان کا مجموعہ ہے اور انھی شعری خصوصیات نے ان کی غزل میں ایک اور انفرادی شان پیدا کر دی ہے۔

---

(۱)

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

میں کامیابِ دید بھی، محرومِ دید بھی
جلووں کے ازدحام نے حیراں بنا دیا

مجبوریٔ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا، انھیں انساں بنا دیا

کہتے ہیں اک فریبِ مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

(۲)

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

قفس کیا ؟ حلقہ ہائے دام کیا؟ رنج اسیری کیا؟
چمن پر مٹ گیا جو ، ہر طرح آزاد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس ، جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

بہار انجام سمجھوں اس چمن کا، یا خزاں سمجھوں
زبانِ برگِ گل سے مجھ کو، کیا ارشاد ہوتا ہے

ازل میں اک تجلّی سے ہوئی تھی بے خودی طاری
تمہیں کو میں نے دیکھا تھا، کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے ، خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں ، وہیں صیّاد ہوتا ہے -

یہاں مستوں کے سر انجام ہستی ہی نہیں اصغر
پھر اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

جگر مرادآبادی

(۱۸۹۰ء - ۱۹۶۰ء)

علی سکندر نام ، جگر تخلُّص ۱۸۹۰ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئے - ان کا خاندان شاہانِ مغلیہ کے دربار میں رسوخ رکھتا تھا - جگر کے والد مولوی علی نذر بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے اور خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے - جگر کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا ، مگر شاعری کا ذوقِ سلیم ترکے میں ملا تھا - ابتدا میں اپنے والد سے اصلاح لی - بعد میں داغ دہلوی اور تسنیم لکھنوی کو کلام دکھانے لگے -

جگر کا ابتدائی رنگ رسؔا اور داؔغ کی طرح شوخ اور بے باک ہے - اندازِ بیان میں بانکپن اور سرمستی ہے - خیالات عام فہم اور الفاظ سادہ ہیں مگر دوسرے دَور میں ان کی غزلوں میں ان کا انفرادی رنگ زیادہ گہرا ہو گیا ہے - اس دَور کے کلام کی نمایاں خصوصیات سادگی و روانی ، کیف و بے خودی ، محویت و وارفتگی ہیں اور یہی ان کا رنگ ہے - حسن و عشق ، معاملہ بندی ، تصوُّف کے اسرار و رموز سبھی کچھ بیان کر گئے ہیں مگر ہر جگہ بیان میں ایک کیف ، وارفتگی اور بے خودی کا انداز ہے -

سادگی و پرکاری ، بے خودی و ہوشیاری جو فارسی میں امیر خسروؒ کے کلام کی خصوصیت ہے وہ اردو میں جگر کے حصے میں آئی - جگر کا انتقال ۱۹۶۰ء میں ہوا -

(۱)

عشق کی یہ نمودِ پیہم کیا؟
ہو تمہی تم اگر تو پھر ہم کیا؟

جز ترے کچھ نظر نہیں آتا
آرزو بن گئی مجسّم کیا؟

تیرا ملنا ، ترا نہیں ملنا
اور جنت ہے کیا؟ جہنم کیا؟

ہم ہیں تیرے ، ودیعتیں تیری
شکرِ راحت ، شکایتِ غم کیا؟

ان نگاہوں کے سب کرشمے ہیں
ورنہ یہ اضطرابِ پیہم کیا؟

شوقِ گستاخ کر چکا تقصیر
دیکھنا اب ہے حسنِ برہم کیا؟

موت کی نیند چھاتی جاتی ہے
کہہ چکا میں فسانۂ غم کیا؟

عشقِ خاموش کے مزے ہیں جگر
جوشِ فریاد و شورِ ماتم کیا؟

(۲)

کوئی یہ کہدے ، گلشن گلشن — لاکھ بلائیں ، ایک نشیمن
کامل رہبر ، قاتل رہزن — دل سا دوست، نہ دل سا دشمن

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

خیر مزاجِ حسن کی یا رب
تیز بہت ہے دل کی دھڑکن

آ کہ نہ جانے تجھ بن کب سے
روح ہے لاشہ، جسم ہے مدفن

عمریں بیتیں، صدیاں گزریں
ہے وہی اب تک عقل کا بچپن

برق حوادث ، اللہ اللہ
جھوم رہی ہے شاخِ نشیمن

دل، کہ مجسم آئینہ ساماں
اور وہ ظالم، آئینہ دشمن

بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن
جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن

کانٹوں کا بھی حق ہے آخر
کون چھڑائے اپنا دامن

چلتی پھرتی چھاؤں ہے پیارے
کس کا صحرا، کیسا گلشن

———

ڈاکٹر سر محمد اقبال

(۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸ء)

اقبال کی ولادت ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ ہوئی - ان کے آباء و اجداد کشمیری تھے - ابتدائی تعلیم فاضلِ وقت مولانا میر حسن صاحب سیالکوٹی سے حاصل کی - انھیں کے فیضِ صحبت سے شاعری اور ادبیات کا ذوق اُبھرا - شاعری زمانۂ طالب علمی میں شروع کی اور داغ دہلوی سے اصلاح لی - اپنے طالب علمی کے زمانہ میں مشہور انگریز پروفیسر مسٹر آرنلڈ سے فلسفہ پڑھا - ایم - اے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہوئے - اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلستان روانہ ہوئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں بغرض تعلیم داخلہ لیا - پھر جرمنی گئے اور وہاں سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی کچھ مدت لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بھی رہے - وطن واپس آکر وکالت شروع کی - ساتھ ہی ساتھ شعر و سخن کا شغل بھی جاری رکھا - اپنی غیر معمولی ذہانت اور شاعرانہ صلاحیت کی بنا پر قوم سے "حکیم الامت"، "ترجمانِ حقیقت"، "مفکر و شاعرِ اسلام" اور "شاعرِ مشرق" کے لقب پائے - ۱۹۳۸ء میں ٦١ برس کی عمر میں بمقام لاہور وفات پائی اور بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں کے پاس دفن ہوئے -

اقبال اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے قادرالکلام شاعر ہیں - تصانیف میں بانگِ درا ، بالِ جبریل ، ضربِ کلیم ، اسرارِ خودی ، رموزِ بے خودی ، پیامِ مشرق اور ارمغانِ حجاز وغیرہ ان کی یادگار ہیں -

اردو غزل میں جس فکری انداز کی بنیاد غالب نے ڈالی تھی اس کا پختہ اور رچا ہوا نمونہ اقبال کے یہاں ملتا ہے - اقبال نے شاعری کے پیمانے کو بھی بدلا اور شاعری کو حریر و پرنیاں کی نرمی اور نازکی کی جگہ ایک قسم کی توانائی اور ولولہ عطا کیا - جس سے غزل کی بجھی بجھی سی لَے یک وقت حیات پرور اور حیات آفریں بنی - میر سے لے کر حسرت اور اصغر ، فانی ، جگر ، آرزو لکھنوی تک غزل کی بجھی بجھی لَے قائم تھی -

اقبال نے غزل کو فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بھی بنایا اور اس صنف میں اور زیادہ وسعت پیدا کر دی - اقبال کی غزلوں کی خوبی یہ ہے کہ عروض و اظہار کی روایات کے احترام کے باوجود ان میں ایک نیا پن اور نظم کا سا لطف موجود ہے - اقبال کی غزلوں میں فلسفہ ، علم النفس کے دقیق نظریات ، عصرِ حاضر کے ذہنی اور سماجی حالات ملتے ہیں - خودی ، عشق اور عمل کا فلسفہ بھی موجود ہے مگر ان سب نئے موضوعات اور تجربات کے باوجود غزل کی کیفیت میں کمی محسوس نہیں ہوتی - ان کے کلام کے مطالعے سے ہم انسان کی عظمت ، اس کی قوت و شوکت اور نظامِ کائنات میں اس کی حیثیت سے متأثر ہوتے ہیں غرضیکہ اقبال نے غزل کو ایک وسعت دی ، ایک نئے تصور اور نئے اسلوب سے آشنا کیا اور غزل کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا -

(۱)

مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے اب چاند کے غاروں میں نظر بند

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی[۱]
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوق شکر خند

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں[۲] میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ[۳] کا منہ بند

(۲)

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ ، نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گُل سے کلام پیدا کر

---

۱ - جوہر ملکوتی : ملائک جیسی روح -

۲ - یزدان : زرتشت کے بقول خدائے خیر کا نام یزداں اور خدائے شر کا اہرمن -

۳ - گستاخ کا منہ بند : اس شعر میں اشارہ یہ ہے کہ یادگارِ ایزدی میں چونکہ یہ طرزِ گفتگو اور کلام دونوں حدِ ادب سے خارج ہیں ، اس لیے شاعر اپنی گستاخی پر نادم ہو کر اپنے آپ کو تنبیہ کرتا ہے اور خاموش رہنے کے لیے کہتا ہے -

میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں ، فقیری ہے
خودی نہ بیچ ، غریبی میں نام پیدا کر

(۳)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی ، زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے ، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

گئے دن، کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

(۴)

چمک تیری عیاں بجلی میں ، آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا ، چاند میں ، سورج میں ، تارے میں

بلندی آسمانوں میں ، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں ، افتادگی تیرے کنارے میں

جو ہے بیدار انساں میں ، وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں ، پھول میں ، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی ، پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں ، میں نِے نفع دیکھا ہے ، خسارے میں

سکوں نا آشنا رہنا ، اسے سامان ہستی ہے
تڑپ کس دل کی یا رب ! چھپ کے آبیٹھی ہے پارے میں

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال ! میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے ، مجھ فرقت کے مارے میں

(۵)

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قُدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو ، بنتا ہے مسلمان

ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

---

۱ - ہویدا : ظاہر

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو، وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

بنتے نہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

(٦)

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام بادشاہی

تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رو سیاہی

نہ دیا نشانِ منزل، مجھے اے حکیم[1] تو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی

یہ معاملے ہیں نازک، جو تیری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی[2]

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الہ الا
لغَتِ غریب، جب تک ترا دل نہ دے گواہی

---

۱ - حکیم : یہاں اشارہ فلسفیوں کی طرف ہے جو خداً سے ملنے کا وسیلہ نہیں بتا سکتے -

۲ - طریق خانقاہی : اقبال کی اصطلاح ہے - اس سے ان کی مراد بے عملی کی زندگی ہے ، جو اسلام کی ضد ہے کیونکہ اسلام تو عمل اور سراسر جہاد کی تعلیم دیتا ہے -

رضا علی وحشت کلکتوی

(۱۸۸۰ء - ۱۹۶۵ء)

رضا علی نام ، وحشت تخلّص - ۱۸ نومبر ۱۸۸۰ء میں کلکتے میں پیدا ہوئے - جدِ امجد حکیم غالب علی مرحوم دہلی کے باشندے تھے - جنھوں نے ہگلی (مغربی بنگال) میں سکونت اختیار کر لی تھی - والد کا نام حکیم شمشاد علی خان تھا - انھیں شعر و سخن کا بہت ذوق تھا - فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے -

وحشت نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی - اس کے بعد مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۱ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا - خانگی مجبوریوں کے سبب اعلٰی تعلیم جاری نہ رکھ سکے مگر ذاتی مطالعے اور کتب بینی سے امتیازی استعداد اور قابلیت حاصل کر لی - انگریزی ادب سے بھی خاص دلچسپی رکھتے تھے -

پندرہ سال کی عمر سے شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے فطری طور پر طبّاع ، محنتی اور صاحبِ ذوق تھے - شاعری میں محمد مظہر الحق شمس سے اصلاح لیتے تھے جو داغ کے شاگرد اور عبدالغفور نسّاخ کے صاحب زادے تھے - شمس کی وفات کے بعد ذوقِ سلیم اور طبیعت کی موزونی وحشت کی رہنما بنی -

انٹرنس پاس کرنے کے بعد ملازمت اختیار کی - ۱۹۲۶ء میں انھیں "خان بہادر" کا خطاب ملا - آزادی کے بعد ۱۹۵۰ء

میں وطن چھوڑ کر ڈھاکے آئے اور وہیں ۲۰ جولائی ۱۹۶۵ء کو انتقال کیا۔

۱۹۱۱ء میں وحشت کا پہلا دیوان شائع ہوا۔ اس وقت ان کی عمر اُنتیس سال کی تھی۔ ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ترانۂ وحشت کے نام سے ۱۹۵۱ء میں مکتبۂ جدید لاہور نے شائع کیا۔ ایک تیسرا مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ مجموعۂ کلام میں رباعی، مسدس، مخمس اور طرزِ جدید پر نظمیں بھی شامل ہیں۔ دیوان کے آخر میں فارسی کا کلام بھی ہے۔

وحشت شروع ہی میں اپنے استاد شمس کے رنگ میں کہا کرتے تھے بعد میں غالب کا رنگ اختیار کیا، مگر اس تقلید میں بھی ان کا اپنا ایک رنگ ہے۔ ابتدا میں طبیعت کسی قدر دقت پسند تھی۔ بعد میں اس روش کو ترک کیا۔ قدیم غزل کے دلدادہ تھے۔ غالب اور مومن کی ترکیبوں اور طرزِ ادا کو نباہا ہے، کلام ان کا ہموار اور متوازن ہے، زندگی کی واردات اور کیفیات کی سچی عکاسی اور دلی تأثرات کا بیان ان کی غزلوں میں موجود ہے۔ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ قدیم سکول میں تعلق رکھنے کے باوجود وحشت نے متروک الفاظ استعمال نہیں کیے بلکہ نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں سے کلام کو سجایا اور مقبول ہوئے۔

———

(۱)

چمن کا ذوق ہے لیکن چمن کہاں دیکھا
قفس میں ہم نے بہت خوابِ آشیاں دیکھا

سبک سری سے جو ان کے قدم پہ سر رکھا
یہی ہوا کہ انہیں اور سر گراں دیکھا

بس ایک شغل کی حاجت ہے بے قراروں کو
کسی نے کب اثرِ نالہ و فغاں دیکھا

سب اپنے اپنے خیالات میں ہیں سر گرداں
نہ ہم سخن کوئی پایا نہ ہم زباں دیکھا

رہا نہ پھر مرے دل میں خیالِ آزادی
قفس کو میں نے جو ہم رنگ آشیاں دیکھا

نہ اپنے درد کا دکھ ہے نہ غم کا غم مجھ کو
دل اپنا شاد ہے تم کو جو شادماں دیکھا

سرور دل میں ہے **وحشت**! تو نور آنکھوں میں
نہ دیکھ کر اسے کہتا ہوں میں کہ ہاں دیکھا

(۲)

کسی طرح دن تو کٹ رہے ہیں فریبِ امید کھا رہا ہوں
ہزارہا نقش آرزو کے بنا رہا ہوں مٹا رہا ہوں
زمانہ بھی مجھ سے ناموافق، ہیں آپ بھی دشمن سلامت
تعجّب اس کا ہے بوجھ کیوں کر میں زندگی کا اٹھا رہا ہوں
نہ ہو مجھے جستجوئے منزل مگر ہے منزل مری طلب میں
کوئی تو مجھ کو بلا رہا ہے کسی طرف تو میں جا رہا ہوں
یہی تو ہے نفع کوششوں کا کہ کام سارے بگڑ رہے ہیں
یہی تو ہے فائدہ ہوس کا کہ اشکِ حسرت بہا رہا ، ہوں
خدا ہی جانے یہ سادہ لوحی دکھائے گی کیا نتیجہ **وحشت**
وہ جتنی الفت گھٹا رہے ہیں اسی قدر میں بڑھا رہا ہوں

ابوالاثر حفیظ جالندھری

حفیظ ۱۹۰۰ء میں جالندھر (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جالندھر میں ہوئی۔ بچپن سے اردو زبان اور شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ حفیظ کے استاد فارسی کے مشہور شاعر مولانا غلام قادر گرامی مرحوم تھے۔

۱۹۲۵ء میں فرمانروائے خیرپور (سندھ) نے تین سو روپے ماہوار مشاہرے پر درباری شاعر کے طور پر حفیظ کو مامور کیا مگر حفیظ کو یہ زندگی پسند نہ آئی۔ نظم "رقاصہ" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ خیرپور سے واپسی پر حفیظ نے اپنا پہلا مجموعۂ کلام "نغمہ زار" شایع کیا جو حفیظ کی شہرت کا باعث ہوا۔ اس کے بعد حفیظ نے شعر و سخن کے ذریعے سے اسلام کی خدمت کرنے کا تہیہ کر لیا اور شاہنامۂ اسلام نظم کرنا شروع کیا۔ اب تک اس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ سوز و ساز، تلخابۂ شیریں اور نغمہ زار حفیظ کے دوسرے شعری مجموعے ہیں۔

حفیظ کی غزلوں میں پرانی روایات کا احترام پایا جاتا ہے۔ غزل کی قدیم روایات میں جو علامتیں، تشبیہیں، استعارے اور اندازِ بیان وغیرہ باتیں شامل ہیں وہ تقریباً سب کی سب حفیظ کی غزلوں میں موجود ہیں۔ ان کی غزلوں میں رنج و راحت کا بیان ہے۔ آنسوؤں کے ساتھ مسکراہٹ کے سامان ہیں۔ طلب کی کاوش بھی ہے اور غمِ عشق کی جستجو اور فکرِ روزگار سے گریز بھی۔ لطافت، نزاکت، رقص، آنچل، ٹھنڈی ہوائیں اور کالی گھٹاؤں کا جلوہ بھی۔

اگرچہ مضامین اور اسالیب کے اعتبار سے حفیظ کی غزلوں میں کوئی نیا تجربہ نہیں ملتا - ان میں نہ تو نئے مضامین ہیں اور نہ نئے اسالیب ، پھر بھی غزلوں کی سادگی ، دلکشی اور نغمگی نے غزل کی پرانی روایات سے آن کا رشتہ اور مضبوط کر دیا ہے - درحقیقت حفیظ شعراء کے اس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں جس کا ارتقاء عظمت اللہ خان کے نقطۂ خیال کی اشاعت کے بعد ہوا اور جس کی بڑی خصوصیت ہندی بحروں کو اُردو میں رائج کرنا ، شعر میں ہندی الفاظ کی نشست اور ترکیبوں سے ترنم و حسن خیال پیدا کرنا تھا - یہی وجہ ہے کہ حفیظ کے کلام میں ہندی کے نرم و شیریں الفاظ اور لمبی بحروں میں موسیقیت کی بہتات ہے - آگے چل کر موضوعات میں نئے تجربوں کی خواہش میں ان کی شاعری نے ایک اور منزل طے کی اور روایتی غزل کی جگہ ایک نرالی دھن ، تازہ منصوبے اور نئی منزل کے ذوق نے لے لی - اس کے بعد غزل کے بجائے طویل نظمیں حفیظ کے فکری سانچے میں ڈھلنے لگیں - حفیظ نے اُردو میں گیت کی روایت کو بھی مستحکم کیا- ان کے گیتوں میں جو فضا اور موسیقی ہے وہ اس دَور کے کسی دوسرے شاعر کے گیتوں میں موجود نہیں - مجموعی حیثیت سے حفیظ کی شاعری کا فن ان کے گیتوں میں زیادہ نمایاں ہے - "پربت کا گیت" اور "جاگ ، سوزِعشق جاگ" اردو گیتوں کی تاریخ میں لازوال ہیں - حفیظ کی شہرت ان کے گیتوں اور نظموں کی وجہ سے ہے-

---

(۱)

وہ قافلہ آرام طلب ہے، بھی تو کیا ہو
آوازِ نفس ہی جسے آوازِ درا ہو

خاموش ہو کیوں دردِ محبت کے گواہو!
دعوے کو نباہو، مرے نالو! مری آہو

ہر روز جو سمجھانے چلے آتے ہو ناصح
میں پوچھتا ہوں، تم مجھے سمجھے ہوئے کیا ہو

اس دارِ بقا میں مری صورت کوئی دیکھے
اک دم کا بھروسہ ہے جو اک دم میں فنا ہو

مجھ کو نہ سنا خضر و سکندر کے فسانے
میرے لیے یکساں ہے فنا ہو کہ بقا ہو

(۲)

وہ سر خوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے، میرے لہو کو شراب کر دے
حقیقتیں آشکار کر دے، صداقتیں بے حجاب کر دے
ہر ایک ذرہ یہ کہہ رہا ہے کہ آ مجھے آفتاب کر دے
یہ خوب کیا ہے، یہ زشت کیا ہے، جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے
بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے
کہو تو رازِ حیات کہہ دوں، حقیقتِ کائنات کہہ دوں
وہ بات کہدوں کہ پتھروں کے جگر کو بھی آب آب کر دے
خلافِ تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے
ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری خطائیں شمار کر لے، مری سزا کا حساب کر دے

مرثیہ

میر انیس

(۱۸۰۲ - ۱۸۷۴ء)

میر ببر علی انیس، میر خلیق کے بیٹے (۱۲۱۶ھ/۱۸۰۲ء تا ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء) تھے، ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۲ء میں شہر فیض آباد کے محلہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے۔ ان کے مورث اعلیٰ میر امامی ہرات سے شاہجہان کے عہد میں آئے اور دہلی میں آباد ہو گئے۔ شہنشاہ نے سہ ہزاری منصب عطا کیا۔ مختلف حوادث کے باعث سلطنت مغلیہ کا انتشار شروع ہوا تو میر امامی کے پوتے میر غلام حسین ضاحک اپنے فرزند میر حسن کو، جن کی عمر اس وقت بارہ سال تھی، ساتھ لے کر فیض آباد پہنچے۔ جب مرکزِ حکومت لکھنئو منتقل ہوا تو میر ضاحک اور میر حسن کی آمد و رفت لکھنئو میں شروع ہو گئی۔ میر حسن کے تین بیٹے تھے ان میں سے ایک میر خلیق تھے۔ میر انیس انھیں کے فرزند تھے۔ میر انیس بیالیس سال کے تھے تو مستقل طور پر لکھنئو آ گئے۔

میر انیس کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ میر ضاحک اپنے زمانے کے اچھے شاعر تھے، میر حسن مشہور مثنوی سحرالبیان کے مصنف اور میر خلیق بلند پایہ مرثیہ نگار تھے، اس صنف کو انھوں نے بڑی ترقی دی۔

میر انیس کم عمری ہی میں مشقِ سخن کرنے لگے۔ فارسی اور اردو کے ہزاروں شعر انھیں یاد تھے۔ ابتدا میں سلام کہا کرتے تھے اور اپنے والد سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

تخلص حزیں رکھا مگر اردو کے مشہور شاعر شیخ ناسخ کے کہنے پر اسے ترک کرکے انیس اختیار کر لیا۔ جب میر انیس نے متعدد رباعیاں، سلام اور جدید طرز کے مرثیے لکھ لیے تو مجلس میں اپنا کلام تحت اللفظ پڑھنا شروع کیا۔ مرثیہ نگاری سے فطری مناسبت تھی فوراً چمک اٹھے۔ ان دنوں لکھنئو میں مرزا سلامت علی دبیر کو مرثیہ گوئی کا امام تسلیم کیا جاتا تھا۔ ان کے ہوتے ہوئے مرثیہ گوئی میں میر انیس کا ایسے ارفع مقام پر فائز ہو جانا ان کی فطری صلاحیت اور شاعرانہ کمال کا بیّن ثبوت ہے۔

واجد علی شاہ والیٔ اودھ کے زمانے میں میر انیس کی شہرت بامِ عروج پر تھی مگر ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں انگریزوں نے واجد علی شاہ کو معزول کر دیا۔ گویا لکھنئو اجڑ گیا۔ اس لیے میر انیس ۱۸۵۹ء میں پہلی بار عظیم آباد پٹنہ گئے۔ ۱۸۷۱ء میں حیدر آباد دکن بھی گئے اور بڑی قدر دانی ہوئی۔ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں لکھنئو میں فوت ہوئے اور اپنے مکان سے ملحقہ باغیچے واقع سبزی منڈی میں دفن ہوئے۔

میر انیس کی شاعرانہ عظمت کو تمام ناقدانِ فن نے تسلیم کیا ہے۔ ان کے مرثیے اعلیٰ شاعری کا نمونہ ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے واقعے نازک سے نازک خیال اور لطیف سے لطیف کیفیت کو مناسب اور موزوں الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی تشبیہیں، استعارے اور تمثیلیں آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ میر انیس نے جذباتِ فطرت اور مناظرِ قدرت کی عمدہ تصویریں کھینچی ہیں۔ اخلاق شاعری کے اعتبار سے بھی میر انیس کے مراثی کا پایہ بہت بلند ہے۔

میر انیس کی عظمت یہ ہے کہ وہ جذبات نگاری ، کردار نگاری ، منظر نگاری اور واقعہ نگاری میں کمال رکھتے ہیں ۔ انھیں خارجی جزئیات اور داخلی واردات دونوں کی تصویر کشی پر بے نظیر قدرت حاصل تھی ۔ مناظر قدرت اور رزم و بزم کا جو مرقع وہ پیش کرتے ہیں ۔ اس کی تمام جزئیات اپنی اپنی جگہ مکمل ہوتی ہیں ۔ اسی طرح وہ اشخاصِ مرثیہ کی حیثیت عمر ، صنف اور حالت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ان کے جذبات اور کیفیات کی ہوبہو تصویر کھینچتے ہیں ۔ وہ اردو کے چند ممتاز ترین شاعروں میں شمار کیے گئے ہیں اوز صنفِ مرثیہ میں تو اپنی نظیر آپ ہیں ۔

نمودِ صبح

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح
ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح

پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں
چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں
مرجھا کے گر گئے ثمر و شاخِ کہکشاں

دکھلائے طَور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ نور کا ظہور
یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور
خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سُرور

انساں زمیں پہ محو ملک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سرخی شفق کی ادھر چرخ پر بہار
وہ بارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار

نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

کربلا میں گرمی کی شدّت

گرمی کا روزِ جنگ کی کیوں کر کروں بیاں
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لُو کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں
رن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں

آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

وہ لُو، وہ آفتاب کی حدّت، وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے تھے جو حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب

اڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھَولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خسخانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر

گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھوں آبلے پائے نگاہ میں

کوسوں کسی شجر میں نہ گُل تھے نہ برگ و بار
ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گل نہ مہکتا تھا سبزہ زار
کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخِ بار دار

گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتّے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرِب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شررفشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ، گرمی روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

تلوار کی تعریف

جب رن میں تیغ تول کے سلطانِ دیںؑ بڑھے
گیتی کے تھام لینے کو روح الامیںؑ بڑھے
مانند شیرِ نر کبھی ٹھہرے کبھی بڑھے
گویا علیؑ الٹتے ہوئے آستیں بڑھے

جلوہ دیا جری نے عروسِ مصاف کو
مشکل کشا کی تیغ نے چھوڑا غلاف کو

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا
جیسے کنار شوق سے ہو خوبرو جدا
مہتاب سے شعاع جدا ، گل سے بو جدا
سینے سے دم جدا ، رگِ جاں سے لہو جدا

گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی

آئے حسینؑ یوں کہ عقاب آئے جس طرح
کافر پہ کبریا کا عتاب آئے جس طرح
تابندہ برق سوئے سحاب آئے جس طرح
دوڑا فرس ، نشیب میں آب آئے جس طرح

یوں تیغ تیز کوند گئی اس گروہ پر
بجلی تڑپ کے گرتی ہے جس طرح کوہ پر

جس پر چلی وہ تیغ ، دو پارا کیا اسے
کھنچتے ہی چار ٹکڑے دو بارا کیا اسے
واں تھی جدھر اجل نے اشارا کیا اسے
سختی بھی کچھ پڑی تو گوارا کیا اسے

نَے زین تھا فرس پہ نہ اسوار زین پر
کڑیاں زرہ کی بکھری ہوئی تھیں زمین پر

اللہ ری تیزی و برش اس شعلہ رنگ کی
چمکی سوار پر تو خبر لائی تنگ کی
پیاسی فقط لہو کی ، طلب گار جنگ کی
حاجت نہ ساں کی تھی اسے اور نہ سنگ کی

خوں سے فلک کو لاشوں سے مقتل کو، بھرتی تھی
سو بار دم میں چرخ پہ چڑھتی اترتی تھی

بجھ بجھ گئیں صفوں پہ صفیں وہ جہاں چلی
چمکی تو اس طرف ادھر آئی وہاں چلی
دونوں طرف کی فوج پکاری کہاں چلی
اس نے کہا وہاں، وہ پکارا یہاں چلی

منہ کس طرف ہے تیغ زنوں کو خبر نہ تھی
سر گر رہے تھے اور تنوں کو خبر نہ تھی

———

ٹریفک کے بنیادی اصول

برائے طلبہ و طالبات

ٹریفک کے اصولوں کی پابندی ہر شہری کا قانونی و اخلاقی فرض ہے۔ ان کی پابندی آپ کے اپنے مفاد میں ہے۔ ٹریفک کے حادثات سے بچنے کے لیے قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس میں آپ کی جان کی سلامتی ہے۔

(۱) پیدل چلنے والوں کے لیے

۱۔ پیدل چلنا ہو تو ایسا راستہ اختیار کیجیے جس میں زیادہ رش والی سڑکوں کو عبور نہ کرنا پڑے۔

۲۔ پیدل چلنے کے لیے ہمیشہ فٹ پاتھ استعمال کریں۔

۳۔ فٹ پاتھ پر کھیلنا یا ایک دوسرے کو دھکے دینا نہایت خطرناک ہے۔

۴۔ اگر سڑک کے ساتھ فٹ پاتھ نہ ہو تو اور بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں سڑک کے دائیں طرف چلیے۔ کیونکہ گاڑیاں بائیں طرف چلتی ہیں۔ دائیں طرف چلنے سے آپ سامنے سے آنے والی گاڑیوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ سڑک کے بائیں طرف چلنے سے خطرہ یہ ہے کہ آپ خدانخواستہ پیچھے سے آنے والی گاڑی کے نیچے نہ آ جائیں۔

۵۔ سڑک عبور کرنے کے لیے سیدھا اور چھوٹا راستہ اختیار کریں۔ کیونکہ یہ جلدی سے عبور ہو سکتا ہے۔ یاد رکھیں کہ سڑک بنیادی طور پر گاڑیوں کے استعمال کے لیے ہے پیدل چلنے والوں کو سڑک پر کم سے کم آنا چاہیے۔

۶۔ سڑک عبور کرنے کے لیے ہمیشہ زیبرا کراسنگ استعمال کریں۔ زیبرا کراسنگ سڑک عبور کرنے والوں کے لیے مخصوص راستہ ہوتا ہے۔ جسے سفید متوازی لائینوں کی مدد سے بنایا جاتا ہے۔

۷۔ سڑک عبور کرتے وقت پہلے دائیں طرف پھر بائیں طرف پھر دائیں طرف دیکھیں۔ اگر سڑک خالی ہو تو پھر اسے سیدھا عبور کیجیے۔

۸۔ اگر ممکن ہو تو گروپ کی صورت میں سڑک عبور کریں کیونکہ ڈرائیور ایک آدمی کے مقابلے میں ایک گروپ کو زیادہ آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ سڑک عبور کرتے وقت دوڑنا نہیں چاہیے۔ بلکہ چلنا چاہیے۔ کیونکہ اس طرح دائیں بائیں آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔

(۲) قطار بنائیے

اگر بس کے انتظار میں بس سٹاپ پر کھڑے ہوں تو قطار بنائیے اور چڑھتے وقت اپنی باری کا انتظار کیجیے۔ زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ بس میں اس وقت سوار ہوں یا اتریے جب بس مکمل طور پر ٹھہر جائے۔

(۳) سائیکل سوار کے لیے

۱۔ اگر آپ کو سائیکل چلانا ہے تو اپنے سائز کی سائیکل لیجیے اسے اچھی حالت میں ہونا چاہیے۔

۲ - چلنے سے پہلے سائیکل کی بریکیں چیک کر لینی چاہییں - تاکہ جب ضرورت محسوس ہو تو اسے آسانی کے ساتھ روکا جا سکے -

۳ - سائیکل کی گھنٹی ضرور ہونی چاہیے - تاکہ آپ پیدل چلنے والوں کو خبردار کر سکیں - اگر رات کو سائیکل چلانا ہو تو بتی کا ہونا لازمی ہے تاکہ آپ دوسروں کو نظر آ سکیں -

۴ - سائیکل ایک آدمی کے لیے بنائی گئی ہے - دوسرا آدمی بیٹھنے سے توازن خراب ہو سکتا ہے -

۵ - سائیکل ہمیشہ سڑک کے بالکل بائیں کنارے کے ساتھ چلائیں - سڑک کے درمیان سائیکل چلانا بے حد خطرناک ہے - سائیکل زیادہ تیز نہ چلائیں اگر بہت سے دوست اکٹھے سائیکل چلا رہے ہیں تو انھیں ایک قطار میں رہنا چاہیے- یعنی ایک دوسرے کے پیچھے اور علیحدہ ، سائیکل ٹریک ہو تو ہمیشہ سائیکل اسی ٹریک پر چلائیں -

۶ - سائیکل موڑنے سے پہلے کم از کم ۱۰ میٹر پہلے ہاتھ کا اشارہ دیں اور صرف اسی صورت میں مڑیں جب آپ خود کو مکمل طور پر محفوظ سمجھیں -

(۴) اشارات

۱ - ٹریفک کے اشاروں کی ہمیشہ پابندی کیجیے - کیونکہ خلاف ورزی کسی وقت بھی حادثہ کا باعث بن سکتی ہے - اشارہ سرخ ہو تو رک جائیں - صرف سبز اشارے پر ہی آگے جا سکتے ہیں - تیر کے اشارے پر صرف اسی سمت میں ہی مڑ سکتے ہیں جب اشارہ زرد ہو تو محتاط ہو جائیے اور اشارے کے مطابق چلیے یا رکیے -

۲ - ٹریفک کے اشارات اور نشانات وغیرہ کو سمجھنے کے لیے چارٹ وغیرہ کی مدد حاصل کریں -

(۵) اپنی حفاظت خود کیجیے

۱ - تیز رفتاری خطرناک ہے اور حادثے کا سبب بن سکتی ہے -

۲ - بس ، کار ، ٹانگے یا رکشے میں آرام سے بیٹھ کر سفر کریں - اِدھر اُدھر حرکت نہ کریں - کیونکہ ہو سکتا ہے کہ آپ گر جائیں - اپنے جسم کا کوئی حصہ باہر نہ نکالیے - کیونکہ اس صورت میں اس کا کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا جانے کا ڈر ہے -

(۶) فرض اور ذمہ داری

۱ - موٹر سائیکل ، کار ، بس ، ٹرک اور ٹانگہ وغیرہ لائسنس کے بغیر چلانا یا کوئی اور ٹریفک قواعد کی خلاف ورزی قانونی جرم ہے اور اس کے لیے سزا بھی مل سکتی ہے -

۲ - ڈیوٹی پر موجود ٹریفک پولیس کے ساتھ تعاون کیجیے وہ آپ کی حفاظت اور خدمت کے ذمہ دار ہیں - ان کے ساتھ خوش اخلاق سے پیش آئیے -

منظور کردہ: قومی کمیٹی برائے جائزہ کتب نصاب برائے ثانوی
تعلیمی بورڈ لاہور، سرگودھا، راولپنڈی، ملتان و بہاولپور۔
" قومی کمیٹی برائے جائزہ کتب نصاب کی تصحیح شدہ "
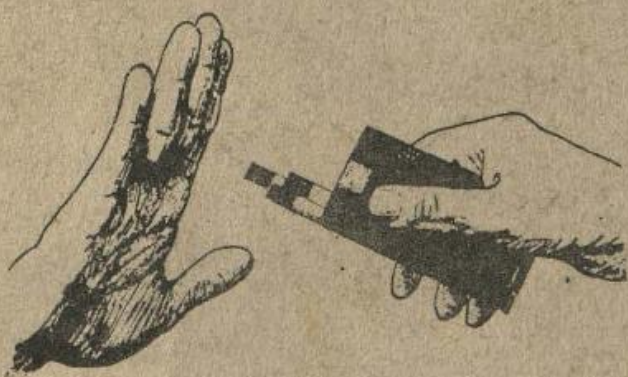
تمباکو نوشی صحت کیلئے مضر ہے

کوڈ نمبر G-208   1836
سیریل نمبر

تاریخ اشاعت	اشاعت اوّل	تعداد اشاعت	قیمت
اگست 1984	بار اوّل	12,500	13.00

خریدار حضرات اس قیمت سے زیادہ کتب فروش کو ادا نہ کریں۔